تدبرِ قرآن

۳

آلِ عمران

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ا۔ سورہ کا عمود اور سابق سورہ سے تعلق

مندرجہ ذیل پہلوؤں سے یہ سورہ سابق سورہ (بقرہ) سے نہایت گہرا ربط رکھتی ہے۔

۱۔ ان دونوں کا موضوع ایک ہی ہے۔ یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا اثبات۔ لوگوں پر عموماً اور اہل کتاب پر خصوصاً۔

۲۔ دونوں میں یکساں شرح وبسط کے ساتھ دین کی اصولی باتوں پر بحث ہوئی ہے۔

۳۔ دونوں کا قرآنی نام بھی ایک ہی ہے۔ یعنی الٓمٓ۔

۴۔ دونوں شکلاً بھی ایک ہی تنے سے پھوٹی ہوئی دو بڑی بڑی شاخوں کی طرح نظر آتی ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کو شمس وقمر سے تشبیہ دی ہے اور فرمایا ہے کہ یہ دونوں حشر کے دن دو بدلیوں کی صورت میں ظاہر ہوں گی۔ اہل بصیرت سمجھ سکتے ہیں کہ وصف اور تمثیل میں یہ اشتراک بغیر کسی گہری مناسبت کے نہیں ہو سکتا۔

۵۔ دونوں میں زوجین کی سی نسبت ہے۔ ایک میں جو بات مجمل بیان ہوئی ہے، دوسری میں اس کی تفصیل بیان ہو گئی ہے۔ اسی طرح ایک میں جو خلا رہ گیا ہے، دوسری نے اس کو پُر کر دیا ہے۔ گویا دونوں مل کر ایک اعلیٰ مقصد کو اس کی مکمل شکل میں نہایت خوب صورتی کے ساتھ پیش کرتی ہیں۔

ب۔ سورۂ بقرہ اور سورۂ آل عمران کے امتیازی پہلو

لیکن اس اشتراک اور یکسانی کے ساتھ ساتھ ان دونوں کی کچھ الگ الگ خصوصیات بھی ہیں جو ان کو ایک دوسری سے ممتاز کرتی ہیں، مثلاً

بقرہ پر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورہ اس زمانے میں نازل ہوئی ہے جب اہل کتاب نے یہ محسوس کر لیا ہے کہ اسلام ایک سچا دین ہے اور یہ آہستہ آہستہ چڑھ پکڑ رہا ہے لیکن حسد اور ضد کے باعث وہ اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہوتے۔ اس احساس نے ان کو شدید کشمکش میں ڈال دیا ہے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر اس کی مخالفت کے لیے تو اٹھ کھڑے ہوئے لیکن یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی کہ یہ مخالفت

کس عنوان سے کریں، جس کے منہ میں جو آیا اس نے وہ اُگلنا شروع کر دیا۔ کسی نے کہا نبوت و رسالت کے لیے تو بنی اسرائیل کا گھرانا مخصوص رہا ہے، اس گھرانے سے باہر کسی کو نبوت کس طرح مل سکتی ہے؟ کسی نے کہا ہدایت کے لیے تو بس تورات کافی ہے اور جب اس کے حامل ہم موجود ہیں تو اب کسی نئی ہدایت کی ضرورت کہاں باقی رہی؟ اسی جھنجھلاہٹ میں بعضوں نے حضرت جبریلؑ تک کو مطعون کر ڈالا کہ یہ فرشتہ شروع سے ہمارا بیری ہے۔ کچھ لوگوں نے یہود و نصاریٰ کا ایک متحدہ محاذ بنا کر مخالفت کا یہ پہلو اختیار کیا کہ آسمانی ہدایت یا تو یہودیت کے اندر ہے یا نصرانیت کے اندر، جس کو ہدایت مطلوب ہو وہ ان میں سے کسی کو اختیار کرے، ان کے سوا آسمانی ہدایت حاصل ہونے کا کوئی اور راستہ نہیں ہے۔ ایک گروہ نے دھوکا بازی کی روش اختیار کی۔ اس نے مسلمانوں کو یہ اطمینان دلانا چاہا کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں، مسلمان ایمان کا اجارہ دار تنہا اپنے ہی کو نہ سمجھیں، خدا، آخرت اور اپنے پیغمبر کو تو ہم بھی مانتے ہیں، اس سے کیا فرق پیدا ہوا کہ ہم نئے مدعی نبوت کو نہیں مانتے۔ ان حالات میں یہ سورہ اتری۔ اس میں ایک طرف تو تفصیل کے ساتھ ان تمام اعتراضات کے جواب دیے گئے جو اہل کتاب کی طرف سے اٹھائے گئے، دوسری طرف نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کی جو اعلیٰ سند خود ان کے صحیفوں میں موجود تھی، اس کو واضح کیا گیا اور تیسری طرف نبی امیؐ کی رسالت سے دین حق کی جو تجدید و تکمیل ہوئی تھی اس کی طرف رہنمائی کی گئی۔ اس طرح یہ سورہ گویا دعوت ایمان و اثباتِ رسالت بھی ہے اور دعوتِ جہاد برائے آزادیٔ قبلہ و غزوۂ بدر بھی۔

سورۂ آل عمران پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ بقرہ کے کچھ عرصہ بعد اس دور میں نازل ہوئی ہے جب افق پر اسلام کے غلبہ اور اس کی صداقت کے آثار اتنے نمایاں ہو چکے ہیں کہ اہل کتاب کے لیے اس کی علانیہ مخالفت کرنا ممکن نہیں رہا۔ اس صورتِ حال نے اہل کتاب کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک گروہ نے تو اسلام قبول کر لیا لیکن یہ اسلام صرف اس کی زبانوں ہی تک رہا، اس کے دلوں میں نہیں گھسا۔ دوسرے گروہ نے اسلام تو نہیں قبول کیا لیکن اس نے مسلمانوں کے ساتھ مذہب کے معاملے میں ایک سمجھوتہ کرنے کی کوشش کی۔ اس سمجھوتے کے لیے اس نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر مذہب کے پیروؤں کے لیے ان کا اپنا دین حق ہے اس وجہ سے مسلمان ہم کو ہماری یہودیت و نصرانیت پر چھوڑ دیں اور ہم مسلمانوں کو ان کے اسلام پر۔ اس طرح دونوں اپنے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے ایک ہی ملک میں ایک ساتھ امن کی زندگی بسر کر سکیں گے۔[1]

---

[1] سورہ بقرہ کے شروع میں اس گروہ کی طرف اشارہ ہے لیکن اس وقت تک یہ گروہ پوری طرح سامنے نہیں آیا تھا۔ اس سورت میں یہ بے نقاب ہو کر سامنے آگیا ہے۔ اس گروہ کا نظریہ بعینہٖ وہی ہے جو آج وحدتِ ادیان کے نام سے پیش کیا جا رہا ہے۔

اس طرح ان دونوں گروہوں کا رویہ اسلام کے ساتھ بدل تو گیا لیکن یہ تبدیلی دل کی تبدیلی کا نتیجہ نہیں تھی بلکہ سراسر مصلحت پرستی پر مبنی تھی۔ پہلے گروہ نے اسلام کا جو اظہار کیا تو محض مسلمانوں کی متوقع کامیابیوں میں حصہ بٹانے کے لیے۔ دوسرے نے صلح جویانہ پالیسی اختیار کی تو صرف متوقع خطرات سے اپنے کو محفوظ کرنے کے لیے۔

اسی اثنا میں احد کا معرکہ پیش آیا جس میں مسلمانوں ہی کی ایک جماعت کی بے تدبیری سے ان کو ایک عارضی شکست سے دوچار ہونا پڑا۔ اس واقعے کا اثر اہل کتاب کے مذکورہ دونوں گروہوں پر یہ ہوا کہ انھوں نے اسلام کے بارے میں اپنی پالیسی پھر تبدیل کر دی۔ جو گروہ محض دنیوی کامیابیوں کے لالچ میں اسلام کی صفوں میں آگھسا تھا جب اس نے دیکھا کہ اس راہ میں خطرات بھی پیش آسکتے ہیں تو اس نے اس خطرے کے سودے سے دستبرداری کا اعلان کر دیا اور اسلام کی اطاعت کا قلادہ اتار کر پھر اپنے کفر کی طرف پلٹ گیا۔ دوسرے گروہ نے جب دیکھا کہ اسلام کو زک بھی پہنچائی جاسکتی ہے تو اس نے سوچا کہ ہم نے جو اس کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کے ساتھ صلح جویانہ روش اختیار کر لی ہے، یہ غلط ہے، کیوں نہ ہم مخالف طاقتوں کو قوت پہنچا کر یہ کوشش کریں کہ ایک مرتبہ اسلام کو جڑ بیڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیں۔ چنانچہ انھوں نے بھی کھلم کھلا اپنی دشمنی کا اعلان کر دیا۔

اس طرح یہ دونوں ہی گروہ کھلم کھلا اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کی راہ پر چل پڑے اور انھوں نے طرح طرح کی چالوں سے مسلمانوں کے ذہنوں میں شبہات و شکوک بھرنے شروع کیے تاکہ جس طرح وہ خود فرقوں اور گروہوں میں بٹ چکے ہیں اسی طرح مسلمان بھی اپنی وحدت و یکجہتی کھو کر پراگندہ ہو جائیں اور ان کی طاقت ختم ہو جائے۔ ان حالات نے تقاضا کیا کہ اہل کتاب اور مسلمانوں دونوں کے سامنے دین کی یہ حقیقت واضح کی جائے کہ اللہ کی طرف سے لوگوں کو کئی دین نہیں ملے ہیں بلکہ ایک ہی دین ملا ہے جس کا نام اسلام ہے۔ اس دین میں تقسیم اور تجزیہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس کے کچھ حصے کو تو مانا جائے اور کچھ کو نہ مانا جائے بلکہ بیک وقت اس کے کل کو ماننا یا کل کو چھوڑنا ہے۔ اس دین کا مطالبہ ہر حالت میں اللہ کی اطاعت اور اس کے احکام کی فرمانبرداری ہے، خواہ حالات نرم ہوں یا سخت اور خواہ راہ ہموار نظر آرہی ہو یا آزمائشوں اور فتنوں نے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی کر رکھی ہوں، حق بہرحال حق ہے، وہ بعض حالات میں مخفی تو ہو جاتا ہے جس طرح چھلکے کے اندر مغز لیکن معدوم نہیں ہوتا۔ اس طرح کے حالات میں وہی لوگ ثابت قدم رہتے ہیں جن کے ایمان اور علم میں پختگی ہوتی ہے۔ جو حق سے بے خبر ہوتے ہیں ان کے قدم اکھڑ جاتے ہیں۔

غزوہ احد بھی اسی طرح کا ایک امتحان بن کر لوگوں کے سامنے آیا۔ جس طرح غزوہ بدر کی نوعیت ایک فرقان کی تھی جس نے حق اور باطل کو الگ الگ کر دیا اسی طرح غزوہ احد کی حیثیت ایک آیت

متشابہ کی تھی جس کے باطن میں حکمت تھی لیکن اس کا ظاہر کمزور لوگوں کے لیے آزمائش بن گیا چنانچہ اس نے پختہ فکر و پختہ ایمان مسلمانوں کو چھانٹ کر ان لوگوں سے بالکل الگ کر دیا جن کے دلوں میں کجی اور دماغوں میں فتنہ ہوئی تھی۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورہ اتری چنانچہ اس میں ان تمام خامیوں اور گمراہیوں پر تبصرہ ہے جو اس وقت نمایاں ہوئیں، عام اس سے کہ وہ مسلمانوں سے ظاہر ہوئیں یا اہل کتاب سے۔ اس میں اس شک اور تذبذب کی ضلالت بھی واضح کی گئی ہے جس میں اہل کتاب مبتلا تھے اور اس اختلاف اور عدم اطاعت کے انجام بد پر بھی تبصرہ ہے جس کا اظہار منافقوں اور کمزور قسم کے مسلمانوں کی طرف سے ہوا تھا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو ان تمام چالوں سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کو زک پہنچانے کے لیے ان کے دشمن چل رہے تھے اور احد کی شکست سے ان کو جو بد دلی ہوئی تھی اس کو نہایت مؤثر انداز میں دور کیا گیا۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو آپ محسوس کریں گے کہ جس طرح سورۂ بقرہ سورہ بدر ہے اسی طرح یہ سورۂ آل عمران سورۂ احد ہے۔ مزید غور کیجیے تو یہ بات بھی واضح ہو گی کہ بقرہ میں ایمان کی حقیقت واضح کی گئی ہے اور اس سورہ میں اسلام کی۔ دوسرے الفاظ میں اس بات کو یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بقرہ میں اللہ کے آخری رسول پر ایمان لانے کی دعوت ہے اور اس سورہ میں اسلامی نظام اور اللہ کی حکومت میں داخل ہونے کی دعوت ہے۔

ان دونوں سورتوں کے موضوع اور عمود سے متعلق یہ ہم نے جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ بات واضح کرنی مقصود ہے کہ بقرہ میں ایمان کا پہلو نمایاں ہے اور اس سورہ میں اسلام کا۔ اس حقیقت کی طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے بھی ہمیں رہنمائی ملتی ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ حضورؐ نمازوں میں کبھی کبھی ایک رکعت میں بقرہ میں سے آیت ایمان پڑھتے اور دوسری رکعت میں آلِ عمران میں سے آیت اسلام۔ یہ گویا ایک لطیف اشارہ ہوتا اس بات کی طرف کہ ان دونوں سورتوں میں موضوع اور مقصود کی حیثیت کن مضامین کو حاصل ہے۔ علاوہ ازیں بقرہ کا خاتمہ ایک ایسی آیت پر ہوا ہے جو ایمان کے باب میں ایک نہایت جامع آیت ہے۔ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ الآیۃ اور پھر اس کا خاتمہ کامل اطاعت الٰہی کے مضمون پر ہوا ہے تاکہ ہم پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ ایمان کا لازمی ثمرہ اسلام ہے، جہاں صحیح ایمان موجود ہو گا اس سے لازماً اسلام ظہور میں آئے گا۔ اس طرح بقرہ کے خاتمے کی آیت نے آل عمران کے ساتھ اس کے ربط کو خود واضح کر دیا۔

دوسرا پہلو ان دونوں کے درمیان امتیاز کا یہ ہے کہ سورۂ بقرہ میں زیادہ تر خطاب یہود سے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب کی حیثیت سے اصلی مقام انھی کو حاصل تھا۔ نصاریٰ کی حیثیت محض ایک ضمنی فرقے کی تھی، چنانچہ قرآن نے بقرہ میں ان سے خطاب کیا بھی ہے تو وہ سرسری نوعیت کا ہے۔ البتہ آلِ عمران میں ان سے براہ راست خطاب کیا ہے اور بحث کا زیادہ حصہ انھی سے متعلق ہے۔ سورہ کی تمہید بھی ایک

جامع نوعیت کی ہے جو یہود و نصاریٰ دونوں کے لیے موزوں ہے۔ پھر اس سے آگے جو مضمون شروع ہوا ہے وہ تدریجی طور پر نصاریٰ کی تردید میں نمایاں ہوتا گیا ہے۔

تیسرا پہلو یہ ہے کہ بقرہ میں استدلال زیادہ تر ایسے امور فطرت سے ہے جو کفار اور اہل کتاب دونوں پر یکساں حجت ہو سکتے ہیں۔ اس کے برخلاف آل عمران میں زیادہ تر استدلال صفات الٰہی یا ایسے مسلمات سے ہے جو اہل کتاب کے ساتھ مخصوص ہیں۔

چوتھا پہلو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اگرچہ ان دونوں ہی سورتوں میں اہل کتاب کو سخت توبیخ فرمائی ہے لیکن انداز توبیخ دونوں میں الگ الگ ہے۔ بقرہ میں توبیخ براہ راست ہے برعکس اس کے آل عمران میں ان کو براہ راست خطاب کرنے کے بجائے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ ان کو یہ یہ تہدیدات پہنچا دو۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حجت تمام ہو جانے کے بعد یہ لوگ لائق خطاب نہیں رہے۔ اب خطاب کے اہل صرف پیغمبرؐ اور اہل ایمان ہی ہیں۔

ج۔ دونوں سورتوں کی تقدیم و تاخیر کے وجوہ

ان دونوں سورتوں کے موضوع، ان کے زمانہ نزول کی خصوصیات، ان کے اسلوب بیان کے امتیازات پر ہم نے یہ جو کچھ عرض کیا ہے اس سے یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مضامین کے اشتراک کے باوجود ان دونوں میں نسبت اس نوعیت کی ہے کہ مصحف میں تقدیم و تاخیر کے لحاظ سے ان کی یہی ترتیب ہونی چاہیئے تھی جو ہے۔ یہاں بقرہ کے آل عمران پر مقدم رکھنے کے مندرجہ ذیل وجوہ بالکل واضح ہیں۔

ایمان اسلام کی بنیاد ہے۔ جس طرح علم عمل کی بنیاد ہے۔

یہود، نصاریٰ سے اقدم ہیں اس وجہ سے ضروری ہوا کہ پہلے یہود پر حجت تمام کی جائے۔

دلائل فطرت سے استدلال، صفات الٰہی سے استدلال کے مقابل میں زیادہ واضح، زیادہ قدیم، زیادہ وسیع ہے اس وجہ سے قرآن نے پہلے اس کو استعمال کیا۔

علیٰ ہذا القیاس حضرت آدم اور حضرت ابراہیم علیہما السلام چونکہ انبیاء متقدمین میں سے ہیں اس وجہ سے یہ مناسب ہوا کہ پہلے ان کے عہد و میثاق کا حوالہ دیا جائے اور اس سے استدلال کیا جائے۔ چنانچہ بقرہ میں ان کے عہد کا حوالہ دیا۔ بعد کی سورہ میں دوسرے انبیا کے عہد کا ذکر ہوا۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ ان لوگوں کا خیال صحیح نہیں ہے جو سمجھتے ہیں کہ ترتیب میں سورتوں کی تقدیم و تاخیر صرف ان کی ظاہری بڑائی چھوٹائی پر مبنی ہے۔ ہمارے نزدیک اس کا تعلق معانی و مطالب سے ہے۔ معانی کی ترتیب کے لحاظ سے حکمت جس ترتیب کی مقتضی ہوئی ہے وہ ترتیب قرآن میں اختیار فرمائی گئی ہے۔ البتہ اگر کہیں معانی کے اعتبار سے دو سورتیں ایک ہی درجے اور ایک ہی مزاج

کی ہوئی ہوں تو ممکن ہے، وہاں مجرد طول و حجم کی بنا پر ایک کو دوسرے پر مقدم کر دیا گیا ہو۔ لیکن یہ بات محض قیاس کے حد تک صحیح قرار دی جا سکتی ہے، ورنہ ایسے مواقع میں بھی گمان یہی ہوتا ہے کہ کوئی گہری معنوی حکمت ایک کو دوسرے پر مقدم کرنے کا باعث ہوئی ہوگی اگرچہ وہ حکمت ہماری سمجھ میں نہ آ رہی ہو۔

د۔ سورہ کے مطالب کا تجزیہ

یہ جو کچھ ہم نے عرض کیا ہے اس کا تعلق سورہ کے موضوع، اس کے ظاہری نظام اور سابق سورہ کے ساتھ اس کے تعلق سے ہے۔ اب ہمیں چند باتیں اس کے اندرونی نظام اور اس کے مختلف اجزا کے باہمی ربط و تعلق کے بابت بھی کہنی ہیں۔

اس سورہ پر جو شخص بھی تامل کی نظر ڈالے گا اس پر یہ حقیقت واضح ہوگی کہ یہ دو بڑے حصوں میں منقسم ہے۔ اس کے نصف اول میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت کا اثبات اور اہل کتاب خصوصاً نصاریٰ کی گمراہیوں کا بیان ہے اور اس کے دوسرے نصف میں مسلمانوں کو اہل کتاب کی ان گمراہ کن چالوں سے خبردار کیا گیا ہے جو وہ ان کو راہِ حق سے ہٹانے کے لیے اختیار کر رہے ہیں یا اختیار کرنے والے ہیں۔ ساتھ ہی ان کو اللہ کی رسی مضبوطی سے تھامے رہنے، اطاعت پر جمے رہنے، جہاد کرنے اور امتحان کے مواقع پر انتشار و اختلاف سے بچنے کی تاکید فرمائی کہ اسی طرح وہ اسلام کی پیروی کا صحیح حق ادا کر سکیں گے اور نرمی و سختی دونوں صورتوں میں اللہ کی اطاعت پر قائم رہ سکیں گے۔ اگر وہ ان باتوں کی خلاف ورزی کریں گے تو ان کا حشر بھی وہی ہوگا جو موسیٰ علیہ السلام کی امت کا ہوا کہ انھوں نے اپنے پیغمبر کی نافرمانی کی تو چالیس سال تک صحرا ہی میں بھٹکتے رہ گئے۔

اس پہلو سے دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کے نصف اول کی حیثیت تمہید کی ہے اور نصف ثانی کی حیثیت مقصود کی۔ اس روشنی میں پوری سورہ کی تلاوت کیجیے تو آیات کا باہمی نظم سمجھنے میں بڑی آسانی ہوگی اور اس تمہید سے اصل مقصود یہی ہے۔ رہا آیات کا باہمی نظم اور اس کے معانی کی وضاحت تو یہ چیز اس وقت سامنے آئے گی جب ہم سورۂ بقرہ کی طرح اس کے اجزا کو بھی الگ الگ مجموعوں کی شکل میں لے کر ان کی تفسیر کریں گے۔ چنانچہ اب ہم اللہ تعالیٰ کی توفیق کی رہنمائی میں اس سورہ کی تفسیر شروع کرتے ہیں۔

وَمَا تَوْفِيْقِىْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ۔

---

[1] یہ تمہیدی بحث بیشتر استاذ رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے۔

سُوْرَةُ اٰلِ عِمْرٰنَ (۳)

مَدَنِيَّةٌ ـــــــــــــــ اٰيَاتُهَا ۲۰۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○

آیات الٓمّٓ ۚ ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ؕ ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَیْكَ
۱-۶ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ
وَالْاِنْجِیْلَ ۙ ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ؕ
اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ؕ وَاللّٰهُ
عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَخْفٰى عَلَیْهِ شَیْءٌ فِی الْاَرْضِ
وَلَا فِی السَّمَآءِ ؕ ﴿۵﴾ هُوَ الَّذِیْ یُصَوِّرُكُمْ فِی الْاَرْحَامِ كَیْفَ
یَشَآءُ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِیْزُ الْحَكِیْمُ ﴿۶﴾

شروع خدائے رحمان ورحیم کے نام سے

ترجمۂ آیات ۱-۶ یہ الٓمّٓ ہے۔ اللہ ہی معبود ہے، نہیں ہے کوئی معبود مگر وہی، زندہ اور قائم رکھنے والا۔ اس نے تم پر کتاب اتاری حق کے ساتھ مصداق اس کی جو اس کے آگے سے موجود ہے۔ اور اس نے تورات اور انجیل اتاری اس سے پہلے لوگوں کے لیے ہدایت بنا کر۔ اور پھر فرقان اتارا۔ بے شک جن لوگوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا، ان کے لیے سخت عذاب ہے اور اللہ غالب اور انتقام لینے والا ہے۔ اللہ سے کوئی چیز بھی مخفی نہیں ہے، نہ زمین میں نہ آسمان میں۔ وہی ہے جو تمہاری صورت گری کرتا ہے رحموں کے اندر جس طرح چاہتا ہے۔ نہیں کوئی معبود مگر وہ، وہ غالب اور حکیم ہے۔

۱۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

الٓـمّٓ (۱) سورۂ بقرہ کی تفسیر میں حروفِ مقطعات پر ایک جامع بحث ہم کر چکے ہیں۔ وہاں ہم نے اس باب میں استاذ امام مولانا فراہی رحمۃ اللہ علیہ کا نقطۂ نظر بھی پیش کر دیا ہے۔ اس کے سوا کوئی نئی چیز اس سلسلے میں ہمارے سامنے ایسی نہیں آئی جو یہاں قابلِ ذکر ہو۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ (۲) اس آیت میں جو اسمائے حسنیٰ مذکور ہیں سب کی تحقیق گزر چکی ہے، بعض کی تفسیر سورۂ فاتحہ میں، بعض کی سورہ بقرہ میں۔

صفاتِ حیات و قیومیت کے اسرار و مقتضیات

یہ امر، جیسا کہ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں، ملحوظ رہے کہ اس سورہ میں استدلال بیشتر صفاتِ الٰہی سے ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سب سے پہلے صفاتِ حیات و قیومیت کو لیا ہے۔ ان دونوں صفتوں کے اسرار و حقائق پر ہم آیت الکرسی کے اسرار و حقائق کے ضمن میں گفتگو کر چکے ہیں۔ یہاں ان کا اعادہ باعثِ طوالت ہوگا۔ یہاں موقع کلام کی مناسبت سے ان صفات کا حوالہ کتابِ الٰہی کی ضرورت کے اثبات کے پہلو سے ہے۔ چنانچہ بعد کی آیات سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ، جس کے سوا کوئی معبود نہیں، ایک زندہ خدا ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے، ہماری دعائیں، فریادیں اس تک پہنچتی ہیں، ہمارے اعمال و افعال اس کی نظر میں ہیں۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ وہ ہماری دعائیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے اور ہمارے اعمال پر وہ ایک دن جزا اور سزا بھی دے گا۔ پھر ایک قدم اور آگے بڑھ کر اس سے یہ بات بھی لازم آتی ہے کہ بندے اپنی زندگی میں وہ رویہ اختیار کریں جو اسے پسند ہو۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہے کہ بندوں میں اس بات کی جستجو ہو کہ کون سے اعمال خدا کو پسند ہیں، کون سے ناپسند، تاکہ وہ اس کی اطاعت و ہدایت کی راہ اختیار کر کے سعادت کا مقام حاصل کر سکیں اور حقیقی زندگی کے چشمۂ حیواں سے فیضیاب ہو سکیں۔

اہل کتاب "خداوند خدا"، "زندہ خدا" کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ ان کے انبیا کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ جہاں کہیں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت، اس کے علم اور اس کی غیرت کا اظہار ہوا ہے بالعموم اس کے لیے "زندہ خداوند" ہی کی تعبیر استعمال ہوئی ہے۔ نصاریٰ اگرچہ اپنے زعم کے مطابق ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ بھی "زندہ خدا" کی تعبیر سے ناآشنا نہیں تھے۔ اس وجہ سے یہ بات بداہتہً ان کے خلاف جاتی ہے کہ ایک طرف تو وہ زندہ خدا کا تصور رکھتے ہیں اور دوسری طرف اس کا مصلوب ہونا بھی مانتے ہیں۔

اسی طرح "قیوم" کی صفت بھی انبیا کے صحیفوں میں بار بار مذکور ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کے معنی یہ ہیں کہ آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب اللہ ہی کے حکم اور اس کی قدرت سے

قائم ہے۔ یہ صفت اللہ تعالیٰ کی ان بدیہی صفات میں سے ہے جن پر عقلاً بھی ایمان لانا ضروری ہے اور انبیا کے صحیفوں کی رو سے بھی۔ نصاریٰ بھی ان صحیفوں پر ایمان کے مدعی ہیں لیکن اس کے باوجود وہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے قائل ہیں، اگر ان سے یہ سوال کیا جائے کہ جب تم خود اقرار کرتے ہو کہ حضرت مسیح بھوک پیاس محسوس کرتے تھے، غذا اور پانی کے محتاج تھے، بغیر ان چیزوں کے وہ اپنی ہستی کو قائم رکھنے پر قادر نہ تھے تو پھر وہ خدا کس طرح ہوئے، جب کہ خدا کے لیے تمھارے اپنے انبیا کے ارشاد کے بموجب قیوم ہونا ضروری ہے؟ یا یہ سوال کیا جائے کہ جب تمھاری اپنی انجیلوں سے ثابت ہے کہ حضرت مسیحؑ مصائب و شدائد پیش آنے پر روئے، ان کا دل تنگ ہوا اور سولی پر انھوں نے فریاد کی تو پھر وہ آسمان و زمین کے تھامنے والے اور قائم رکھنے والے کیسے ہو سکتے ہیں؟ تو ان سوالوں کے جواب میں ان کے پاس ضد اور کٹ حجتی کے سوا کچھ بھی نہیں ہوتا۔

یہاں قیوم کی صفت کا حوالہ اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قیوم ہونے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ہمیں ہدایت بخشے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ واحد، ہمارا پروردگار، جس طرح ہمارا پیدا کرنے والا اور ہمیں زندگی بخشنے والا ہے اسی طرح وہ، جیسا کہ آیت الکرسی میں ارشاد ہوا، اپنی خلق کو قائم رکھنے والا بھی ہے اور اس کے لیے اس نے ہر قسم کے اسباب و وسائل پیدا کیے ہیں۔ پھر جب اس نے ہماری معیشت کے لیے یہ کچھ سامان کیے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ہماری اجتماعی زندگی کے لیے وہ چیز نہ دے جو ہمارے قیام و بقا کی ضامن ہو سکے درآنحالیکہ یہ چیز ہماری خلقت کی اصل غایت ہے۔ چنانچہ یہی چیز قیام عدل و قسط کی اصل اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے شرائع و احکام کے نزول کی بنیاد بنی اس لیے کہ اس کے بغیر فطرتِ انسانی ارتقا کے اس درجے کو حاصل نہیں کر سکتی تھی جو اس کے وجود کے اندر مضمر ہے۔

یہ قیومیت اس بات کی بھی مقتضی ہوئی کہ خدائے قیوم و کارساز اس امر کی بھی نگرانی رکھے کہ جب بندے اپنی خود مختاری اور سرکشی سے کام لے کر اس کے نظامِ عدل کو بالکل مٹا دینے کی کوشش کریں تو وہ اپنے ایسے بندوں کو بھی اٹھاتا رہے جو اس کو از سر نو بحال کرنے کے لیے اپنی مساعی صرف کریں۔ چنانچہ دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے تک اللہ تعالیٰ نے دنیا کو عدل و حق اور اپنی سیدھی راہ پر استوار رکھنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور خاتم الانبیا پر دین کی تکمیل کر دینے اور کتابِ الٰہی کو ہر قسم کی دست اندازیوں سے محفوظ کر دینے کے بعد اس مقصد کے لیے یہ اہتمام فرمایا کہ ہر دور میں اس امت کے اندر ایک ایسا گروہ، خواہ وہ کتنا ہی قلیل التعداد ہو، پیدا ہوتا رہے گا جو خود حق و عدل پر قائم اور دوسروں کو اس عدل و حق کے قائم کرنے کی دعوت دیتا رہے گا۔ اس حقیقت کی وضاحت حدیثوں میں بھی ہوئی ہے اور اس کی طرف

بعض لطیف اشارات اس سورہ میں بھی آ رہے ہیں جن کی طرف ہم آگے انشاء اللہ موزوں مقامات میں توجہ دلائیں گے۔

نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۗ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ (۳)

قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت

'حق' کے معنی کی تحقیق تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم بیان کر چکے ہیں۔ یہاں اس کے مختلف معانی میں سے 'قولِ فیصل' مراد ہے۔ یعنی وہ بات جو نزاع و اختلاف کا فیصلہ کر دے۔ قرآن میں جگہ جگہ یہ بات بیان ہوئی ہے کہ یہود و نصاریٰ کو جو کتاب دی گئی تھی اس میں انھوں نے اختلافات پیدا کر دیے جس کے سبب سے اصل حقیقت گم ہو کر رہ گئی تھی۔ اس گم شدہ حقیقت کو واضح کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن اتارا تاکہ لوگ اللہ کے اصل دین سے بہرہ مند ہوں اور اختلافات و نزاعات کی بھول بھلیاں سے نکل کر دین کی اصلی شاہراہ پر آ جائیں۔

'مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ' پر بھی تفصیلی بحث سورہ بقرہ کی تفسیر میں گزر چکی ہے۔ قرآن کے مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ ہونے کے ایک مشہور معنی تو یہ ہیں کہ یہ بنیادی طور پر پچھلے صحیفوں کی تمام صحیح تعلیمات کی تصدیق کرتا ہے، صرف ان باتوں کی تردید کرتا ہے جو ان میں ملاوٹ کرنے والوں کی طرف سے ملا دی گئی ہیں۔ قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں کی یہ ہم آہنگی و ہم رنگی اس بات کی صاف شہادت ہے کہ یہ سب ایک ہی آفتابِ حق کی شعاعیں اور ایک ہی منبعِ انوار کے پرتو ہیں۔ دوسرا مفہوم اس کا یہ ہے کہ قرآن اور اس کے حامل کی صفات پچھلے صحیفوں کی پیشین گوئیوں میں مذکور ہیں، یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے مصداق کی منتظر تھیں، قرآن کے نزول اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے ان کی تصدیق ہوئی۔ یہ قرآن کے حق ہونے کی ایک بہت بڑی شہادت ہے اور ساتھ ہی اس سے ان صحیفوں کی بھی تصدیق ہو رہی ہے کہ ان میں جو پیشین گوئیاں وارد تھیں وہ سچی ثابت ہوئیں۔ اس پہلو سے قرآن سب سے پہلے ان لوگوں کی طرف سے خیر مقدم کا سزاوار تھا جو اگلے صحیفوں پر ایمان کے مدعی تھے کہ اصلاً قرآن کے ظہور سے سب سے زیادہ انھی کے سر اونچے ہوئے تھے لیکن انھوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے اس کا انکار کیا۔

خلاصۂ مطلب

وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ الآیۃ۔ یہ اوپر والے ٹکڑے کے اجمال کی تفصیل ہے جس سے قرآن کے اتارے جانے کی ضرورت واضح ہو جاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ حی و قیوم ہے اس وجہ سے اس نے ہماری زندگی کی رہنمائی اور ہمیں عدل و قسط پر استوار رکھنے کے لیے قرآن کو قولِ فیصل بنا کر اتارا ہے۔ اس سے پہلے اس نے لوگوں کی ہدایت

کے لیے تورات اور انجیل نازل فرمائیں لیکن ان کے پیروؤں نے ان میں تحریف اور ان کے بعض حصوں کو فراموش کرکے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کردیے جس کے سبب سے حق و باطل میں امتیاز ناممکن ہوگیا یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بناکر اتارے۔ چنانچہ اس نے یہ کتاب نازل فرمائی۔ اب جو لوگ اس کتاب کا انکار کریں گے ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے سخت عذاب ہے اس لیے کہ ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کے اس نظامِ عدل و قسط کے دشمن ہیں جو اس کی مخلوق کی صلاح و فلاح اور اس کی دنیا و آخرت دونوں کی سعادت کے لیے ضروری ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو چھوڑ دے، ان کی عدل شکنی کی ان کو سزا نہ دے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس نے اپنی دنیا کو تباہی کے لیے چھوڑ دیا اور اس کے بقا سے اسے کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ درآنحالیکہ اس کی صفت، جیسا کہ اسی سورہ میں آگے ذکر آئے گا، قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ہے۔ اس قوامیت کا لازمی تقاضا ہے کہ وہ اس قسط کے دشمنوں سے انتقام لے اور ان کو واجبی سزا دے۔ وہ عزیز یعنی غالب اور قدرت والا ہے، کمزور اور ناتوان نہیں ہے کہ کوئی اسے بے بس کردے، اسی طرح وہ انتقام والا ہے یعنی عدل و قسط کے معاملے میں غیور ہے، سرد مہر اور بے احساس نہیں ہے کہ ان کی پامالی پر راضی ہوجائے۔ یہ اس کی انھی صفات کا ظہور ہے کہ جن قوموں نے اس کے قائم کردہ قسط کو مٹایا ہے، ایک خاص حد تک ان کو مہلت دینے کے بعد اس نے ان کو صفحۂ ہستی سے مٹا دیا ہے اور جب جب اس کے شرائع و احکام کو نابود کرنے کی کوشش کی گئی ہے اس نے ان کو از سرِ نو تازہ کرنے اور سنوارنے کا اہتمام فرمایا ہے۔ عدل و قسط کے قیام و بقا کے لیے اپنی اسی سنت کو یہاں انتقام سے تعبیر فرمایا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ (۵) هُوَ الَّذِيْ يُصَوِّرُكُمْ فِي الْاَرْحَامِ كَيْفَ يَشَآءُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۶)

قیامِ عدل پر صفاتِ الٰہی سے استدلال

اوپر والی آیت میں کتابِ الٰہی کے مخالفین یا بالفاظ دیگر عدل و قسط کے ہادین کے لیے جو سزا مذکور ہوئی ہے یہ اس کی دلیل ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ خدا کی اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر رہتا ہے۔ اس سے کوئی بات بھی مخفی نہیں رہتی، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، اور خواہ زمین میں پیش آئے یا آسمانوں میں، خدا کا علم ہر چیز اور ہر جگہ کو محیط ہے اور محیط کیوں نہ ہو، اسی نے تو سب کو پیدا کیا اور وہی ہے جو رحموں کے اندر صورت گری فرماتا ہے تو جس نے پیدا کیا اور جس نے صورت گری فرمائی کیا وہ بھی بے خبر ہوسکتا ہے اَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ (کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی نہ جانے گا)

اس کے بعد توحید اور خدا کی صفات میں سے عزیز اور حکیم کا حوالہ دیا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ محیطِ کل علم رکھنے والی ہستی اگر قیامِ عدل و قسط کا اہتمام نہ کرے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوسکتی ہے کہ اس کو عزت و قدرت حاصل نہیں ہے یا عزت و قدرت تو حاصل ہے لیکن اس کو اپنے کاموں میں کسی حکمت

مصلحت کی کوئی پروا نہیں، بس ایک کھلنڈرے کا کھیل ہے، خیر ہو یا شر، ظلم ہو یا انصاف اس سے اسے کچھ بحث نہیں، دونوں ہی چیزیں اس کی نظر میں یکساں ہیں۔ یہ خیال بالبداہت باطل ہے۔ اللہ تعالیٰ عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، اسے ہر چیز پر قدرت بھی حاصل ہے اور اس کے ہر کام میں عدل و حکمت بھی ہے اور ساتھ ہی وہ ہر چیز سے باخبر بھی ہے تو یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ ان لوگوں سے انتقام نہ لے گا جو اللہ کی اس کتاب کا انکار کریں گے جو اس نے دنیا میں از سرِ نو حق و عدل کے آثار و اعلام کو اجاگر کرنے کے لیے نازل فرمائی ہے۔

۲۔ آگے کا مضمون —— آیات ۷-۱۷

قرآن کے نزول کی ضرورت واضح کرنے کے بعد اب یہ بات واضح کی جا رہی ہے کہ کس طرح کے لوگ ہیں جو اس قرآن کا انکار کر رہے ہیں اور وہ کیا چیزیں ہیں جن کو وہ اپنے اس انکار کے لیے بہانہ بنا رہے ہیں۔ اس سلسلے میں فرمایا ہے کہ انکار کی راہ ان لوگوں نے اختیار کی ہے جن کے دلوں میں کجی اور جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہے۔ اپنے اس ذوق کی وجہ سے وہ قرآن کی اصل تعلیمات سے کوئی لگاؤ نہیں رکھتے۔ وہ اس میں صرف ایسی چیزیں ڈھونڈھتے ہیں جن کی آڑ لے کر وہ قرآن کے خلاف لوگوں کے دلوں میں کچھ شبہات و شکوک پیدا کر سکیں اور اس طرح خود بھی راہِ حق سے گریز اختیار کریں اور جس حد تک ان کا زور چلے دوسروں کو بھی اس سے بدکائیں۔ چنانچہ ان کی ساری دلچسپی محکمات کے بجائے صرف متشابہات سے ہوتی ہے اس لیے کہ ان کا تعلق آخرت کی زندگی کی تمثیلات و تشبیہات سے ہوتا ہے، ان کے اندر موشگافی اور کرید کر کے کوئی ایسی بات نکالی جا سکتی ہے جو خود ان کی ضلالت کے لیے بھی ایک بہانہ بن سکے اور دوسروں کو بھی اس سے فتنے میں مبتلا کیا جا سکے۔

اس کے بعد ان لوگوں کا ذکر فرمایا ہے جن کے اندر علم و عقل کی پختگی موجود ہے۔ ان لوگوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ لوگ اللہ کی آیات کی قدر کرتے ہیں اور اس کی تعلیمات و ہدایات سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ یہ قرآن کے محکمات کی طرح اس کے متشابہات کی بھی قدر کرتے ہیں اور ان کو اعتراض و فتنہ جوئی کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو اضافۂ علم کا ذریعہ بناتے اور ان پر صدقِ دل سے ایمان لاتے ہیں۔ اگر کوئی بات اپنی فہم کی گرفت سے ماورا پاتے ہیں تو اس کی حقیقت و ماہیت کے درپے ہونے اور اس کو فتنہ بنانے کے بجائے اس کو اللہ کے حوالے کرتے ہیں کہ یہی رویہ علم و ایمان کی پختگی کا مقتضیٰ ہے۔ نیز ان کے اندر آخرت کا پختہ یقین ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ شیاطین کی وسوسہ اندازیوں سے محفوظ رہنے کے لیے اللہ تعالیٰ سے برابر دعا بھی کرتے رہتے ہیں کہ ایمان کی دولت سے بہرہ یاب فرمانے کے بعد وہ ان کو کسی گمراہی میں پڑنے سے محفوظ رکھے۔

اس کے بعد گمراہی کے ان اسباب کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے پچھلے ہم مشربوں کی تباہی کے باعث ہوئے اور ساتھ ہی مسلمانوں کی کامیابی کے بعض تازہ واقعات کا حوالہ دے کر یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اگر ان واقعات سے انھوں نے عبرت نہ پکڑی تو ان کا بھی وہی انجام ہوگا جو پچھلوں کا ہو چکا ہے۔

اس کے بعد ان حجابات کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو ان کے اور قرآن کے درمیان آج حائل ہیں اور ساتھ ہی ان کی بے حقیقتی اور بے ثباتی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے کہ دنیائے فانی کی جن چیزوں پر ریجھ کر قرآن سے منہ موڑ رہے ہو ان کی حقیقت جلوۂ سراب سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ان کے پیچھے بھاگنے کے بجائے ابدی زندگی کی نعمتوں اور خدا کی خوشنودی کے طالب بنو جس کی راہ صبر، سچائی، اطاعتِ الٰہی، انفاق فی سبیل اللہ اور استغفار سے کھلتی ہے اور قرآن اسی راہ کی طرف بلانے کے لیے نازل ہوا ہے۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ آیات ۷ - ۱۷
اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ
فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ وقف منزل وقف لازم
اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا
الْاَلْبَابِ ۝۷ رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ
لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝۸ رَبَّنَآ
اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ
الْمِيْعَادَ ۝۹ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ ع ۹
وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝۱۰
كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ

فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۱﴾ قُلْ
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ
الْمِهَادُ ﴿۱۲﴾ قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِىْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ
فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْىَ
الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ
لَعِبْرَةً لِّاُولِى الْاَبْصَارِ ﴿۱۳﴾ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ
النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ
وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ
الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾ قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ
مِّنْ ذٰلِكُمْ ؕ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِىْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ
اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَاۤ اِنَّنَاۤ
اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾ الصّٰبِرِيْنَ
وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

ترجمہ آیات ۷-۱۷

وہی ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری جس میں محکم آیات ہیں جو اصل کتاب کا درجہ رکھتی ہیں اور دوسری کچھ آیتیں اس میں ایسی ہیں جو متشابہ ہیں۔ تو جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس میں سے متشابہات کے درپے ہوتے ہیں تاکہ فتنہ پیدا کریں اور ان کی حقیقت و ماہیت معلوم کریں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا تو

جو لوگ علم میں راسخ ہیں وہ یوں کہتے ہیں کہ ہم ان پر ایمان لائے یہ سب ہمارے رب ہی کے پاس سے ہیں۔ اور یاد دہانی تو اہلِ عقل ہی حاصل کرتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہمارے دلوں کو ہدایت بخشنے کے بعد کج نہ کر اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت بخش۔ تو نہایت بخشنے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار! تو سب لوگوں کو ایک ایسے دن کے لیے جمع کرکے رہے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اللہ اپنے وعدے کی خلاف ورزی نہیں کرے گا۔ ۷-۹

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا، نہ ان کے مال خدا کے ہاں کچھ کام آئیں گے، نہ ان کی اولاد۔ اور وہی لوگ دوزخ کے ایندھن بنیں گے۔ ان کا بھی وہی حال ہونا ہے جو آلِ فرعون اور ان لوگوں کا ہوا جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ انھوں نے ہماری آیتوں کی تکذیب کی تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اللہ سخت پاداش والا ہے۔ ۱۰-۱۱

ان لوگوں سے جنھوں نے کفر کیا ہے یہ کہہ دو کہ تم مغلوب ہو گے اور جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ جن دو گروہوں میں مڈبھیڑ ہوئی ان کی سرگزشت میں تمھارے لیے نشانی ہے۔ ایک گروہ اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا، دوسرا کافر تھا، یہ ان کو کھلم کھلا ان سے دوگنے دیکھتے تھے اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی تائید سے مدد فرماتا ہے۔ اس میں آنکھیں رکھنے والوں کے لیے بصیرت ہے۔ ۱۲-۱۳

لوگوں کی نگاہوں میں مرغوباتِ دنیا عورتیں، بیٹے، سونے چاندی کے ڈھیر، نشان زدہ گھوڑے، چوپائے اور کھیتی کھبا دی گئی ہیں۔ یہ دنیوی زندگی کے سروسامان ہیں اور اللہ کے پاس اچھا ٹھکانا ہے۔ ان سے کہو، کیا میں تمھیں ان چیزوں سے بہتر چیز کا پتہ

بدوں ؛ جو لوگ تقویٰ اختیار کریں گے ان کے لیے ان کے رب کے پاس باغ ہیں جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی۔ اللہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے۔ جو یہ دعا کرتے رہتے ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لائے پس تو ہمارے گناہوں کو بخش اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ جو صابر، راستباز، فرمانبردار، راہِ خدا میں خرچ کرنے والے اور اوقاتِ سحر میں مغفرت چاہنے والے ہیں۔ ۱۴-۱۷

۳- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ۭ فَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ زَيْغٌ فَيَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَاۗءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَاۗءَ تَاْوِيْلِهٖ ۚ وَمَا يَعْلَمُ تَاْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ يَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ (۷)

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ (وہی خدا ہے جس نے تمہارے اوپر کتاب اتاری) سے اشارہ اس عزیز و حکیم اور حی و قیوم خدا کی طرف ہے جس کا ذکر اوپر گزر چکا ہے اور اس سے مقصود یہاں مخاطب کو کئی چیزوں کی طرف متوجہ کرنا ہے۔

ایک تو اس عظیم رحمت کی طرف اشارہ کرنا ہے جو اس کتاب کی شکل میں ظہور میں آئی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صفات حیات و قیومیت کا ظہور ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو زندگی جاوداں سے بہرہ مند اور ان کو جادۂ حق پر استوار کرنے کے لیے یہ کتاب اتاری ہے۔ اس عظیم نعمت کا حق یہ ہے کہ بندے اس کی قدر پہچانیں، اس پر ایمان لائیں اور اس کے ذریعے سے حیاتِ جاوداں اور بقائے دوام حاصل کریں۔

دوسرے اس میں ان لوگوں کے لیے تخویف و تہدید کا پہلو بھی ہے جو اس کی تردید و تکذیب کریں گے اس لیے کہ جس خدا نے یہ کتاب اتاری ہے وہ عزیز بھی ہے اور قیوم بھی۔ اس کی اس عزت و حکمت اور اس قیومیت کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا دے جو اس کے قانونِ حق و عدل کی راہ میں مزاحم ہوں۔

تیسرے اس سے نفس کتاب کے مزاج کی طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ یہ ایک خدائے عزیز و حکیم کا کلام ہے اس وجہ سے یہ خود بھی عزیز و حکیم ہے۔ چنانچہ قرآن میں جگہ جگہ اس کی صفت عزیز و حکیم آئی بھی ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ کتاب الجھنے اور موشگافی کرنے کے لیے نہیں ہے بلکہ بقدر ظرف و توفیق فائدہ اٹھانے کے لیے ہے۔ آدمی اس ناپیدا کنار سمندر کی حکمتوں سے جو فائدہ اٹھا سکے اٹھالے، یہ توقع نہ کرے کہ وہ اس کے تمام اسرار و حقائق کا احاطہ کر سکتا ہے۔ اس کی جو باتیں سمجھ میں نہ آئیں ان کو فتنہ اور شبہات و شکوک کا ذریعہ نہ بنائے بلکہ ان کو اللہ کے حوالہ کرے۔

اس آیت میں چند الفاظ ایسے استعمال ہوئے ہیں جن کی نوعیت کچھ قرآنی اصطلاحات کی سی ہے۔ چونکہ آیت کا ٹھیک ٹھیک مفہوم اس وقت تک واضح نہیں ہو سکے گا جب تک ان اصطلاحات کا مفہوم اچھی طرح واضح نہ ہو جائے اس وجہ سے پہلے ہم ان کی وضاحت کرتے ہیں۔

'آیاتِ محکمات' سے مراد

آیاتٌ مُّحْکَمَاتٌ: آیات محکمات سے مراد قرآن کی وہ آیات ہیں جو آفاق و انفس کی بالکل بدیہیات، خیر و شر کے مسلمات، اور معروف و منکر کے قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہیں۔ جن کو دل قبول کرتے ہیں اور جن کو قبول کرنے کے لیے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو۔ جن کے حق میں ہر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر تعصب، اجذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے پڑے ہوئے نہ ہوں۔ انھی محکمات پر ہر صحیح مذہب کی بنیاد ہوتی ہے اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب اور تمام انبیا سے یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہیں۔ چونکہ فطرت انسانی کے اندر ان کی جڑیں نہایت مستحکم ہوتی ہیں، شبہات و شکوک کی آندھیاں ان کو ہلانے سے قاصر رہتی ہیں اس وجہ سے قرآن نے ان کو محکمات سے تعبیر کیا ہے۔

'اُمُّ الکتاب' کا مفہوم

اُمُّ الْکِتٰبِ:۔ آیات محکمات کی تعریف یہ فرمائی ہے کہ ان کی حیثیت ام الکتاب کی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بقیہ ساری کتاب کا مرجع و مرکز وہی محکمات ہوتی ہیں، انھی پر ساری بحث کا مدار ہوتا ہے، ساری شاخیں انھی سے پھوٹتی ہیں۔ اگر کوئی نزاع و اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ بھی انھی کی کسوٹی پر پرکھ کر ہوتا ہے۔ پھر انھی کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط کیے جائیں اور ان مسائل پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح اصولوں پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

'آیاتِ متشابہات' سے مراد

مُتَشَابِهَاتٌ:۔ متشابہات سے مراد وہ آیتیں ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کے دسترس سے باہر کی باتیں تمثیلی و تشبیہی رنگ میں قرآن نے بتائی ہیں۔ یہ باتیں جس بنیادی حقیقت سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں وہ بجائے خود واضح اور مبرہن ہوتی ہے، عقل اس کے اتنے حصے کو سمجھ سکتی ہے جتنا سمجھنا اس کے لیے ضروری ہوتا ہے۔ البتہ چونکہ اس کا تعلق ایک نادیدہ عالم سے ہوتا ہے اس وجہ سے قرآن ان کو تمثیل و تشبیہ کے انداز میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے طالب بقدر استعداد ان سے فائدہ اٹھالیں اور ان کی اصل صورت و حقیقت کو علم الٰہی کے حوالہ کریں۔ یہ باتیں خدا کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں

اور اس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں، ان کا جس حد تک ہمارے لیے سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم و یقین میں اضافہ ہوتا ہے لیکن اگر ہم اپنی حد سے آگے بڑھ کر ان کی اصل حقیقت اور صورت کو اپنی گرفت میں لینے کی کوشش کریں تو یہ چیز فتنہ بن جاتی ہے اور اس کا نتیجہ صرف یہ نکلتا ہے کہ انسان اپنے ذہن سے شک کا ایک کانٹا نکالنا چاہتا ہے اور اس کے نتیجے میں بے شمار کانٹے اس کے اندر چبھا لیتا ہے۔ یہاں تک کہ اس نایافتہ کی طلب میں اپنی یافتہ دولت کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے اور نہایت واضح حقائق کی اس لیے تکذیب کر دیتا ہے کہ ان کی شکل و صورت ابھی اس کے سامنے نمایاں نہیں ہوئی۔ قرآن نے اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ (بلکہ انھوں نے اس چیز کو جھٹلایا جو ان کے علم کی گرفت میں نہیں آئی اور ابھی تک اس کی حقیقت ان کے سامنے ظاہر نہیں ہوئی ہے) یونس - ۳۹۔

متشابہات کی بعض مثالیں

ہم یہاں قرآن سے اس قسم کے بعض متشابہات کی مثالیں نقل کرتے ہیں۔ سورۂ مدثر میں قرآن نے دوزخ کے عذاب کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

سَأُصْلِيهِ سَقَرَ ۝ وَمَا أَدْرَاكَ مَا	میں اس کو دوزخ میں داخل کروں گا اور تمھیں کیا پتہ کہ
سَقَرُ ۝ لَا تُبْقِي وَلَا تَذَرُ ۝ لَوَّاحَةٌ	دوزخ کیا ہے؟ وہ نہ ذرا ترس کھائے گی اور نہ کسی چیز
لِّلْبَشَرِ ۝ عَلَيْهَا تِسْعَةَ عَشَرَ ۝	کو چھوڑے گی، جسموں کو جھلس دینے والی ہوگی۔ اس پر
(۲۶-۳۰)	خدا کے انیس سرہنگ مقرر ہوں گے۔

اس آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ ایک حقیقت ہے اور قانون مجازات پر جس کا ایمان ہو ان کے لیے اس سے انکار کی کوئی گنجائش نہیں، رہی اس کی تفصیل تو اس کا تعلق چونکہ ایک نادیدہ عالم سے ہے اس وجہ سے اس کی اصل صورت کسی طرح ہماری گرفت میں نہیں آسکتی۔ اس طرح کے معاملات میں صحیح روش یہ ہے کہ آدمی اتنے پر قناعت کرے جو سمجھ میں آتا ہے۔ جو سمجھ میں نہیں آتا وہ اس عالم میں سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا، اس وجہ سے اس کے درپے ہونے کے بجائے اس کو خدا کے حوالے کرے۔ سلیم الطبع انسان ایسا ہی کرتے ہیں لیکن جن کے دلوں میں کجی اور عقلوں میں ٹیڑھ ہوتی ہے وہ یہ روش اختیار کرنے کے بجائے متشابہات و تمثیلات کی حقیقت معلوم کرنے کے درپے ہو جاتے ہیں جس سے وہ خود بھی فتنوں میں پڑتے ہیں اور اپنے جیسے دوسرے بہتوں کو بھی فتنوں میں ڈال دیتے ہیں۔ چنانچہ دیکھیے مذکورہ بالا آیت میں تِسْعَةَ عَشَرَ کا جو لفظ آیا تو قرآن نے اس کے متعلق شرارت پسندوں کا ردِ عمل یہ بتایا ہے کہ وہ اسی کے درپے ہو گئے کہ اس سے کیا مراد ہے؟ اگر اس سے فرشتے مراد ہیں تو یہ سوال انھوں نے اٹھایا کہ انیس کے عدد کی تخصیص میں کیا رمز ہے؟ قرآن نے ان کے اس ردِ عمل پر ان الفاظ میں تبصرہ فرمایا۔

وَمَا جَعَلْنَا أَصْحَابَ النَّارِ إِلَّا	اور ہم نے دوزخ کی پہرہ داری پر نہیں مقرر کیے ہیں مگر

مَلٰٓئِكَةً ۙ وَمَا جَعَلْنَا عِدَّتَهُمْ اِلَّا فِتْنَةً
لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۙ لِيَسْتَيْقِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ وَيَزْدَادَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِيْمَانًا
وَّلَا يَرْتَابَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ
وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۙ وَلِيَقُوْلَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ
مَّرَضٌ وَّالْكٰفِرُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ
بِهٰذَا مَثَلًا ۭ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ
يَّشَاۗءُ وَيَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَمَا
يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ۭ وَمَا هِيَ اِلَّا
ذِكْرٰى لِلْبَشَرِ ۝ (المدثر - ۷۴ : ۳۱)

فرشتے، اور ہم نے ان کی تعداد کو نہیں بنایا مگر کافروں
کے لیے فتنہ، تاکہ وہ لوگ یقین کریں جن کو کتاب ملی
ہے اور ایمان والے اپنے ایمان میں اضافہ کریں اور کتاب
پانے والے اور اہلِ ایمان شک میں نہ پڑیں اور جن کے
دلوں میں بیماری ہے اور جو کافر ہیں وہ یہ کہیں کہ اس قسم
کی تمثیل سے اللہ تعالیٰ کا کیا مطلب ہے؟ اسی طرح اللہ
جس کو چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے ہدایت
بخشتا ہے اور تیرے رب کے لشکروں کو اس کے سوا
کوئی نہیں جانتا، اور یہ نہیں ہے مگر انسانوں کے
لیے یاد دہانی۔

اسی طرح سورہ بقرہ میں جنت کی نعمتوں کا تمثیلی رنگ میں ذکر کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ جب اہلِ جنت کے سامنے جنت کی نعمتیں پیش کی جائیں گی تو وہ خوشی سے پکار اٹھیں گے کہ یہ تو وہی نعمتیں ہیں جن کی ہمیں پہلے قرآن میں سیر کرا دی گئی تھی، قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا (البقرۃ - ۲ : ۲۵) (وہ پکاریں گے، یہ تو وہی چیز ہے جو ہمیں اس سے پہلے بخشی گئی اور وہ دیے جائیں گے اس سے ملتی جلتی) یعنی جنت کی نعمتوں کا ذکر جو تمثیلات و متشابہات کے رنگ میں قرآن میں ہوا ہے اس سے اہلِ ایمان کو تو یہ فائدہ ہوتا ہے کہ وہ دنیا میں بیٹھے ہوئے ایک سیر جنت کی کر لیتے ہیں لیکن انہی تمثیلات و متشابہات سے متعلق فتنہ جویوں اور ضلالت پسندوں کے رویہ کا ذکر قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَحْيٖٓ اَنْ يَّضْرِبَ مَثَلًا
مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ۭ فَاَمَّا
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ
الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا فَيَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ
بِهٰذَا مَثَلًا ۘ يُضِلُّ بِهٖ كَثِيْرًا ۙ وَّيَهْدِيْ بِهٖ كَثِيْرًا ۭ وَمَا
يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ ۝
(البقرۃ - ۲ : ۲۶)

اللہ اس بات سے نہیں جھجکتا کہ کوئی تمثیل بیان کرے
خواہ وہ کسی مچھر کی ہو یا اس سے بھی کسی چھوٹی چیز کی،
تو جو لوگ ایمان رکھتے ہیں وہ تو جانتے ہیں کہ یہ حق ہے
اور ان کے پروردگار ہی کی جانب سے ہے لیکن جن لوگوں
نے کفر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ اس قسم کی تمثیلیں پیش کرنے
سے اللہ تعالیٰ نے کیا چاہا؟ اللہ ان تمثیلوں سے بہتوں
کو گمراہ کرتا ہے اور ان سے بہتوں کو راہ یاب کرتا
ہے اور ان سے نہیں گمراہ کرتا مگر انھیں لوگوں کو جو
خدا کی نافرمانی کرنے والے ہوں۔

اس تفصیل سے یہ بات معلوم ہوئی کہ آیات متشابہات سے مراد قرآن کی وہ آیتیں ہیں جن میں یا تو

آخرت کی نعمتوں اور نقمتوں میں سے کسی نعمت و نقمت کا بیان تمثیلی و تشبیہی رنگ میں ہوا ہے یا خدا کی صفات و افعال میں سے کوئی بات تمثیلی اسلوب میں پیش ہوئی ہے۔ مثلاً آدم میں خدا کا اپنی روح پھونکنا یا حضرت عیسیٰ کو بن باپ کے پیدا کرنا وغیرہ۔ اس طرح کی آیات سے جیسا کہ اوپر بیان ہوا اہل ایمان کے علم و ایمان میں اضافہ ہوتا ہے لیکن جن کی طبیعتوں میں فتنہ پسندی ہوتی ہے وہ انھی کے اندر موشگافیاں کر کے بہت سے فتنے پیدا کر لیتے ہیں۔

تاویل کا مفہوم

تاویل۔ تاویل کا لفظ بھی اس آیت میں ذرا ایک خاص مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ اس سے یہاں مراد مذکورہ بالا قسم کی کسی بیان کردہ شے کی حقیقت اور اس کی صورت ہے۔ جس مفہوم میں یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے اسی مفہوم میں سورۂ یوسف میں استعمال ہوا ہے۔ قَالَ يَا أَبَتِ هَٰذَا تَأْوِيلُ رُؤْيَايَ مِن قَبْلُ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّي حَقًّا، (اس نے کہا اے میرے باپ، یہ ہے میرے اس خواب کی حقیقت جو میں نے اس سے پہلے دیکھا تھا، میرے پروردگار نے اس کو واقعہ ثابت کر دکھایا (یوسف۔ ۱۰۰)

محکمات و متشابہات کے بارے میں چند تنبیہات

یہاں چند باتیں بطور تنبیہ اور بھی قابلِ ذکر ہیں۔ ان سے اس راہ کی ساری الجھنیں انشاء اللہ دور ہو جائیں گی۔

ایک یہ کہ اس آیت میں اسلوبِ کلام حصر کا نہیں ہے۔ اس وجہ سے یہ نہیں گمان کرنا چاہیے کہ بس قرآن کی آیات دو ہی قسموں، محکمات اور متشابہات، ہی میں تقسیم ہیں۔ یہاں صرف انھی دونوں قسموں کا ذکر دو متقابل قسموں کی حیثیت سے ہوا ہے اور مقصود ان کے ذکر سے محض فتنہ پسندوں اور ہدایت پسندوں کے اختلافِ ذوق کو نمایاں کرنا ہے کہ جو طبیعتیں فتنہ پسند ہوں ان کی ساری دلچسپی صرف متشابہات سے ہوتی ہے تاکہ ان کے ذوقِ فتنہ جوئی کے لیے کوئی غذا فراہم ہو سکے۔ برعکس اس کے جو علم و معرفت کے طالب ہوتے ہیں اور جن پر حقیقت پسندی کا رنگ غالب ہوتا ہے ان کی اصلی دلچسپی محکمات سے ہوتی ہے۔ جہاں تک متشابہات کا تعلق ہے ان کا جتنا حصہ ان کی سمجھ میں آتا ہے اس سے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، جو حصہ سمجھ میں نہیں آتا اس کی صورت و ہیئت معلوم کرنے کے پیچھے نہیں پڑتے بلکہ اس کو خدا کے حوالے کرتے ہیں۔ محکمات کی بدولت چونکہ ان کے قدم علم میں بہت راسخ ہو جاتے ہیں اس وجہ سے اس طرح کی چیزیں ان کو متزلزل نہیں کرتیں۔ قرآن میں ان دو قسموں کے علاوہ بھی آیات ہیں لیکن مقصود یہاں چونکہ آیاتِ قرآنی کی تمام انواع کا احاطہ نہیں ہے اس وجہ سے ان کے ذکر کی ضرورت نہیں تھی۔ مثلاً قصصِ قرآن، امثالِ قرآن، تلمیحات و اشارات۔ یہ چیزیں نہ تو اُمّ الکتاب کے درجے اور مرتبے کی ہیں اور نہ ان کو ان متشابہات کے درجے میں رکھنا صحیح ہے جن کی تاویل میں غور و فکر کرنا ممنوع ہو۔

دوسری یہ حقیقت یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کی آیات کا محکم و متشابہ ہونا ہرگز بلحاظ الفاظ نہیں ہے بلکہ صرف بلحاظ معنی ہے۔ قرآن، اپنے الفاظ اور اپنی زبان کے اعتبار سے، تمام تر عربی مبین میں ہے الفاظ

کی تاویل میں جو اختلافات ہوئے ہیں وہ بالعموم تین اسباب سے ہوئے ہیں۔ یا تو غور و تحقیق میں کوتاہی ہوئی ہے یا کسی غلط عقیدے کی بے جا عصبیت اس کا باعث ہوئی ہے، یا عربی زبان سے ناواقفیت اس کا سبب بنی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں اس طرح کے کسی سبب سے کوئی الجھن پیدا ہوئی ہو تو اس پر غور و فکر عربی زبان کے معروف و مسلّم قواعد و ضوابط کی روشنی میں ہونا چاہیئے۔ یہ ان چیزوں میں سے نہیں ہے جن پر غور و فکر ممنوع ہو۔

تیسری بات یہ ہے کہ متشابہات ہوں یا محکمات، قرآن میں یہ دونوں قسمیں ممیّز اور معلوم ہیں۔ یہ بات نہیں ہے، جیسا کہ بعض متکلمین نے گمان کیا ہے کہ یہ دونوں غیر ممیّز ہیں اور نہ یہ بات ہے کہ الفاظ کی اپنے معانی پر دلالت کوئی مشتبہ اور مشکوک چیز ہے۔ جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انھوں نے بالکل غلط سمجھا ہے۔ ان میں سے پہلی بات تو صریحًا غلط ہے اور دوسری بات نہایت مبہم ہے جو سرے سے قرآن ہی سے مایوس کر دینے والی ہے حالانکہ قرآن کو اللہ تعالیٰ نے نور و بُرہان بنا کر اتارا ہے۔ جو باتیں عالم غیب سے تعلق رکھنے والی ہیں ان کے متعلق خدا نے ہماری ضرورت کے حد تک خبر دے دی ہے، اس کا جو حصّہ ہم سے محجوب رکھا گیا ہے بس اس کی تاویل پردۂ خفا میں ہے۔

چوتھی یہ کہ قرآن نے یہاں محکم اور متشابہ کا ایک خاص مفہوم مراد لیا ہے جو ان کے لغوی مفہوم سے ایک حد تک الگ ہے۔ بعض دوسرے مقامات میں بھی قرآن میں یہ الفاظ استعمال ہوئے ہیں جہاں ان کے لغوی مفہوم مراد ہیں۔ مثلاً محکم سے مراد وہ کلام ہے جو جامع، واضح اور موجز ہو۔ اس صورت میں اس کا مقابل لفظ مفصّل آتا ہے۔ مثلاً کِتٰبٌ اُحْکِمَتْ اٰیٰتُہٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَکِیْمٍ خَبِیْرٍ (ھود-۱) (یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کی آیات پہلے محکم کی گئیں، پھر ان کی تفصیل کی گئی خدائے حکیم و خبیر کی طرف سے) سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ شروع شروع میں اللہ تعالیٰ نے اپنی تعلیمات و ہدایات قولِ محکم کی شکل میں اتاریں تاکہ وہ ذہن و حافظے میں اچھی طرح راسخ ہو سکیں اور دل اور زبان دونوں کے لیے وہ ہلکی پھلکی محسوس ہوں۔ پھر بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے یا نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے ذریعے سے ان کی تفصیل فرما دی۔ اسی طرح متشابہ کا ایک عام مفہوم بھی ہے وہ یہ کہ ایک دوسری سے ملتی جلتی ہم آہنگ و ہم رنگ چیز۔ اپنے اس مفہوم کے اعتبار سے پورا قرآن متشابہ ہے۔ چنانچہ اسی پہلو سے قرآن کو متشابہ کہا گیا ہے۔ کِتٰبًا مُّتَشَابِھًا مَّثَانِیَ (زمر-۲۳)

پانچویں یہ کہ جس طرح قرآن محکمات و متشابہات دونوں ہی قسم کی آیات پر مشتمل ہے اسی طرح عالم انفس اور عالمِ آفاق میں جو نشانیاں ہیں وہ بھی محکمات و متشابہات دونوں ہی پر مشتمل ہیں۔ ان کے باب میں بھی اربابِ علم اور اہلِ زیغ کا رویہ وہی ہوتا ہے جو اوپر مذکور ہوا۔ جن کے ذہن و فکر میں پختگی ہوتی ہے وہ محکمات سے اطمینان و یقین حاصل کرتے ہیں اور متشابہات سے شبہات و شکوک میں گرفتار ہونے کے

بجائے ان کو خدا کے علم و حکمت کے حوالے کرتے ہیں اور اپنے علم کی کوتاہی کا اقرار کرتے ہیں۔ برعکس اس کے جن کے دلوں میں کجی ہوتی ہے وہ ان متشابہات کو اپنی اور دوسروں کی گمراہی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس مسئلے پر مفصل بحث انشاء اللہ ہم سورۂ کہف کی تفسیر میں کریں گے۔ غزوۂ اُحد کے واقعہ کو بھی، جیسا کہ ہم تمہیدی بحث میں اشارہ کر چکے ہیں، ایک متشابہ واقعہ کی نوعیت حاصل ہے، چنانچہ اس جنگ کے بعد اس عظیم آیت کا اترنا اس کائنات کی ایک بہت بڑی حقیقت سے پردہ اٹھانے کے لیے تھا۔ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں کہ جس طرح غزوۂ بدر حق و باطل کے درمیان ایک یومِ فرقان تھا جس سے اہلِ ایمان کے قلوب اللہ تعالیٰ کے وعدوں پر مطمئن ہوئے اور اس نے ایک آیت محکم بن کر اہلِ کفر پر اللہ تعالیٰ کی حجت پوری کر دی اسی طرح غزوۂ احد کی حیثیت ایک آیت متشابہ کی ہے اس لیے کہ اس میں بظاہر باطل کو حق پر غلبہ حاصل ہوا جس سے کفار کو یہ گمان ہوا کہ جنگ میں کامیابی و ناکامی کا تعلق صرف تدابیر اور اسباب و وسائل ہی سے ہے، اس میں نہ خدا کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کا کوئی تعلق حق اور باطل سے ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک شدید قسم کی غلط فہمی تھی، جس کا دور ہونا نہایت ضروری تھا چنانچہ جب اس کے دور کرنے کے لیے مناسب وقت آ گیا تو اللہ تعالیٰ نے اس سورہ میں یہ دور فرمائی اور یہ اس سلسلے کی ایک عظیم آیت ہے۔

'زیغ' کی حقیقت

اس آیت میں 'زیغ' کا جو لفظ آیا ہے مختصراً اس کی حقیقت بھی سمجھ لینی چاہیئے۔

زیغ کے اصل معنی میل یعنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کا حامل ہے، ایک کجی اور دوسرے سقوط۔ کوئی چیز جو کھڑی ہو جب جھک جاتی ہے تو گرنے سے قریب ہو جاتی ہے۔ یہ حالت اس رسوخ کے برعکس حالت ہے جو اس آیت میں رَاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ کی بیان ہوئی ہے۔

اہل کتاب کی عام بیماری

یہ زیغ یوں تو اہل ضلالت کی عام بیماری ہے لیکن اہل کتاب اس مرض میں سب سے زیادہ شدت کے ساتھ مبتلا رہے ہیں۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ شروع ہی سے اس بیماری میں مبتلا رہے۔ اور ان کے زیغ کا یہ پہلو خاص طور پر نہایت سنگین ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موجودگی میں اس میں مبتلا رہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ وہ اس کے سبب سے خدا کے غضب میں مبتلا ہوئے۔ قرآن میں اس بات کا ذکر ہوا ہے۔ سورہ صف میں اس کا ذکر اس طرح ہے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ لِمَ تُؤْذُوْنَنِيْ وَقَدْ تَّعْلَمُوْنَ اَنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ (صف - ۵)	اور یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اے میری قوم کے لوگو! تم مجھے کیوں دکھ پہنچا رہے ہو جب کہ تم اچھی طرح یہ جان چکے ہو کہ میں تمہاری طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ پس جب وہ کج ہو گئے تو خدا نے بھی ان کے دل کج کر دیے اور اللہ بدعہدوں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

یہود و نصاریٰ کی گمراہی میں فرق

یہی یہود ہیں جنھوں نے کلمۃ اللہ اور اس قسم کے بعض دوسرے الفاظ کی حقیقت کی تشریح میں فلسفیانہ قسم کی موشگافیاں پیدا کر کے ان کو ایک گورکھ دھندا بنایا جس سے نصاریٰ کے لیے گمراہی کی راہیں کھلیں اور وہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کے عقیدے میں مبتلا ہوئے۔ بعد میں نصاریٰ کی اس گمراہی پر مزید اضافہ بت پرست قوموں کی تقلید سے ہوا اور پھر آہستہ آہستہ وہ حق سے اتنے دور ہو گئے کہ اس سے ان کا رشتہ ہی منقطع ہو گیا اور وہ صریح کفر میں مبتلا ہو گئے۔ چنانچہ قرآن نے ان کے بارے میں یہ تصریح فرمائی ہے کہ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ (ان لوگوں نے کفر کیا جنھوں نے یہ کہا کہ اللہ تو وہی مسیح ابن مریم ہے) (مائدہ ۷۲)

یہود اور نصاریٰ کی گمراہی کی نوعیت میں بس یہ فرق ہے کہ یہود کی گمراہی اصلاً عملی ہے اور نصاریٰ کی اعتقادی۔ اس فرق کی وجہ سے حق کی مخالفت میں ان کا رویہ بھی ایک دوسرے سے مختلف رہا۔ یہود تو قرآن کو حق جاننے کے باوجود اس کی مخالفت کرتے تھے۔ نصاریٰ جس طرح تورات اور انجیل کے متشابہات میں پڑنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے تھے اسی طرح قرآن میں بھی ان کی ساری دلچسپی بس متشابہات ہی سے تھی۔ انہیں میں موشگافیاں کر کے وہ طرح طرح کے فتنے پیدا کرتے اور اس طرح اپنی گمراہی کا بھی سامان کرتے اور دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔ قرآن کے محکمات سے نہ انھوں نے خود دلچسپی لی اور نہ ان لوگوں کو دلچسپی لینے دی جن پر ان کا بس چلا۔ الغرض قلب و نظر کے زیغ اور متشابہات کی پیروی کے باب میں تھے تو یہود و نصاریٰ دونوں ایک ہی سطح پر، یہ بیماری ان میں مشترک تھی لیکن ان کے ذوقی رجحانات ذرا الگ الگ تھے۔ یہود ابتغاء فتنہ سے زیادہ رغبت رکھتے تھے اور نصاریٰ ابتغائے تاویل سے۔ یہ گمراہیاں چونکہ دنیا کے تمام گمراہوں میں مشترک ہیں اس وجہ سے قرآن نے اسلوب بیان عام ہی رکھا ہے تاکہ کلام میں وسعت پیدا ہو سکے یہود و نصاریٰ کی تخصیص نہیں کی۔ لیکن قرآن کا ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ اشارہ انھی کی طرف ہے۔ یہی انداز سورۂ فاتحہ میں بھی ہے۔ اس میں بھی مَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ اور ضَالِّينَ کے الفاظ ہر چند عام ہیں اور ان کے عام ہونے کی وجہ سے ان میں بڑی وسعت پیدا ہو گئی ہے لیکن ان کا خاص اشارہ یہود و نصاریٰ کی طرف ہے۔

متشابہات سے گمراہی کی ایک مثال

متشابہات کی پیروی کی وجہ سے نصاریٰ جس قسم کی گمراہیوں میں مبتلا ہوئے اس کو ایک مثال سے واضح کرنا مفید رہے گا۔

قرآن اور انجیل دونوں اس امر میں باہم متفق ہیں کہ حضرت مسیحؑ کلمۃ اللہ ہیں۔ کلمۃ اللہ کا مفہوم بالکل واضح ہے کہ اس سے امر و حکم کی تعبیر کی جاتی ہے۔ حضرت مسیحؑ کی پیدائش چونکہ فطرت کے عام ضابطے کے خلاف ہوئی تھی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے کلمہ سے تعبیر کیا یعنی ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے کلمہ کن سے ہوئی ہے۔ یہ اس حقیقت کا اظہار تھا کہ اصل شے کسی چیز کے واقع ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ کا حکم ہی ہے۔ اسباب محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ یہ بات قرآن میں نہایت وضاحت سے بیان ہوئی ہے اور اس میں کسی قسم

کا ایچ پیچ نہیں ہے جس سے کسی صاف ذہن کے آدمی کے اندر کوئی الجھن پیدا ہو سکے۔ قرآن نے نہایت غیر مبہم الفاظ میں فرمایا ہے إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ۔ آل عمران۔ ۵۹ (بے شک عیسیٰ کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسی آدم کی، آدم کو مٹی سے پیدا کیا، پھر اس سے کہا کہ ہو جا بس وہ ہو گیا) یعنی آدم کو کلمۂ کن کے ذریعے سے حی و ناطق بنایا۔ اسی چیز کو دوسری جگہ نفخ روح سے تعبیر فرمایا ہے۔ بعینہٖ یہی معاملہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ہے۔

نصاریٰ نے اس واضح بات میں جو تحریف کی اس کی صورت یہ ہوئی کہ جب ان کو بت پرست قوموں سے سابقہ پیش آیا اور ان کے ساتھ ان کی مذہبی بحثیں شروع ہوئیں تو انھوں نے ان پر یہ اعتراض شروع کیا کہ تم تو ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہو، ہم تم سے ہزار درجے افضل ہیں اس لیے کہ ہم آسمانی دیوتاؤں کی پرستش کرتے ہیں۔ نصاریٰ نے اپنے حریفوں کے اس اعتراض سے بچنے کے لیے یہ کوشش کی کہ اپنے عقیدے کو بھی انھی کے عقیدے کے سانچے میں ڈھال دیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے یہ دعویٰ کیا کہ مسیح تو ابن اللہ ہیں، وہ مخلوق نہیں ہیں۔ اپنے اس نئے عقیدے کی آرائش میں انھوں نے ایک طرف تو یونانیوں، مجوسیوں اور ہندوؤں کے فکر و فلسفہ سے مواد لیا اور دوسرے ان یہودی متکلمین کے علم کلام سے رہنمائی حاصل کی جو یہود کے آخری دور کی پیداوار تھے اور جو نہ صرف خالق اور مخلوق کے درمیان وسائل و وسائط کے قائل تھے بلکہ ان کو مستقل ذوات کا درجہ دیتے اور ان کو کلمۃ اللہ کہتے تھے۔ نصاریٰ نے بعینہٖ یہی عقیدہ حضرت عیسیٰؑ کے لیے اختیار کر لیا۔ کچھ عرصے تک تو بات اسی حد تک رہی لیکن آہستہ آہستہ گمراہی سے گمراہی پیدا ہونی شروع ہوئی اور انھوں نے ان کو خدا کا کفو، اسی کے جوہر سے اور ازل سے اس کے ساتھ قرار دے دیا۔ اور پھر اس عقیدے کی تائید کے لیے انجیل یوحنا کے آغاز میں تحریف کے چور دروازے سے بعض عبارتیں بھی داخل کر دیں تاکہ باہر سے برآمد کیے ہوئے اس عقیدے کے لیے گھر کی ایک دلیل بھی فراہم ہو جائے۔

وَمَا يَعْلَمُ (حاشیہ: وما یعلمہ تاویلہ پر وقف ہے) وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيلَهُ إِلَّا اللَّهُ (اور اس کی اصل حقیقت نہیں جانتا مگر اللہ) اوپر کی تفصیلات سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ یہاں وقف ہے۔ یہی مذہب جمہور اہل سنت کا ہے اور یہی حضرت ابن عباسؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت علیؓ، حضرت حسنؓ، مالک بن انسؒ، کسائی اور فراء سے منقول ہے۔ البتہ شیعہ اور بعض متکلمین یہاں وصل کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک متشابہات کی تاویل اللہ تعالیٰ کے سوا راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں۔ اس کی وجہ جہاں تک شیعوں کا تعلق ہے، وہ تو یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اماموں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ ان کو ہر بات کا علم ہوتا ہے۔ رہے دوسرے لوگ جو اس بات کے قائل ہوئے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ تاویل سے مراد معنی لیتے ہیں حالانکہ آیت کا سیاق و سباق اس

کے خلاف ہے۔ اوپر اس کی وضاحت ہو چکی ہے[1]

اگرچہ آیت کے الفاظ اور اس کے مختلف اجزا کی اس وضاحت کے بعد آیت کی صحیح تاویل خود بخود سامنے آگئی ہے لیکن اس کی اہمیت کے پیش نظر مزید اطمینان کے لیے ہم اس کا واضح مفہوم بھی پیش کیے دیتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہی خدا جو عزیز بھی ہے اور حکیم بھی، جو زندہ بھی ہے اور قیوم بھی، اسی نے تورات اور انجیل اتاریں۔ پھر جب ان میں گھپلا کر دیا گیا تو اس کی حکمت اور قیومیت مقتضی ہوئی کہ یہ قرآن اتارے تاکہ اس کے ذریعے سے حق و باطل میں امتیاز ہو سکے تو جو لوگ اس کی مزاحمت کریں گے وہ یاد رکھیں کہ خدائے عزیز حق کو مظلوم نہیں چھوڑے گا، وہ اس کا انتقام ضرور لے گا۔

اس کے بعد اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اہل کتاب جو اس فرقان کی مخالفت کر رہے ہیں تو اس کی اصل وجہ یہ نہیں ہے کہ فی نفسہٖ اس کتاب میں کوئی بات ایسی ہے جو ان کی وحشت کا باعث ہو رہی ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان کے اپنے دلوں میں کجی ہے۔ اس کجی کے سبب سے ان کو اس کتاب کے محکمات سے، جن کی حیثیت اصل کتاب کی ہے اور جن پر اس کی تمام تعلیمات اور اس کے سارے حکمت و فلسفہ کی بنیاد ہے، کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ انہیں اگر دلچسپی ہے تو بس اس کی ان آیات متشابہات سے ہے جن میں کوئی بات تمثیلی و تشبیہی رنگ میں بتائی گئی ہے۔ وہ اپنی طبیعت کے بگاڑ کے سبب سے الجھنوں کے درپے ہوتے ہیں اور فساد انگیزی اور فتنہ آرائی کے لیے ان کی صورت و حقیقت معلوم کرنے کی کوشش کرتے ہیں حالانکہ ان کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو معلوم نہیں۔ جس حد تک ان کا علم ضروری ہے وہ خدا نے کھول دیا ہے، بس اتنے پر قناعت کرنی چاہیئے، ان کی اصل حقیقت کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرنا چاہیئے، وہ اس دن کھلیں گی جس دن وہ سامنے آئیں گی۔ جو لوگ علم میں راسخ ہیں ان کی روش متشابہات کے معاملے میں یہی ہے وہ محکمات اور متشابہات دونوں کو اپنے رب ہی کا عطیہ سمجھتے ہیں اور دونوں پر یکساں ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اپنے علم کی پختگی کی وجہ سے اس رمز سے واقف ہیں کہ آیات الٰہی کا مقصود بندوں کو یاد دہانی ہے اور چونکہ وہ عقل رکھتے ہیں اس وجہ سے ان سے جو فائدہ اٹھانا چاہیئے وہ فائدہ اٹھاتے ہیں، کسی سعی نامراد و لاطائل میں اپنا وقت برباد کر کے اپنے خسران کے اسباب نہیں فراہم کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت یہی ہے کہ اس کی آیات سے فائدہ وہی لوگ اٹھاتے ہیں جو عقل رکھتے ہیں اور اس عقل سے صحیح طور پر کام لیتے ہیں۔

---

[1] ان مطالب کا اکثر حصہ استاذ امام رحمۃ اللہ علیہ کے افادات سے ماخوذ ہے، صرف بعض مطالب کی توضیح میری طرف سے ہے۔ اس وجہ سے اس کی صحیح باتیں مولانا کی طرف منسوب کیجیے اور اگر کہیں خامی ہو تو اس کی ذمہ داری تنہا میرے سر ہے۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۸-۹

ان دونوں آیتوں میں کوئی لغوی یا نحوی اشکال نہیں ہے۔ زیغ کے لفظ کی تحقیق اوپر گزر چکی ہے۔

یہ راسخین فی العلم کی دعا ہے جس سے اس امر کا اظہار ہو رہا ہے کہ وہ اپنے دین کے معاملے میں اتنے بے پروا نہیں ہیں کہ خواہ مخواہ شبہات اور شکوک کو بلاوے بھیج کر بلائیں اور اپنے ایمان و اسلام کو خطرے میں ڈالیں بلکہ وہ اپنے ایمان کی سلامتی کے لیے برابر اپنے پروردگار سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ دین میں ان کے جمے ہوئے قدم اکھڑنے نہ پائیں اور جب فتنوں کی یورش ہو تو خدائے وہاب اپنے پاس سے ان کے لیے وہ روحانی کمک بھیجے جو ان کے ثباتِ قدم کا ذریعہ بنے۔

دوسری آیت میں اس یقین کا اظہار ہے جو ان راسخین کے اندر آخرت کے باب میں ہوتا ہے۔ موقع کلام یہاں اشارہ کر رہا ہے کہ درحقیقت یہی یقین ہے جو دل اور عقل دونوں کا اصلی پاسبان ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کے ذہن و فکر کو کوئی چیز بھی ہرزہ گردی سے نہیں روک سکتی۔ وہ زندگی کو ایک نہایت سہل بازی سمجھتا ہے اور ہر داؤں پر اس کو لگا دینے کے لیے تیار رہتا ہے لیکن جن کے اندر آخرت کا یقین رچا بسا ہوتا ہے وہ ہر قدم احتیاط کے ساتھ اٹھاتے اور نہایت پھونک پھونک کر رکھتے ہیں، یہ احتیاط ان کو ہمیشہ جادۂ مستقیم پر استوار رکھتی ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمْ وَقُوْدُ النَّارِ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۱۰-۱۱

راہِ حق کی اصل رکاوٹ

"اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا" سے یہاں مراد، جیسا کہ آیت ۴ میں گزر چکا ہے، قرآن کے منکرین ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ مال و اولاد، جن کی محبت آج ان کے لیے ایک سورج سے زیادہ واضح حق کے قبول کرنے کی راہ میں رکاوٹ بنی ہوئی ہے، انھیں خدا کی پکڑ سے نہیں بچا سکیں گے۔ اس وجہ سے ان کی محبت میں اس خدا کو نہیں بھولنا چاہیے جس کے حقوق سب پر مقدم ہیں اور جس کی پکڑ بھی بے پناہ ہے۔ مال و اولاد کا ذکر یہاں قبولِ حق کی راہ کے اصل حجاب کی حیثیت سے ہوا ہے۔ آگے آیت ۱۴ میں ان کا ذکر تفصیل کے ساتھ آ رہا ہے۔ درحقیقت انھی کی محبت ہے جو انسان کے لیے قبولِ حق میں رکاوٹ بنتی ہے لیکن انسان اصل حقیقت کے اعتراف سے گریز کرتا ہے اور اپنے اغراض کے لیے کچھ ایسے بہانے تلاش کرتا ہے جو اس کی اصل بیماری پر پردہ ڈال سکیں۔ قرآن نے یہ ان لوگوں کی اصلی اندرونی بیماری سے پردہ اٹھایا ہے کہ یہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہے جو انھیں قرآن کی پیش کردہ سچائیوں کے آگے جھکنے سے روک رہی ہے لیکن وہ اس کو چھپانے کے لیے متشابہات کے اندر سے کچھ اعتراضات و شبہات پیدا کرنے کی

کوشش کرتے ہیں تاکہ ان کی دنیا پرستی بے نقاب نہ ہونے پائے۔ انسان کی یہ عام کمزوری ہے کہ وہ ایک حقیقت سے گریز تو اختیار کرتا ہے اپنے نفس کی کسی کمزوری کے سبب سے لیکن نمائش کچھ ایسی کرتا ہے جس سے مخاطب پر یہ اثر پڑے کہ فی الواقع اس کے اس گریز کے لیے کچھ وجوہ و اسباب اور کچھ اعتراضات و شبہات ہیں۔

اصل بیماری پر پردہ ڈالنے کی کوشش

اس کے بعد فرمایا کہ ان کی یہ روش بعینہٖ وہی روش ہے جو اس سے پہلے فرعون اور اس کی قوم نے اور خدا کے رسولوں کو جھٹلانے والی دوسری قوموں نے اختیار کی۔ انھوں نے بھی جان بوجھ کر محض دنیا کی محبت میں، خدا کی نشانیوں اور اس کی آیتوں کو جھٹلایا اور ظاہر یہ کرنے کی کوشش کی کہ گویا وہ نبی کو کوئی کاہن یا جادوگر اور اس کی پیش کردہ نشانیوں کو کوئی سحر و شعبدہ خیال کر رہے ہیں اس وجہ سے ان کو قبول نہیں کر رہے ہیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا اور جب پکڑ لیا تو پھر کوئی نہیں تھا جو خدا کی پکڑ سے ان کو بچا سکے۔

'شدید العقاب' کا مفہوم

'شَدِیْدُ الْعِقَابِ' کے لفظ میں دو مفہوم موجود ہیں۔ ایک تو یہ کہ خدا کی طرف سے انسان کو جو سزا بھی ملتی ہے وہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا ردِّ عمل ہوتی ہے، دوسرا یہ کہ جس طرح خدا کے قوانین طبیعی کے نتائج بے لاگ اور لازمی ہیں اسی طرح خدا کے اخلاقی قوانین کے نتائج بھی بے لاگ اور لازمی ہیں جب ان کے ظہور کا مرحلہ آئے گا تو وہ اس طرح بے لاگ لپیٹ اور ایسی قطعیت اور قوت کے ساتھ ظاہر ہوں گے کہ نہ کوئی ان سے بچ سکے گا اور نہ کوئی ان سے بچا سکے گا۔

قُلْ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَتُغْلَبُوْنَ وَتُحْشَرُوْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ (۱۲)

منکرینِ قرآن کو عذاب کی دھمکی

اب یہ صاف صاف قرآن کے تمام منکرین کو دھمکی ہے کہ تم قرآن کے خلاف یہ سازشیں جو کر رہے ہو، کامیاب ہونے والی نہیں ہیں، تم قرآن کے حاملین کے ہاتھوں شکست اٹھاؤ گے اور تمھارے یہ اسباب و وسائل جن پر تمھیں بڑا ناز ہے اور تعداد کی یہ کثرت جس پر تمھیں بڑا بھروسا ہے، یہ چیزیں ذرا بھی کام آنے والی ثابت نہیں ہوں گی۔ تم دنیا میں بھی مغلوب ہو گے اور آخرت میں بھی جہنم کی طرف ہانکے جاؤ گے اور اس جہنم کو کوئی سہل چیز نہ خیال کرو، یہ نہایت بُرا ٹھکانا ہے۔ اس تنبیہ کی ضرورت اس وجہ سے تھی کہ جو چیز انسان نے دیکھی نہ ہو اوّل تو اس کا صحیح صحیح اندازہ ہی نہیں کر پاتا اور اگر کسی حد تک اندازہ کرتا بھی ہے تو اپنی غفلت سرشتی کے سبب سے اس کو ملحوظ رکھنے میں سہل انگار اور بے پروا ہو جاتا ہے۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰیَةٌ فِیْ فِئَتَیْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ یَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَیْهِمْ رَاْیَ الْعَیْنِ ؕ وَاللّٰهُ یُؤَیِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِی الْاَبْصَارِ (۱۳)

عبرت حاصل کرنے کی دعوت

یہ اوپر والے دعوے کی ایک دلیل ایک ایسے واقعے سے پیش کی گئی ہے جس پر ابھی زیادہ زمانہ نہیں گزرا تھا۔ اشارہ بدر کے واقعے کی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے حاملین اور اس کے مخالفین

میں اس وقت جو کشمکش برپا ہے اس میں بالآخر شکست مخالفین ہی کو ہوگی۔ اس پیشین گوئی کی صداقت کی ایک نشانی اس معرکے میں موجود ہے جو قریش اور مسلمانوں کے درمیان پیش آچکا ہے۔ اس معرکے میں ایک گروہ اللہ کے کلمہ کو بلند کرنے کے لیے اٹھا تھا اور دوسرا، جو کفار کا تھا، شیطان کا کلمہ بلند کرنے کے لیے۔ ہر چند کفار کی تعداد ہزار سے متجاوز تھی اور مسلمان کل تین سو تیرہ تھے لیکن جب مقابلے کی نوبت آئی تو کفار نے کھلی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھا یہ بات اللہ تعالیٰ کی خاص تائید و نصرت کی وجہ سے ہوئی اور فتح و شکست کا اصلی تعلق تعداد کی کثرت و قلت سے نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی تائید و نصرت ہی سے ہے اور یہ تائید و نصرت ان کو حاصل ہوتی ہے جو اس کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اٹھتے ہیں۔ جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں وہ اس واقعے میں مستقبل کا نقشہ دیکھ سکتے ہیں کہ حق و باطل کی یہ آویزش بالآخر کس فیصلے پر ختم ہونے والی ہے۔

غزوۂ بدر میں کفار کے لیے نشانی

بدر کے واقعہ میں کفار کے ان تمام گروہوں کے لیے غلبۂ حق کی نشانی موجود تھی جو اس وقت قرآن اور اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اس وقت یہود، نصاریٰ اور قریش تین جماعتیں براہِ راست اسلام کی مخالفت کر رہی تھیں، اب دیکھیے کہ ان تینوں جماعتوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کس طرح بدر کے معرکے کو ایک نشانی بنایا۔

یہود کے لیے نشانی

جہاں تک یہود کا تعلق ہے سورۂ بقرہ میں ہم، طالوت و جالوت کی جنگ کے سلسلہ میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ جنگ اپنے مقصد، اپنی خصوصیات، اپنے نقشہ اور طالوت کی فوج کی تعداد کے لحاظ سے بالکل جنگ بدر کا آئینہ تھی۔ جس طرح مسلمان اپنے گھروں سے نکالے اور اپنے قبلہ سے محروم کیے گئے تھے اسی طرح بنی اسرائیل بھی اپنے گھروں سے بے دخل اور اپنے قبلہ ــــ تابوت ــــ سے محروم کیے گئے تھے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تین سو تیرہ آدمی تھے اسی طرح طالوت کے ساتھ بھی، جیسا کہ بنی اسرائیل کی روایات سے معلوم ہوتا ہے، اتنے ہی آدمی تھے، جس طرح نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے معرکہ سے پہلے اپنی فوج کے حوصلے کا امتحان لیا، اسی طرح ایک خاص طریقے پر طالوت نے بھی اپنے ساتھیوں کے عزم و نظم کی جانچ کی، پھر جس طرح اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جنگ میں اپنی تائید و نصرت سے نوازا کہ نہایت ناموافق اور نامساعد حالات میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی اور قریش کے بڑے بڑے لیڈر مارے گئے اسی طرح طالوت کی اور ان کے ساتھیوں کی بھی اللہ تعالیٰ نے مدد فرمائی اور ان کے ساتھیوں کی قلیل تعداد دشمنوں کی نہایت بھاری تعداد پر غالب رہی اور فلسطینیوں کا مشہور سپہ سالار حضرت داؤدؑ کی فلاخن سے ڈھیر ہو کر رہ گیا۔ ان دونوں جنگوں کی یہ حیرت انگیز مشابہت یہود پر بالکل واضح تھی۔ ایک کا سارا نقشہ اپنے صحیفوں میں دیکھ چکے تھے اور دوسری کا سارا ماجرا انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اس وجہ سے ان کے لیے یہ اندازہ کر لینا کچھ مشکل نہیں تھا کہ بدر کے میدان میں ہتھیاروں کی لڑائی نہیں تھی بلکہ حق و باطل کی

جنگ تھی اور انسانوں اور انسانوں کی آویزش نہیں بلکہ فرشتوں اور شیطانوں کی جنگ تھی۔ چنانچہ قرآن میں، جیسا کہ سورۂ انفال کی تفسیر میں ہم وضاحت کریں گے، اس بات کا اشارہ موجود ہے کہ یہود پر یہ حقیقت پوری طرح آشکارا تھی لیکن اس کے باوجود انھوں نے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم کی اس نشانی کی کوئی قدر نہیں کی اور برابر اسلام کی مخالفت ہی کرتے رہے۔

نصاریٰ کے لیے نشانی

اسی طرح نصاریٰ کے لیے بھی اس جنگ میں بہت بڑی نشانی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی موجود تھی۔ یوحنا کے مکاشفات میں یہ مکاشفہ موجود ہے کہ نبی موعود (خاتم النبیین، صلی اللہ علیہ وسلم) جب ظاہر ہوں گے تو وہ حق کی طاقت کے ساتھ جہاد کریں گے اور ان کے جلو میں کروبیوں کا لشکر ہوگا۔ یہ پیشینگوئی بدر کے موقع پر اس طرح ظاہر ہوئی کہ لوگوں نے اپنی آنکھوں سے ملائکہ کو کفار سے لڑتے دیکھا۔ اس نشانی کے بعد بھی اگر نصاریٰ متشابہات کے چکروں ہی میں پھنسے رہے اعترافِ حق کی سعادت انھیں حاصل نہیں ہوئی تو اس کو ان کی بدبختی کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔

قریش کے لیے نشانی

قریش کے لیے تو یہ جنگ ان کے اپنے مطالبے کے لحاظ سے بھی قرآن اور اسلام کی حقانیت کی ایک ناقابلِ تردید شہادت تھی۔ انھوں نے خود نہایت آشکارا طور پر اس جنگ کو حق و باطل کے درمیان امتیاز کی ایک کسوٹی قرار دیا تھا۔ اُن کا اپنا اعلان یہ تھا کہ اس جنگ میں جس کی جیت ہوگی وہ حق پر سمجھا جائے گا اور جس کو شکست ہوگی وہ باطل پر۔ ابوجہل نے عین میدانِ جنگ میں یہ دعا کی تھی کہ اَللّٰھُمَّ اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ (اے اللہ فریقین میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا ہے کل تو اس کو کچل دیجیو!) اس جنگ کے متعلق قرآن نے بھی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں پیشین گوئیاں فرمائی تھیں جو حرف بحرف پوری ہوئیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تو قریش کے خاص خاص لیڈروں کے قتل ہونے کی جگہیں تک متعین کر دی تھیں اور جنگ کے خاتمہ پر لوگوں نے دیکھا کہ حضورؐ کی ہر بات سچی ثابت ہوئی۔ چنانچہ انھی وجوہ سے قرآن نے غزوۂ بدر کو فرقان سے تعبیر فرمایا جس کے معنی یہ ہیں کہ اس نے حق و باطل کے درمیان ایک ایسا امتیاز قائم کر دیا جس سے اسلام کے موافقین کو اپنے برحق ہونے کی دلیل مل گئی اور اس کے مخالفین پر اللہ کی حجت پوری ہو گئی۔

حذف کا ایک اسلوب

آیت میں اہل ایمان کے گروہ کی صفت یہ بیان کی ہے کہ 'یہ اللہ کی راہ میں جنگ کر رہا تھا' لیکن کفار کے متعلق اس امر کی تصریح نہیں ہے کہ ان کی جنگ کس کی راہ میں تھی۔ اس تصریح کے نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان کا یہ معروف اسلوب قرآن میں بہت استعمال ہوا ہے کہ دو مقابل باتوں میں سے بخیالِ اختصار ایک مقابل کو حذف کر دیتے ہیں اس لیے کہ مذکور خود محذوف کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ یہاں اس اسلوب کے بموجب پوری بات اگر کھول دی جائے تو یوں ہوگی، فِئَۃٌ مُّؤْمِنَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَاُخْرٰی کَافِرَۃٌ تُقَاتِلُ فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ، فقرے کے پہلے حصے میں سے لفظ 'مومنۃ' کو حذف کر دیا اور

دوسرے میں سے فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کو اس لیے کہ دوسرے میں کَافِرَۃٌ کی صفت پہلے میں مُؤْمِنَۃٌ کا پتہ دے رہی ہے اور پہلے میں فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ کا حوالہ دوسرے میں فِیْ سَبِیْلِ الطَّاغُوْتِ کی ضرورت کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ حذف کا یہ اسلوب قرآن مجید میں بہت استعمال ہوا ہے جو واضح نہ ہو تو کلام کا اصلی زور سمجھ میں نہیں آتا۔ یہ ایجاز کی ایک شاخ ہے اور ایجاز بلاغت کی جان ہے۔

کس نے کس کو دگنا دیکھا

یَرَوْنَھُمْ مِّثْلَیْھِمْ میں یَرَوْنَھُمْ کی قرأت نافع نے تَرَوْنَھُمْ کی ہے لیکن یہ قرأت ہمارے نزدیک بطور تفسیر ہے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ یہ فعل مخاطبین یعنی کفار کے لیے ہے یعنی اے کافرو! تمھارا حال یہ تھا کہ تم مسلمانوں کو اپنے سے دگنا دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی اس تفسیر سے یہ حقیقت واضح فرمائی کہ حریف کو اپنے سے دگنا دیکھنے کا معاملہ مسلمانوں کو نہیں پیش آیا بلکہ کفار کو پیش آیا۔ نافع کی یہ تاویل بہت صحیح معلوم ہوتی ہے اس لیے کہ آیت میں اس بات کی صاف تصریح ہے کہ اس چیز کو اللہ تعالیٰ نے کفار کے لیے ایک آیت (نشانی) بنایا اور اس بات کی بھی خاص طور پر تصریح فرمائی کہ انھوں نے اس نشانی کو سر کی آنکھوں سے دیکھا۔ اگر واقعہ اس کے برعکس ہوتا، مسلمانوں نے کفار کو اپنے سے دگنا دیکھا ہوتا تو اس میں کفار کے لیے کیا نشانی تھی اور ان کو مخاطب کر کے اس نشانی کا ذکر کیوں کیا جاتا؟

ایک سوال کا جواب

ایک سوال ممکن ہے بعض لوگوں کے ذہن میں یہاں پیدا ہو۔ وہ یہ کہ سورہ انفال میں جہاں غزوۂ بدر کا واقعہ بیان ہوا ہے وہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ کفار بھی مسلمانوں کی نظر میں کم کر کے دکھائے گئے تھے اور مسلمان بھی کفار کی نگاہوں میں کم دکھائے گئے تھے۔ یہ چیز آیت کی مذکورہ بالا تاویل کے خلاف پڑتی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ یہ کم دکھانے اور زیادہ دکھانے کا معاملہ دو مختلف مرحلوں میں دو مختلف شکلوں میں ظاہر ہوا ہے۔ میدانِ جنگ میں اترنے سے پہلے تو بلاشبہ یہی صورت رہی کہ مسلمانوں نے بھی کفار کی تعداد معمولی محسوس کی اور کفار نے بھی مسلمانوں کو نہایت حقیر پوزیشن میں محسوس کیا لیکن میدانِ جنگ میں عملاً اتر جانے اور جنگ کے بالفعل شروع ہو جانے کے بعد دفعتہً صورتِ حال بدل گئی۔ اب جو کفار نے میدانِ جنگ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ نقشہ ہی اور ہے، فرشتوں کی شرکت سے مسلمانوں کی فوج کو اتنی فوقیت حاصل ہو گئی کہ وہ کفار کی نگاہوں میں ان سے دگنی نظر آنے لگی۔ قرآن کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دو مختلف مرحلوں میں ظاہر ہونا ایک خدا ساز بات تھی اور مقصود اس سے یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کو ایک دوسرے سے ٹکرائے اور حق کی امداد کے لیے اپنی غیبی تائید و نصرت ظاہر فرما کر حق کے مخالفوں پر اپنی حجت تمام کرے۔ چنانچہ اس حکمت کے تحت اس نے ابتدائی مرحلے میں مسلمانوں کی نگاہوں میں کفار کو اور کفار کی نگاہوں میں مسلمانوں کو کم کر دکھایا تاکہ ان میں کوئی فریق بھی ایک دوسرے سے ٹکر لینے سے خوف نہ کھائے۔ لیکن جب دونوں میں ٹکر ہو گئی اور میدان جنگ گرم ہو گیا تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ کے ذریعے سے مسلمانوں کی مدد فرمائی اور کفار میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ کر بالکل مرعوب ہو گئے۔

ہم یہاں سورۂ انفال کی متعلق آیتیں نقل کیے دیتے ہیں تاکہ دونوں موقعوں کا فرق اور دونوں کی حکمت و مصلحت سامنے آجائے۔ ارشاد ہوا ہے۔

إِذْ أَنتُم بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا	اور یاد کرو جب تم وادی کے ورلے کنارے پر تھے
وَهُم بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَالرَّكْبُ	اور وہ پرلے سرے پر تھے اور قافلہ تم سے نیچے تھا
أَسْفَلَ مِنكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدتُّمْ لَاخْتَلَفْتُمْ	اور اگر تم ایک دوسرے کو الٹی میٹم دے کر نکلتے تو میعاد
فِي الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِن لِّيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا	میں ضرور اختلاف کرتے لیکن اللہ نے اس کا سامان کیا
كَانَ مَفْعُولًا ۖ لِّيَهْلِكَ مَنْ هَلَكَ	تاکہ ایسے معاملے کا فیصلہ فرمائے جس کا فیصلہ ہونا طے
عَن بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَن	ہو چکا تھا۔ تاکہ جس کو ہلاکت کی راہ اختیار کرنی ہے وہ
بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝	یہ راہ اتمامِ حجت کے بعد اختیار کرے اور جسے زندگی کی
إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ	راہ اختیار کرنی ہے وہ بھی دلیل کے ساتھ یہ راہ اپنائے۔
قَلِيلًا ۖ وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا	بے شک اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ خیال کرو
لَّفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي	جب کہ اللہ تمھیں ان کو دکھاتا ہے رویا میں قلیل التعداد
الْأَمْرِ وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ	اور اگر وہ ان کو کثیر التعداد دکھاتا تو تم ہمت ہار بیٹھتے
إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝	اور اس امر میں اختلاف کرتے۔ لیکن اللہ نے تمھیں اس
وَإِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ	سے بچایا۔ وہ سینوں کے بھیدوں کو جاننے والا ہے اور
فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ	خیال کرو جب کہ وہ تمھیں ان کو دکھاتا ہے، اس وقت
فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا	جب کہ تم آمنے سامنے ہوئے، تمھاری نگاہوں میں تھوڑا
كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ	اور تم کو دکھاتا ہے ان کی نگاہوں میں تھوڑا تاکہ ایک
تُرْجَعُ الْأُمُورُ ۝	ایسے معاملے کا فیصلہ کر دے جس کا فیصلہ کرنا طے ہو
(۴۲ - ۴۴ - انفال)	چکا ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کی طرف لوٹتے ہیں۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ آیت زیر بحث اور آیاتِ انفال میں موقع و محل کا فرق ہے۔ انفال میں جس موقع کا ذکر ہے وہ، جیسا کہ ہم نے ذکر کیا، جنگ شروع ہونے سے پہلے کا ہے۔ اور آیت زیر بحث میں جنگ شروع ہو جانے کے بعد کا جب تائید الٰہی ملائکہ کی کمک کی صورت میں ظاہر ہو گئی ہے۔ اس طرح ان دونوں آیتوں میں پوری پوری موافقت ہے۔ یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ انفال میں بھی یہ اشارہ موجود ہے کہ جنگ شروع ہو جانے کے بعد کفار کو میدانِ جنگ کا نقشہ کچھ اور ہی نظر آیا اور اس مشاہدہ نے ان کے حوصلے پست کر دیے۔ ان اشارات کی تفصیل اپنے مقام پر آئے گی۔ وہیں ہم یہ بھی واضح کریں گے کہ یہود اگرچہ در پردہ قریش کو مسلمانوں پر چڑھا لانے کی سازش میں شریک رہے لیکن بدر کا نقشہ دیکھ کر انھوں نے بھی ہمت

چھوڑ دی۔ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تائید و نصرت سے جس کو چاہے نواز سکتا ہے، کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور جس کو وہ اپنی تائید و نصرت سے نوازے اس کے لیے کثرت و قلت کا سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو قطرے کو دریا اور ذرے کو آفتاب بنا دے۔ کتنے کمزور و ناتواں گروہوں کو اس نے دل بادل فوجوں پر فتح عطا فرمائی ہے۔ فتح و شکست کا اصلی سررشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔

عبرت کا مفہوم

اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ، عبرت کے معنی ہیں ایک حقیقت سے دوسری حقیقت تک عبور کر جانا۔ ایک صاحب بصیرت اور ایک بلید میں سب سے بڑا فرق یہی ہے کہ ایک اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھتا لیکن دوسرے کے لیے ایک معمولی سی نشانی، ایک ادنیٰ سی تنبیہ اور ایک سرسری سا اشارہ حقائق کا ایک دفتر کھول دیتا ہے۔ ایک دروازہ اس کے لیے کھل جائے تو دوسرے دروازے کھولنے کے لیے کلید ہاتھ آجاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو قرآن "اولوالابصار" کہتا ہے کیونکہ ان کی آنکھوں میں بصارت کے ساتھ بصیرت کا نور بھی ہوتا ہے جو جزو میں کل اور قطرہ میں دجلہ کے مشاہدہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَ الْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۭ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (۱۴)

تزئین کی حقیقت

شہوات کا لفظ یہاں مشتہیات یعنی مرغوبات کے معنی میں ہے۔ مال و اولاد اور زن و فرزندان چیزوں میں سے ہیں جو انسان کو بالطبع مرغوب بھی ہیں اور ان کو مرغوب ہونا چاہیے بھی اس لیے کہ یہ چیزیں اس کے ذاتی و نوعی بقا کے لوازم میں سے ہیں لیکن یہاں مجرد ان کی رغبت زیر بحث نہیں ہے بلکہ ان کی تزئین کا ذکر ہے۔ "تزئین" کا مفہوم یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح آنکھوں میں کھُب جائے کہ آدمی اس کے اثر سے ہر چیز اسی کے رنگ میں دیکھنے لگ جائے۔ یہاں تک کہ اس سے الگ ہو کر اس کے لیے کسی چیز کو دیکھنا ممکن ہی نہ رہ جائے۔ وہ ہر چیز کو تولنے اور پرکھنے کے لیے اسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دے لے۔ کسی چیز کی رغبت کا اس درجہ غلبہ ظاہر ہے فاطر فطرت کے منشا کے خلاف ہے۔ اسی سے زندگی میں وہ بے اعتدالیاں ظہور میں آتی ہیں جو انسان کو فطرت اور شریعت کے جادۂ مستقیم سے ہٹا دیتی ہیں۔ یہ ایک بیماری کی حالت ہے جو بے بصیرتی اور حدود الٰہی کے عدم احترام یا بالفاظ دیگر عدم تقویٰ سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں اصل دخل نفس اور شیطان کا ہوتا ہے۔ نفس اپنی چاہتوں میں فطری حدود سے آگے نکل جاتا ہے، پھر شیطان ان چاہتوں پر ایسا دلفریب ملمع کر دیتا ہے کہ آدمی کی نظر ان سے ہٹ کر کسی اور طرف کا رخ ہی نہیں کرتی۔ قرآن نے اسی وجہ سے اس تزئین کو دوسرے مقامات میں شیطانوں کی طرف منسوب کیا ہے۔

قنطار اور مقنطرہ کا مفہوم

"قِنْطَار" کے معنی مال کثیر کے ہیں۔ اس کے ساتھ "مُقَنْطَرَة" کی صفت اسی طرح استعمال ہوتی ہے جس

طرح عربی میں 'لیل الیل' یا 'ظل ظلیل' وغیرہ کی ترکیبیں استعمال ہوتی ہیں۔

'مسومۃ' کا مفہوم

'مسومۃ' سومۃ سے ہے جس کے معنی علامت کے ہیں، 'مسومۃ' کے معنی ہوں گے، نشان زدہ چونکہ اصیل اور نفیس گھوڑوں پر بالعموم نشان لگایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ لفظ اصالت اور عمدگی کی تعبیر کے لیے معروف ہو گیا۔

'الناس' سے ایک خاص گروہ مراد ہے

آیت میں 'الناس' کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے ایک خاص گروہ ہے۔ یہ اسی طرح کا استعمال ہے جس طرح قرآن میں 'انسان' کا لفظ استعمال ہوتا ہے اور مقصود اس سے مخصوص وہ گروہ ہوتا ہے جس کے حالات اس مقام میں زیر بحث ہوتے ہیں۔ یہاں سیاق و سباق دلیل ہے کہ وہ لوگ مراد ہیں جو بصیرت اور تقویٰ سے عاری ہیں اس وجہ سے دنیا کی مرغوبات پر ٹوٹے پڑ رہے ہیں اور قرآن جن اعلیٰ اقدار کی طرف توجہ دلا رہا ہے ان کی طرف وہ آنکھ ہی نہیں اٹھاتے۔

مرغوبات نفس

مرغوبات نفس کے بیان میں ایک خاص ترتیب ملحوظ ہے جو نگاہ میں رکھنے کی ہے۔ پہلے اہل و عیال کا ذکر کیا ہے اس لیے کہ محبت کے لحاظ سے سب سے اونچا مقام انھی کا ہے، دوسری چیزوں کی محبت اصلاً ان کے تابع ہے بلکہ زیادہ تر انھی کے لیے ہے۔ اس کے بعد مال کا ذکر ہے اور مال میں سونے کا ذکر اس کی گراں قیمتی کی وجہ سے دوسرے نقود پر مقدم ہے۔ پھر سروسامان میں سب سے پہلے گھوڑوں کا ذکر ہے اس لیے کہ اہل عرب زینت، فخر اور دفاع، تینوں کے نقطۂ نظر سے گھوڑے کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے۔ اس کے بعد چوپایوں کا ذکر ہے اس لیے کہ تمدن کے ظہور سے پہلے بدویت کے دور میں معاش کا انحصار بیشتر انھی پر تھا۔ آخر میں کھیتی اور باغ کا ذکر ہے اس لیے کہ ان کی اہمیت تمدن کے دور میں داخل ہونے کے بعد شروع ہوئی ہے جب انسان نے شہروں اور دیہاتوں کی رہائش اختیار کی ہے۔

'ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا' کے چھوٹے سے فقرے میں معانی کا ایک جہان پوشیدہ ہے۔ اس میں اس دنیا کی ناپائداری کی طرف بھی اشارہ ہے، ان چیزوں کی بے حقیقی کی طرف بھی، اور ایک عالم باقی کے مقابل میں اس جہانِ فانی کی ناپائدار لذتوں پر ریجھنے کی حماقت کی طرف بھی۔

نظم کے پہلو سے یہ آیت گویا اوپر کی آیت ۱۰ کے مضمون کی تشریح ہے۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی گئی ہے کہ اصل چیز جو لوگوں کو قرآن کی مخالفت پر اکسا رہی ہے وہ ہے تو اس دنیا کی محبت اور اس کی مرغوبات کی طمع لیکن اس بیماری کو چھپائے رکھنے کے لیے یہ طرح طرح کے شبہات و شکوک اور اعتراضات ایجاد کرتے اور پھیلاتے ہیں تاکہ اس طرح اپنے اس گریز کے لیے جواز پیدا کریں۔

قُلْ اَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا وَاَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ بَصِيْرٌ بِالْعِبَادِ ۝ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا
ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ۝
(۱۵-۱۷)

مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت

یہ مخاطبین کو زاویۂ نگاہ بدلنے کی دعوت ہے اس لیے کہ اس کے بدلے بغیر قرآنی اقدار کی طلب دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ قرآن کے نزدیک انسان کی اصل بیماری اس کی تنگ نظری اور پست حوصلگی ہے، وہ اس دنیا کی چند روزہ زندگی کو کل زندگی سمجھ بیٹھا ہے، جس کے سبب سے اس کی ساری بھاگ دوڑ اسی دنیا کی مرغوبات و مطلوبات تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے جو ابدی اور لازوال ہے۔ اگر انسان اس زندگی کی طلب میں تقویٰ کی روش اختیار کرے یعنی اس دنیا سے متعلق خدا نے جو حدود حرام و حلال ٹھہرا دیے ہیں ان کی پابندی کرے تو اسے آخرت کی ابدی زندگی میں وہ نعمتیں ملیں گی جن کا آج وہ تصور بھی نہیں کر سکتا۔

ازواج مطہرہ

نعمتوں میں 'ازواج مطہرۃ' کا ذکر خاص طور پر فرمایا ہے۔ اس لفظ پر بقرہ کی آیت ۲۵ کے تحت ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں خاص طور پر جنت کی نعمتوں میں اس کا ذکر اس وجہ سے ہوا کہ اوپر آیت ۱۴ میں واضح ہو چکا ہے کہ دنیا کے مرغوبات میں سرفہرست جس چیز کو جگہ حاصل ہے وہ اہل و عیال ہیں اس وجہ سے جنت کی نعمتوں میں بھی ان کا ذکر خاص طور پر فرمایا۔

رضوان

'رضوان' کے معنی تو خدا کی خوشنودی اور رضامندی کے ہیں، لیکن قرآن میں یہ لفظ بالعموم جنت کی نعمتوں کی ایک جامع تعبیر کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ جب اس کا ذکر ہو گیا تو گویا ہر نعمت کا ذکر ہو گیا۔ اس کا بھی جس کے لیے تعبیر کا کوئی جامہ موجود ہے اور اس کا بھی جو گمان و خیال اور قیاس و وہم ہر چیز سے بالاتر ہے۔

'بصیر بالعباد' میں دھمکی اور تسلی دونوں ہے

'وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ' دھمکی اور تسلی دونوں ہی قسم کے مواقع پر استعمال ہو سکتا ہے۔ یہاں موقع دلیل ہے کہ تسلی کے محل میں ہے۔ یعنی جو لوگ آخرت کے لیے اس دنیا کی زندگی میں تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی تمام قربانیوں اور مشقتوں سے باخبر ہے۔ ان کو ان تمام قربانیوں کا پورا پورا صلہ دے گا، ان کی کوئی قربانی بھی ضائع نہیں جائے گی۔

اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ الاٰيۃ لِلَّذِيْنَ اتَّقَوْا سے بدل ہے۔ یہ تفصیل ان لوگوں کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو قرآن کی اس دعوت کو قبول کر کے آخرت سے غافل کرنے والی مرغوبات سے دستکش ہو گئے اور اپنی پچھلی زندگی کی خود فراموشیوں سے تائب ہو کر ایمان و عمل صالح کی پاکیزہ زندگی میں آ گئے۔ ساتھ ہی اس میں ایک خاموش تبلیغ بھی ان لوگوں کے لیے ہے جو اس راہ پر آنے سے ہچکچا رہے تھے اور اپنی اس ہچکچاہٹ کے لیے مختلف قسم کے حیلے بہانے پیدا کر رہے تھے۔

حاملین قرآن کا کردار

اَلصّٰبِرِيْنَ الاٰيۃ۔ یہ دوسرا بدل ہے۔ اس سے ان اخلاقی اوصاف کی وضاحت ہو گئی ہے جن سے یہ پاکیزہ صفات گروہ متصف ہے اور اسی سے یہ بات بھی واضح ہو رہی ہے کہ وہ اخلاق و کردار کن اجزا سے مرکب ہے جو قرآن کا حامل ہونے کے لیے ضروری ہے۔ یہ آیت گویا اس کے بالکل ضد اخلاق و کردار پیش کر رہی ہے جو اوپر 'زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ' والی آیت میں نمایاں ہوا۔

یہاں صرف پانچ صفات بیان ہوئی ہیں۔ صبر، صدق، قنوت، انفاق، استغفار۔

'صبر' کی حقیقت

صبر کی حقیقت نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں حق پر جزم و استقامت ہے۔ غربت، بیماری، مصیبت، مخالفت، جنگ، غرض جس قسم کے بھی حالات سے آدمی کو دوچار ہونا پڑے عزم و ہمت کے ساتھ ان کو برداشت کرے، ان کا مقابلہ کرے، ان سے عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے اور اپنے امکان کے حد تک موقفِ حق پر جما رہے۔ دل کو مایوسی اور گھبراہٹ سے، زبان کو شکوۂ تقدیر سے اور اپنی گردن کو کسی باطل کے آگے جھکنے سے بچائے۔ دین کا بڑا حصہ اسی صبر پر قائم ہے۔ اگر آدمی کے اندر یہ وصف نہ ہو تو کوئی طمع، کوئی ترغیب، کوئی آزمائش بھی اس کو حق سے ہٹا کر باطل کے آگے سرنگوں کر دے سکتی ہے۔ جو شخص سچائی کے راستے پر چلنا چاہے اور اس پر چل کر استوار رہنے کا آرزومند ہو اسے سب سے پہلے اپنے اندر صبر کی صفت پیدا کرنی چاہیئے۔ مزاحمتوں کے مقابلے کے لیے (اور اس راہ میں ہر قدم پر مزاحمتوں سے مقابلہ ہے) اصلی ہتھیار بندے کے پاس یہی ہے۔ فلسفہ دین کے نقطۂ نظر سے دین نصف شکر ہے اور نصف صبر، لیکن عملی تجربہ گواہ ہے کہ آدمی میں صبر نہ ہو تو شکر کا حق بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ یہاں چونکہ خطاب ان لوگوں سے ہے جنھیں سچائی کی سب سے بڑی بلندی پر چڑھنے کی دعوت دی جا رہی ہے اس وجہ سے ان کے سامنے، جن لوگوں کا نمونہ پیش کیا گیا ہے ان کے کردار میں سب سے پہلے ان کے صبر ہی کے پہلو کو نمایاں کیا گیا ہے۔

'صدق' کی حقیقت

'صدق' کی اصل حقیقت کسی شے کا بالکل مطابق واقعہ ہونا ہے۔ اس کی روح پختگی اور ٹھوس پن ہے۔ نیزے کی گرہیں دیکھنے میں جیسی مضبوط ظاہر ہو رہی ہیں آزمائش سے بھی ویسی ہی مضبوط ثابت ہوں تو ایسے نیزے کو عربی میں صادق الکعوب کہیں گے۔ زبان، دل سے ہم آہنگ ہو، عمل اور قول میں مطابقت ہو، ظاہر اور باطن ہم رنگ ہوں، عقیدہ اور فعل دونوں ہم عناں ہوں، یہ باتیں صدق کے مظاہر میں سے ہیں اور انسانی زندگی کا سارا ظاہر و باطن انھی سے روشن ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کی ساری معنویت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہی چیز ہے جو انسان کو وہ پرِ پرواز عطا کرتی ہے جس سے وہ روحانی بلندیوں پر چڑھتا ہے اور اس سے اس کے صبر کو بھی سہارا ملتا ہے۔

'قنوت' کی حقیقت

"قنوت" کی اصل روح اللہ جل شانہٗ کے لیے تواضع و تذلل ہے۔ یہ چیز اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں کے شعور اور اس کی بے نہایت عظمتوں کے احساس کا قدرتی ثمرہ ہے۔ یہ نعمت کو شکر کا اور مصیبت کو صبر کا ذریعہ بناتی ہے اور ہر حالت میں بندے کو اللہ تعالیٰ ہی کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ اصلاً تو یہ عقل و دل کی فروتنی اور انکساری ہے لیکن جس طرح قلب کی ہر حالت کا عکس انسان کے ظاہر پر بھی نمایاں ہوتا ہے اسی طرح اس کا عکس بھی انسان کی وضع قطع، چال ڈھال، گفتار و کردار ہر چیز میں نمایاں ہوتا ہے۔ یہ اس غرور اور گھمنڈ کی ضد ہے جو نعمتوں کو اپنے استحقاق ذاتی کا ثمرہ سمجھنے کا نتیجہ ہوتا ہے اور اس تکبر اور بے صبرے پن کے بھی منافی ہے جو صبر و صدق کے فقدان سے پیدا ہوتا ہے۔

'انفاق' کی حقیقت

'انفاق' کے معنی واضح ہیں۔ یہ مرغوبات دنیا کی اس محبت کی ضد صفت ہے جس کا ذکر اوپر والی آیت میں ہوا۔ اگر مرغوباتِ دنیا کی محبت دل پر اس طرح چھا جائے کہ وہ خدا اور بندوں کے حقوق سے انسان کو روک دے تو یہی وہ چیز ہے جس کو قرآن نے 'زُیِّنَ لِلنَّاسِ' سے تعبیر کیا ہے۔ انفاق کی خصلت اس امر کی شہادت ہے کہ صاحبِ انفاق کی نظر میں اصلی قدر و قیمت دنیوی خزف ریزوں کی نہیں بلکہ آخرت کی ابدی زندگی اور اس کی لازوال نعمتوں کی ہے۔ برعکس اس کے جو شخص خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گریز کرتا ہے وہ اپنے عمل سے ثابت کرتا ہے کہ اس کی نگاہوں میں ساری قدر و قیمت بس اس فانی دنیا کی فانی لذتوں ہی کی ہے، آخرت کی زندگی کا اس کے ذہن میں سرے سے کوئی تصور ہی نہیں ہے۔

'استغفار' کی حقیقت

'استغفار' کے معنی ہیں اللہ تعالیٰ سے تضرع و زاری کہ وہ اپنے بندے کی کوتاہیوں، گناہوں اور جرموں پر پردہ ڈالے۔ یہ تضرع اس حیا اور خوف کا نتیجہ ہے جو بندے کے دل میں اپنے پروردگار کے بے پایاں احسانات و انعامات کے احساس اور اس کے عدل و انتقام کے تصور سے پیدا ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ 'وقت سحر' کی قید لگی ہوئی ہے جس سے اس حقیقت کی طرف اشارہ مقصود ہے کہ یہ وقت قبولیتِ استغفار کے لیے سب سے زیادہ موزوں، ریا کی آفتوں سے سب سے زیادہ محفوظ، دلجمعی اور آیاتِ الٰہی میں تفکر و تدبر کے لیے سب سے زیادہ سازگار ہے۔ قرآن اور حدیث دونوں ہی میں مختلف پہلوؤں سے اس کی وضاحت ہوئی ہے اور یہ رب کریم کا عظیم احسان ہے کہ اس نے استغفار کی ہدایت کے ساتھ ساتھ استغفار کی قبولیت کے لیے سب سے زیادہ سازگار وقت کا بھی خود ہی پتہ دے دیا۔

اس ٹکڑے پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو اس سے جہاں ایک طرف یہ بات واضح ہوتی ہے کہ کن صفات کے لوگ ہیں جو قرآن کے حامل ہو سکتے ہیں وہیں یہ بات بھی اس سے نکلی کہ وہ موانع کیا ہیں جو قرآن کے ان مخالفین اور قرآن کے درمیان حائل ہیں۔ معلوم ہوا کہ ان میں وہ صبر نہیں ہے جو نفس اور شیطان کی مزاحمتوں کے مقابل میں ان کو پابرجا رکھ سکے، وہ صدق نہیں ہے جو ان کے عقیدہ اور عمل، قول اور فعل، ظاہر اور باطن میں مطابقت پیدا کر سکے، وہ قنوت نہیں ہے جو سب سے بڑے صاحبِ حق کے آگے ان کی گردن اور ان کے دل دونوں کو جھکا دے، ابدی زندگی کا وہ شوق نہیں ہے جو انھیں آخرت کے لیے دنیا کو قربان کرنے پر ابھار سکے اور خدائے منعم و دیان کی نعمتوں اور نقمتوں کا وہ شعور و احساس نہیں ہے جو انھیں غفلت کے بستروں سے اٹھا کر مناجات سحر کے لیے ان کو ان کے رب کے حضور لا کھڑا کرے — اور ساتھ ہی اسلوبِ بیان نے ایک لطیف اشارہ اس بات کی طرف بھی کر دیا کہ آج جن لوگوں نے اس قرآن کو قبول کر لیا ہے اور اس کے پھیلانے میں اللہ کے رسول ؐ کا ساتھ دے رہے ہیں وہ ان صفات سے متصف ہیں اور ان صفات سے متصف ہونے ہی کے سبب سے وہ اس بارِ گراں کے اٹھانے کے اہل بن سکے ہیں۔

۴۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۸-۲۲

وہی اوپر والا مضمون ایک دوسری شاندار تمہید کے ساتھ ایک دوسرے پہلو سے بیان ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ، اس کے فرشتوں اور علم حقیقی کے تمام حاملین کی شہادت ابتدا سے یہی ہے کہ اللہ واحد کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا اور عزیز و حکیم ہے۔ اس نے بندوں کی ہدایت اور ان کو عدل و قسط پر قائم کرنے کے لیے جو دین عطا فرمایا وہ اسلام ہے، یہی دین اللہ کا حقیقی دین ہے، یہی دین اس نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے بھیجا لیکن یہود و نصاریٰ نے اپنی باہمی ضد م ضدا کے سبب سے دیدہ و دانستہ اس دین میں اختلافات برپا کیے اور اسلام کے بجائے یہودیت و نصرانیت کے الگ الگ بت کھڑے کر لیے۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا کہ اگر یہود و نصاریٰ تم سے اس دین حقیقی کے باب میں جھگڑنا چاہتے ہیں تو تم ان کی اس مخالفت کو ذرا خاطر میں نہ لاؤ بلکہ صاف صاف اہل کتاب کو بھی اور قریش کو بھی سنا دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اسلام کی راہ اختیار کر لی ہے، اب جس کا جی چاہے اپنی گمراہی پر اصرار رہے۔ تمہارے اوپر ذمہ داری صرف اس پیغام کو پہنچا دینے کی ہے، اس کے بعد معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ سب کے حالات سے اچھی طرح باخبر ہے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہ دے گا۔

آگے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے واسطے سے اہل کتاب کو یہ دھمکی دی ہے کہ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، جنھوں نے اللہ کے نبیوں کا خون ناحق بہایا ہے اور جو دین کے مصلحین و مجددین اور عدل و قسط کے علم برداروں کے درپے آزار و قتل رہے ہیں، اب ان کی عدالت کا وقت آگیا ہے، اب وہ خدا کی پکڑ سے نہیں بچ سکیں گے، ان کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت جائیں گے اور کوئی ان کا حامی و مددگار نہ بن سکے گا۔

اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۸-۲۲ شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ
النصف قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ۭ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۱۸﴾ اِنَّ
الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۣ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۭ وَمَنْ

يَكْفُرُ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ ﴿۱۹﴾ فَاِنْ حَآجُّوْكَ
فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا
الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ
وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰﴾ اِنَّ ع ۲ ۱۱ ۱۰
الَّذِيْنَ يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ
وَّيَقْتُلُوْنَ الَّذِيْنَ يَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ
بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۲۱﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي
الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۫ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۲۲﴾

ترجمۂ آیات ۱۸-۲۲

اللہ، فرشتوں اور اہلِ علم کی گواہی ہے کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عدل و قسط کا قائم رکھنے والا ہے، اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ غالب اور حکمت والا ہے۔ ۱۸

اللہ کا اصل دین اسلام ہے۔ اہلِ کتاب نے تو اس میں اختلاف علمِ حق کے آجانے کے بعد محض باہمی ضدم ضدا کے سبب سے کیا ہے۔ جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کریں گے تو وہ یاد رکھیں کہ اللہ بہت جلد حساب چکا دینے والا ہے۔ اگر وہ تم سے اس بارے میں جھگڑتے رہیں تو تم ان سے کہہ دو کہ میں نے اور میرے پیروؤں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کیا اور اہلِ کتاب اور امّیوں سے پوچھو کہ کیا تم بھی اسی طرح اسلام لاتے ہو؟ اگر وہ بھی اسی طرح اسلام لائے تو وہ راہ یاب ہوئے اور اگر وہ اعراض کریں تو تمھارے اوپر ذمہ داری صرف پہنچا دینے کی ہے، اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے۔ ۱۹-۲۰

جو لوگ اللہ کی آیات کا انکار کرتے رہے ہیں، نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں اور

ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو لوگوں میں سے عدل و قسط کی دعوت لے کر اٹھے تو ان کو ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت دونوں میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مدد کرنے والا نہ بنے گا۔ ۲۱-۲۲

۵۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ (۱۸)

توحید اور قسط کی شہادت کے تین پہلو

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت اور قائم بالقسط ہونے پر اپنی، اپنے فرشتوں اور اہل علم کی شہادت کا حوالہ دیا ہے۔ یہ شہادت تین مختلف پہلوؤں سے ہے۔

آفاق کی شہادت

ایک تو آفاق کی شہادت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس کائنات کے خالق نے اس کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی صاف شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں ہے۔ قرآن نے اس شہادت کو توحید کی دلیل کے عنوان سے اتنی تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس کے شواہد نقل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ پھر اسی نظام کائنات سے قرآن نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس کے ہر گوشے میں اس کائنات کے خالق نے ایک میزان رکھی ہے، مجال نہیں کہ کوئی شے اپنے معین محور و مدار سے ایک انچ بھی ادھر اُدھر ہو سکے۔ یہ اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا خالق و فاطر عدل و قسط کو پسند کرتا ہے، یہ نہیں چاہتا ہے کہ اس کی مخلوقات میں سے کوئی چیز اس عدل و قسط سے بال برابر بھی انحراف کرے۔ قرآن میں اس حقیقت کے شواہد بہت ہیں۔ ہم بخیال اختصار صرف ایک آیت بطور مثال نقل کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ۝ وَّالنَّجْمُ وَ	سورج اور چاند دونوں ایک حساب کے ساتھ گردش کرتے ہیں۔
الشَّجَرُ يَسْجُدَانِ ۝ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا	ستارے اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں۔ اس نے آسمان کو بلند
وَوَضَعَ الْمِيْزَانَ ۝ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ۝	کیا اور اس میں ایک میزان رکھی، کہ تم بھی میزان کے معاملے میں تجاوز
وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا	نہ کرو بلکہ وزن کو انصاف کے ساتھ قائم کرو، اور میزان میں کوئی
الْمِيْزَانَ ۝ (۵-۹ رحمان)	کمی نہ کرو۔

یعنی یہ کائنات اپنے وجود سے اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ اس کا خالق عدل و قسط کو پسند کرنے والا ہے اور اس کے سورج اور چاند، شجر و حجر، آسمان و زمین اپنی زبانِ حال سے ہر وقت یہ سبق دے

رہے ہیں کہ جس طرح وہ خدا کے مقرر کردہ پیمانے سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتے، ان کی ہر حرکت اس پیمانے سے نپی تلی ہوتی ہے اسی طرح انسان بھی اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں خدا کی میزان میں نپی تلی روش اختیار کرے، اس کے ٹھہرائے ہوئے حدود سے ذرا بھی تجاوز نہ کرے۔

تاریخ کی شہادت

اسی آفاقی شہادت کے ذیل میں قوموں کی تاریخ بھی آتی ہے۔ قرآن نے قوموں کی تاریخ بھی پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے بلکہ اس کا خالق و مالک اس کو ایک نظام عدل و قسط کے تحت چلا رہا ہے۔ اس کے اسٹیج پر یکے بعد دیگرے وہ مختلف قوموں کو بھیجتا ہے اور ان کا امتحان کرتا ہے کہ وہ خدا کے قانون عدل و قسط کے اندر اپنے اختیار اور اپنی قوتوں کو استعمال کرتی ہیں یا اس سے بغاوت اور سرکشی کی راہ اختیار کرتی ہیں۔ جب تک کوئی قوم خدا کے حدود کے اندر رہ کر اپنی صلاحیتوں کو استعمال کرتی ہے، وہ اس کو برومند کرتا اور پروان چڑھاتا ہے، جب وہ اس راہ سے ہٹ کر سرکشی کی راہ اختیار کر لیتی ہے تو ایک خاص حد تک مہلت دے چکنے کے بعد وہ اس کو فنا کر دیتا ہے اور دوسری قوم کو اس کی وارث بناتا ہے۔ قرآن نے اس سنت کو بڑی وضاحت کے ساتھ بیان فرمایا ہے۔

انفس کی شہادت

دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ وہ خود توحید کی اور اس کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دے رہی ہے۔ اس شہادت کے دلائل ہم اپنی اس کتاب میں بھی جگہ جگہ بیان کر رہے ہیں اور خاص اس موضوع پر ہم نے حقیقت شرک اور حقیقت توحید کے نام سے دو کتابیں بھی لکھی ہیں۔ تفصیل کے طالب ان کو پڑھیں۔ انسانی فطرت کی یہی توحید پسندی ہے جس کے سبب سے قرآن نے توحید کو دین فطرت قرار دیا ہے فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِیْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَیْهَا (اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا) اور یہی عدل پسندی ہے جس کی بنا پر جزا و سزا کے منکرین سے قرآن یہ سوال کرتا ہے۔ اَفَنَجْعَلُ الْمُسْلِمِیْنَ كَالْمُجْرِمِیْنَ مَا لَكُمْ كَیْفَ تَحْكُمُوْنَ (۳۴۔ ۳۵۔ قلم) کیا ہم فرمانبرداروں کو مجرموں کی طرح کر دیں گے، تمھیں کیا ہو گیا ہے، تم کیسا فیصلہ کرتے ہو؟)

وحی کی شہادت

تیسری شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی پسند ناپسند اور اپنے اوامر و نواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسول بھیجے اور ان سب پر اپنی توحید اور اپنے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی اور ان نبیوں اور رسولوں نے یہ شہادت اپنی اپنی امتوں کو پہنچائی۔ اس شہادت کے آثار و نشانات آج بھی ان امتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں لیکن انھوں نے ان آثار و روایات کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو ایسے نظریات و عقاید میں مبتلا کر لیا جو توحید کے بھی منافی ہیں اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کے بھی لیکن ان امتوں کی اس غلط روش کی وجہ سے وہ اپنی ان اعلیٰ صفات سے دستبردار نہیں ہو گیا ہے بلکہ وہ بدستور ان سے متصف ہے اور ہمیشہ متصف رہے گا۔ چنانچہ انھیں صفات کا یہ تقاضا ہے کہ اس نے قرآن کو، جیسا کہ اوپر کی تمہید میں گزرا، حق و باطل کے درمیان فرقان

بنا کر اتارا تاکہ حق و عدل کی صراطِ مستقیم پھر واضح ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے اور باطل پر جمے رہنے کے لیے کوئی عذر باقی نہ رہے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ خدا کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت کسی ایک ہی پہلو سے نہیں مل رہی ہے بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے، اس کی پیدا کی ہوئی فطرت اس پر گواہ ہے اور اس کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس حقیقت کی منادی کی ہے۔ اس آیت میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے تیس پاروں میں اس اجمال کی تفصیلات پھیلی ہوئی ہیں۔

ملائکہ کی شہادت

اللہ تعالیٰ نے اپنی شہادت کے ساتھ یہاں ملائکہ کی شہادت کا بھی حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک امر واقعی کا اظہار و بیان ہے۔ کائنات میں خدا کے ارادوں کے نفاذ کا ذریعہ اور خدا کے پیغمبروں تک اس کی وحی پہنچانے کا واسطہ ملائکہ ہی بنتے ہیں اس وجہ سے خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کے اس کی مخلوقات میں شاہدِ اول وہی ہیں۔ ان کی گواہی ایک امر واقعی ہونے سے قطع نظر اس پہلو سے بھی خاص طور پر بیان ہوئی کہ نادانوں نے ان کو خدا کا شریک اور شفاعتِ باطل کا واسطہ قرار دے کر توحید کی بھی نفی کی اور خدا کے قائم بالقسط ہونے کی بھی۔ اس لیے کہ جب تصور یہ ہو کہ سفارشِ حق کو باطل اور باطل کو حق بنا دے سکتی ہے تو پھر خدا قائم بالقسط کہاں رہا؟ فرشتوں کے متعلق اس غلط فہمی کو رفع کرنے کے لیے قرآن نے خود ان کی زبان سے بھی جگہ جگہ ان کے اعترافات کا حوالہ دیا ہے۔ ہم بخیالِ اختصار صرف ایک مثال نقل کرنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّاِنَّا لَنَحْنُ	اور ہم میں سے ہر ایک کے لیے بس ایک متعین مقام
الصَّآفُّوْنَ ۝ وَاِنَّا لَنَحْنُ	ہے اور ہم تو صفیں باندھ کر حاضر رہنے والے ہیں اور
الْمُسَبِّحُوْنَ ۝ (۱۶۴-۱۶۶- صافات)	ہم تو اس کی تسبیح کرنے والے ہیں۔

فرشتوں سے متعلق ایک تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں بضمن آیت ایمان ہم کر چکے ہیں۔

اولوالعلم کی شہادت

ملائکہ کے بعد اولوالعلم کی شہادت کا ذکر ہے۔ العلم قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس سے مراد وہ علمِ حقیقی ہوتا ہے جو نبیوں اور رسولوں کے ذریعہ سے دنیا کو ملا ہے۔ اس پر مفصل بحث ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں خدا کی توحید اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت دی ہے یہ مصلحین و مجددین کے گروہ کی طرف اشارہ ہے جو ہر دور میں پیدا ہوئے ہیں اور جنھوں نے اللہ کے دین کو بدعات اور آمیزشوں سے پاک کر کے عقاید کو توحیدِ خالص کی بنیاد پر اور شرائع و قوانین اور اعمال و اخلاق کو حق و عدل کی اساس پر استوار کرنے کی جدوجہد کی ہے۔ یہی لوگ ہیں جن کی طرف آگے کی آیت میں یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ کے لفظ سے اشارہ ہوا ہے اور جن کے متعلق فرمایا ہے کہ اہلِ کتاب ان کو قتل کرتے رہے ہیں۔

حکمتِ دین کا یہ نکتہ ملحوظ رہے کہ یہاں اللہ اور ملائکہ کے ساتھ حاملین علم کا حوالہ ہے اور توحید کے ساتھ عدل و قسط کا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نظروں میں اہلِ علم کا کیا مقام ہے اور خدائی شریعت کے نظام میں عدل و قسط کا کیا درجہ و مرتبہ ہے۔ علمِ حقیقی کے حاملین ملائکہ کے زمرہ سے نسبت رکھنے والے ہیں اور عدل و قسط کا درجہ صفاتِ الٰہی میں اتنا بلند و ارفع ہے کہ توحید کے بعد سب سے پہلے جس کا ذکر ہو سکتا ہے وہ یہی ہے۔

"قسط" کا مفہوم

"قَائِمًا بِالْقِسْطِ" ترکیب کے لحاظ سے ہمارے نزدیک "اَنَّہٗ" کی ضمیر سے حال پڑا ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ واحد و یکتا ہے، کوئی اس کا ساجھی نہیں، تمام اختیار و تصرف تنہا اسی کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس اختیار و تصرف کو ٹھیک ٹھیک عدل و قسط کے مطابق استعمال کر رہا ہے۔

"قسط" کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل، انصاف وغیرہ کے الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔ اس کا ضد ظلم، جور اور اس معنی کے دوسرے الفاظ ہیں۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار مظاہر و اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کیے ہوئے حدود و قیود کے اندر ہے، اس کو نقطۂ اعتدال یا بالفاظِ دیگر مرجع عدل و قسط سمجھیے۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطہ سے شوشے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جائے تو یہ بات عدل و قسط کے منافی ہوگی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل بدل جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم و جور سے تعبیر کریں گے، کسی گوشے میں بدصورتی اور بدہیئتی سے، اسی طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق و عدل سے تعبیر کریں گے، کسی محل میں حسن و جمال سے لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہوگی۔ وہ یہ کہ ایک شے اپنے اصل فطری مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

خالقِ کائنات چونکہ اس دنیا کا خالق و مالک ہے اس وجہ سے اس کو اس کا بگاڑ نہیں بلکہ بناؤ مطلوب ہے۔ اس کے نظامِ تکوینی کی اس نے اس طرح چول سے چول بٹھائی ہے کہ مجال نہیں کہ کہیں کوئی رخنہ پیدا ہو جائے اور اگر اس کی قدرت ہی کی کسی معجز نمائی سے کہیں کوئی رخنہ پیدا ہوتا نظر آتا ہے تو دفعتہً اسی کے کارفرما ہاتھ اس کو درست کرنے کے لیے نمودار ہو جاتے ہیں تاکہ جس توازن پر یہ کارخانہ قائم ہے اس میں کوئی خلل نہ پیدا ہونے پائے۔ اس کی یہی توازن پسندی ہماری زندگی کے اس دائرے کے لیے بھی ہے جس دائرے میں اس نے ہمیں محدود قسم کی آزادی دی ہے۔ جب ہم اپنے اختیار کو غلط استعمال کر کے اپنے اخلاق و عمل کے کسی گوشے میں فساد پیدا کر لیتے ہیں تو وہ ہمیں ڈھیل تو دیتا ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، اس کی عدل پسندی یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ ہمیں ہماری خواہشات کی پیروی کے لیے آزاد اور اس کے نتیجے میں اپنی خلق کو تاراج و پامال ہونے کے لیے چھوڑ دے بلکہ وہ اس ڈھیل پر گرفت

کرتا ہے اور ہمارے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کو از سرِ نو درست کر دیتا ہے اس لیے کہ وہ قائم بالقسط ہے۔

اس قیام بالقسط ہی کے لیے اس نے مکافاتِ عمل کا قانون رکھا ہے، اسی کے لیے اس نے انبیا و شرائع کے بھیجنے کا سلسلہ جاری کیا، اسی کے لیے اس نے یہ اہتمام فرمایا کہ جب شریعت میں تحریفات و بدعات سے فساد پیدا ہو جائے تو مجددین و مصلحین اس کی اصلاح و تجدید کے لیے سر دھڑ کی بازیاں لگائیں، اسی کی خاطر اس نے قوموں کے عروج و زوال کو ان کے اخلاقی عروج و زوال کے تابع کیا اور پھر سب سے بڑھ کر اس عدل و قسط ہی کے کامل ظہور کے لیے اس نے ایک ایسا دن مقرر کیا ہے جس میں اس کی میزانِ عدل نصب ہو گی اور وہ تول کر بتائے گی کہ کس کا کون سا عمل ترازو میں پورا ہے، کون سا نہیں، اور پھر اسی کے مطابق جزا و سزا ہو گی۔

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک ہی آیت میں دو مرتبہ کلمہ توحید کا اعادہ ہے اور دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی دو الگ الگ صفتوں کا حوالہ ہے۔ پہلے فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ قائم بالقسط ہے۔ پھر فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، وہ عزیز و حکیم ہے۔ اس اسلوب میں مخاطب۔ اہل کتاب کے لیے سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا، فرشتوں اور تمام حاملینِ علم کی شہادت یہی ہے کہ خدا کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ الٰہ امورِ دنیا سے بے تعلق نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کی چراگاہ میں شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے، وہ دندناتے پھریں اور وہ حی و قیوم ہونے کے باوجود ان کا کوئی نوٹس نہ لے بلکہ وہ تمھاری خواہشوں کے علی الرغم اپنے نظامِ عدل و قسط کو ضرور قائم کرے گا اور کوئی اس کا ہاتھ نہ پکڑ سکے گا۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسا کیوں نہ کرے گا جب کہ وہ وحدہٗ لاشریک بھی ہے اور عزیز و حکیم بھی۔ اس کی عزت اور حکمت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے۔ اگر وہ ایسا نہ کرے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ یا تو وہ بے بس اور حق کے لیے غیرت سے خالی ہے یا وہ ایک کھلنڈرا ہے جس نے دنیا کو محض ایک کھیل تماشا بنایا ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی عظیم ہستی کے متعلق اس قسم کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ ۗ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْیًۢا بَیْنَهُمْ ۗ وَمَنْ یَّكْفُرْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ (۱۹)

"الدین" سے مراد دینِ حقیقی، یعنی وہ دین جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اتارا۔ اس پر الف لام اسی طرح کا ہے جس طرح کا "الکتٰب" پر ہے۔ اس کی وضاحت تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم کر چکے ہیں۔

"العلم" سے مراد علمِ حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حق کو واضح کرنے اور اختلاف کو دور کر دینے کے لیے نازل ہوا۔

دینِ اسلام ہی اللہ کا دین ہے

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ عدل و قسط کو قائم کرنے والا ہے اس وجہ سے اس نے بندوں کو صحیح

زندگی گزارنے کا طریقہ بتانے کے لیے ایک دین عطا فرمایا جس کا نام اسلام ہے۔ یہی دین اللہ کا دین ہے۔ یہ دین عدل و قسط کی میزان ہے۔ یہی دین اس کائنات کے تمام نظام تکوینی میں نافذ ہے۔ اسی دین پر فطرتِ انسانی کی تخلیق ہوئی ہے۔ یہی دین اس نے ابتدا سے تمام نبیوں اور رسولوں پر اتارا۔ اس سے الگ اس نے کسی کو کوئی اور دین نہیں دیا لیکن یہود و نصاریٰ نے باہمی اختلاف و عناد اور ضدم ضدا کی وجہ سے اس میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اور یہودیت و نصرانیت کے ناموں سے اپنے الگ الگ دین کھڑے کر لیے۔ ان کا یہ اختلاف کسی بے خبری پر مبنی نہیں تھا بلکہ حق واضح ہو جانے کے باوجود محض شرارت نفس، باہمی عناد اور اپنی اپنی بدعات کی پچ میں تھا۔ اس طرح انھوں نے اللہ کی عظیم نعمت پا کر ضائع کر دی۔ اللہ چونکہ حی و قیوم اور قائم بالقسط ہے اس وجہ سے اس نے اس نظام عدل و قسط یعنی اسلام کو از سر نو تازہ اور مکمل صورت میں نازل فرمایا تاکہ لوگ ہدایت کی صراط مستقیم پائیں اور دنیا و آخرت دونوں کی فلاح حاصل کریں۔ اب بھی اگر انھوں نے وہی روش اختیار کیے رکھی جو اس سے پہلے اختیار کی اور خدا کی آیتوں کا انکار کرتے رہے تو یاد رکھیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کا حساب بہت جلد چکا دینے والا ہے۔ یعنی یہ مہلت جو انھیں ملی ہوئی ہے اس کو بہت طویل نہ سمجھیں بلکہ حضرت یحییٰؑ کے لفظوں میں یوں سمجھیں کہ درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے۔

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی آ چکا ہے اور وہاں ہم تفصیل کے ساتھ اس پر گفتگو کر چکے ہیں۔ ہم آیت نقل کیے دیتے ہیں، تفصیل کے طالب اسی مقام میں اس کی تفسیر دیکھیں، فرمایا ہے۔

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۲۱۳- بقرہ)

لوگوں کو اللہ نے ایک ہی امت بنایا۔ پھر انھوں نے اختلافات پیدا کیے تو اللہ نے اپنے انبیا بھیجے خوش خبری دیتے ہوئے اور آگاہ کرتے ہوئے اور ان کے ساتھ کتاب اتاری حق کے ساتھ تاکہ لوگوں کے درمیان ان کے اختلافات کا فیصلہ کرے۔ اور اس میں اختلاف انھی لوگوں نے کیا جن کو یہ کتاب ملی، کھلی کھلی تنبیہات کے باوجود، محض آپس کی ضدم ضدا کے سبب سے، تو اللہ نے ایمان لانے والوں کو اپنی توفیق بخشی سے اس حق کی ہدایت دی جس میں ان لوگوں نے اختلاف کیا اور اللہ جس کو چاہتا ہے سیدھی راہ کی ہدایت دیتا ہے۔

فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَمَنِ اتَّبَعَنِ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَ

الْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ (۲۰)

"اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ" (میں نے اپنا چہرہ اللہ کے حوالے کیا) اپنی ذات کو اللہ کے حوالے کرنے کی تعبیر ہے۔ چہرہ انسان کی ذات کا سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ حوالے کر دیا تو گویا سب کچھ حوالے کر دیا۔ یہ اسی طرح کی تعبیر ہے جس طرح ہم کسی کی اطاعت کی تعبیر کے لیے سر جھکا دینا بولتے ہیں۔ اس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی اور سپردگی پائی جاتی ہے۔ موقع دلیل ہے کہ یہاں یہ اسلوب اصلاً تو اسلام لانے کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن ساتھ ہی اس سے اسلام کی اصل روح بھی واضح ہو گئی ہے تاکہ دینداری کے ان مدعیوں کو، جو اسلام کی مخالفت میں بحث و جدال کے لیے آستینیں چڑھائے ہوئے تھے، تنبیہ ہو کہ وہ کس چیز کے خلاف یہ زور دکھا رہے ہیں۔

'اُمّی' کا مفہوم

'اُمّی' مدرسی و کتابی تعلیم و تعلم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ 'اُمّیین' کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل، جو حاملِ کتاب تھے، اُمّیت ان کے لیے ایک امتیازی علامت تھی۔ ہو سکتا ہے کہ عربوں کے لیے اس کے استعمال کا آغاز اہل کتاب سے ہی ہوا ہو اس لیے کہ حضرت اسماعیلؑ اور ان کی ذریت کی بدویت و امیت کا ذکر تورات میں بھی ہے لیکن یہ بات بالکل واضح ہے کہ اس لفظ کے استعمال میں عربوں کے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں تھا۔ چنانچہ قرآن نے اس لفظ کو عربوں کے لیے ان کو اہل کتاب سے محض ممیز کرنے کے لیے استعمال کیا ہے۔ اسی پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے 'نبی امی' کا لقب استعمال ہوا ہے۔ اس میں تورات کی پیشین گوئیوں کی ایک تلمیح بھی ہے۔ عرب خود بھی اس لفظ کو اپنے لیے استعمال کرتے تھے، جو اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اس میں اپنے لیے تحقیر کا کوئی پہلو نہیں پاتے تھے۔ بعض حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنی قوم کے لیے یہ لفظ استعمال فرمایا ہے۔ مثلاً وہ حدیث جس میں ارشاد ہوا ہے نَحْنُ اُمَّةٌ اُمِّيَّةٌ الحدیث بعض جگہ اگر یہ لفظ تحقیر کے طور پر استعمال ہوا ہے تو وہاں اس کا مفہوم محض لغوی ہے اصطلاحی نہیں مثلاً مِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (الآیۃ) اس سے مراد یہود کے اَن پڑھ عوام ہیں۔

"ءَاَسْلَمْتُمْ" (کیا تم بھی اسلام لاتے ہو؟) یہ اسلوب دھمکی اور دعوت دونوں پر مشتمل ہے بلکہ فی الجملہ اس سے بیزاری کا بھی اظہار ہو رہا ہے۔ یعنی تم بھی اسلام لانا ہے تو لاؤ، ہم اپنا وقت اب تمھارے ساتھ مناظرہ بازی میں ضائع کرنا نہیں چاہتے، ہم نے تو اپنی راہ اختیار کر لی ہے، اب اپنی منزل کھوٹی کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ نے جس وقت اللہ کے دین ۔ اسلام ۔ کو یہودیت و نصرانیت کی صورت میں مسخ کیا جان بوجھ کر مسخ کیا اور اب جو یہودیت و نصرانیت کی حمایت اور اسلام کی مخالفت میں یہ تم سے مناظرہ و مباحثہ چھیڑے ہوئے ہیں یہ بھی جان بوجھ کر ہی ہے ۔ انھیں خوب معلوم ہے کہ حق کیا ہے اور تم جس دین کی دعوت دے رہے ہو اس کی حیثیت کیا ہے؛ اس وجہ سے ان کے ساتھ بحث و جدال میں وقت ضائع کرنے سے کچھ حاصل نہیں ۔ ان سے بھی اور اُمّی عربوں سے بھی کہہ دو کہ میں نے اور میرے ساتھیوں نے تو اپنے آپ کو اللہ کے حوالہ کر دیا اور اسلام کا قلادہ اپنی گردن میں ڈال لیا اگر تم بھی اس بازی کے لیے تیار ہو تو بسم اللہ آگے بڑھو اور اگر تیار نہیں تو ہماری راہ چھوڑ دو، اب تمھارے پیچھے ہم اپنی اوقات رائیگاں کرنا نہیں چاہتے ۔

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ اسلام کی راہ اختیار کرتے ہیں تو اور اگر یہ راہ نہیں اختیار کرتے بلکہ اپنی حماقتوں پر جمے رہنا چاہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو، تمھارے اوپر ذمہ داری صرف حق کو پہنچا دینے کی تھی، وہ ذمہ داری تم نے ادا کر دی، اب تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو ۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ اپنے بندوں کے سارے حالات و معاملات کو دیکھ رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ وہ وہی معاملہ کرے گا جس کا اس کو مستحق پائے گا ۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَیَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّیَقْتُلُوْنَ الَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ (۲۱)

قتل انبیاء بغیر حق

'یَقْتُلُوْنَ النَّبِیّٖنَ بِغَیْرِ حَقٍّ' میں 'بغیر حق' کے الفاظ سے ایک تو یہود کے اس جرم کی سنگینی کا اظہار ہو رہا ہے، کیونکہ قتل ناحق بجائے خود ایک سنگین جرم ہے اور اگر یہ قتل ناحق کسی نبی کا ہو تو پھر تو اس کی سنگینی کا پوچھنا ہی کیا ہے ۔ دوسرے اس سے حق کی عظمت کا اظہار ہو رہا ہے کہ حق سب سے بالاتر چیز ہے یہاں تک کہ انبیا بھی اس کے تحت آتے ہیں ۔ اس حقیقت کا اظہار ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمایا ہے ۔

آمرین بالقسط سے مراد

'اَلَّذِیْنَ یَاْمُرُوْنَ بِالْقِسْطِ' سے مراد وہ مصلحین و مجددین ہیں جو عام لوگوں کے اندر سے اٹھے اور جنھوں نے یہود و نصاریٰ کی تحریفات و بدعات کی اصلاح اور ان کی زندگیوں کو از سر نو خدا کے دیے ہوئے نظامِ حق و عدل کے تحت لانے کی جد و جہد کی ۔ ان لوگوں کے ساتھ بھی یہود و نصاریٰ نے وہی معاملہ کیا جو خدا کے نبیوں کے ساتھ کیا ۔ اپنے تمام حربوں سے کام لے کر ان کی مخالفت کی اور جس پر بس چل گیا اس کو قتل کرنے سے بھی دریغ نہیں کیا ۔

اوپر والی آیت کے آخر میں یہ جو فرمایا تھا کہ اللہ اپنے بندوں کا نگرانِ حال ہے، ہدایت و ضلالت میں سے جس کو جس چیز کا سزاوار پائے گا اس کو وہی بخشے گا، اب یہ اس کے مضمرات کھل رہے ہیں مطلب

یہ ہے کہ جن لوگوں کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے ہیں، جو اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے ہیں اور ان لوگوں کو قتل کرتے رہے ہیں جو ان کے اندر اصلاح و تجدید اور حق و عدل کی دعوت لے کر اٹھے یہ کس طرح ممکن ہے کہ آج ان کا مزاج بدل جائے۔ جس نظامِ حق و عدل کو انھوں نے ہمیشہ بگاڑا اور اس کی اصلی بنیادوں پر قائم کرنے والوں کے یہ درپے آزار بھی رہے اور ان کو قتل بھی کیا اسی نظامِ عدل اور اس کے داعیوں کو آج وہ کس طرح گوارا کر لیں گے؟ جب اخلاف اپنے اسلاف ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں تو انبیاء اور مصلحین کے قاتلوں اور تورات و انجیل کے محرفوں کی اولاد سے یہ کس طرح توقع رکھتے ہو کہ وہ تم کو اور تمھاری پیش کی ہوئی کتاب کو ٹھنڈے پیٹوں برداشت کریں گے۔ انجیل میں جگہ جگہ سیدنا مسیح نے قاتلینِ انبیا کی اولاد کے ایمان اور ان کی نجات سے جو مایوسی کا اظہار فرمایا ہے وہ بھی بالکل اسی موقع کی بات ہے۔ بعینہٖ وہی بات قرآن نے یہاں اپنے اسلوب میں کہی ہے کہ یہ لوگ ایمان و اسلام کی راہ اختیار کر کے نجات و فلاح کی خوشخبری کے اہل نہیں ہیں۔ بس انھیں ایک دردناک عذاب کی خوش خبری سنا دو۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ (۲۲)

'حبطِ عمل' سے مطلب ہے کوششوں اور محنتوں کا اکارت ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ وہ ساری دینداریاں جو سیدنا مسیح کے الفاظ میں، مچھر کو چھاننے اور اونٹ کو نگلنے کے مترادف تھیں، ان کے آخرت میں نتیجہ خیز ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ رہیں وہ کوششیں اور تدبیریں جو وہ قرآن و اسلام یا دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ کے نظامِ عدل و قسط کی مخالفت میں صرف کر رہے تھے تو اس آیت نے ان کے بھی اکارت ہونے کی پیشین گوئی کر دی اس لیے کہ اس آیت میں دنیا اور آخرت دونوں میں ان کے اعمال کے اکارت ہونے کا ذکر ہوا ہے اور ساتھ ہی یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ اس ذلت و نامرادی سے بچانے میں ان کا کوئی مددگار ان کی کوئی مدد نہیں کر سکے گا۔ خواہ یہ مددگار روحانی ہوں یا مادی۔ تاریخ گواہ ہے کہ قرآن کی پیشین گوئی حرف بہ حرف پوری ہوئی۔

'حبطِ عمل' کی حقیقت

۶۔ ایمان بالقسط ایمان کے اہم ارکان میں سے ہے

اس مجموعہ آیات میں جو تعلیم امت کو دی گئی ہے آیات کی وضاحت کے ضمن میں بقدرِ ضرورت ہم اس پر روشنی ڈال چکے ہیں لیکن ایمان باللہ کے ذیل میں اللہ تعالیٰ کے قائم بالقسط ہونے کی صفت کا جو حوالہ ہے یہ ایمان کے نہایت اہم اجزا میں سے ہے اور اسلام کی حقیقت میں تو اس کو اس درجہ دخل ہے کہ گویا اسلام عبارت ہی اسی سے ہے۔ اس کی یہ اہمیت تقاضا کر رہی ہے کہ اس کے متعلق استاذ امامؒ کے چند نکات یہاں درج کر دیے جائیں تاکہ جو لوگ حکمتِ دین پر غور کرنا چاہتے ہیں وہ ان سے فائدہ اٹھا

سکیں۔ مولاناؒ کے نزدیک اس صفت کی اہمیت مندرجہ ذیل پہلوؤں سے ہے۔

ایمان بالقسط کی اہمیت کے چار پہلو

۱۔ ایمان امن سے ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اعتماد و اعتقاد اس کی فطرت میں داخل ہے۔ اس سے یہ بات لازم آتی ہے کہ ایمان کے لیے ناگزیر ہے کہ آدمی کو اللہ کے وجود پر یقین راسخ ہو۔ لیکن یہ چیز اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک یہ اعتماد نہ کیا جائے کہ عقل اصلاً رہنمائی کے لیے بنی ہے نہ کہ گمراہ کرنے کے لیے۔ یعنی یہ مانا جائے کہ عقل اپنی فطرت کے لحاظ سے انسان کے اندر ایک میزان قسط ہے۔ پھر یہ چیز ایک اور نتیجہ کو مستلزم ہے کہ فطرت کو اس کے فاطر نے حق و عدل کے اصولوں پر استوار کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بہمہ وجوہ عدل و قسط، عدل و قسط کو پسند کرنے والا اور اس کو قائم کرنے والا ہے۔ یہ تمام نتائج عقلاً لازم بلکہ بدیہیات میں سے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی چیز کے حق ہونے کا ثبوت اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک فاطر فطرت کو حق و عدل نہ مانا جائے۔ اسی سے اس کے تمام افعال کا حق و صدق ہونا ثابت ہوگا۔ جس طرح عقلاً یہ چیز لازم ہے اسی طرح اخلاقی مسلمات سے بھی اس کا ثبوت فراہم ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ نیکی کو اللہ تعالیٰ نے فطرت میں داخل کیا ہے اور دلوں میں اس کے قبول کرنے اور اس کی عزت کرنے کی رغبت و دلیعت فرمائی ہے۔ ایسی حالت میں ہمارے لیے یہ کس طرح ممکن ہے کہ ہم خود تو نیکی کو پسند کریں اور خدا کو نیکی کو پسند کرنے والا نہ قرار دیں۔ ہم اپنی اس خیر پسندی کی صحت و اصابت پر اطمینان کس طرح کر سکتے ہیں اگر خود فاطر کی خیر پسندی پر ہمارا دل مطمئن نہ ہو۔ ہم اس کو نیکی کر کے خوش کرنا تو اسی وجہ سے چاہتے ہیں کہ ہم یہ اطمینان رکھتے ہیں کہ وہ نیکی کو پسند کرتا ہے۔ اس کو اچھی صفات سے موصوف کرنا بھی اسی بنیاد پر ہے کہ ان صفات کو پسند کرنے کے معاملے میں ہمیں اپنی فطرت کے صحیح ہونے پر پورا اعتماد ہے۔

۲۔ دوسرا یہ کہ ایمان کی اصل خدا کی محبت ہے۔ ہم ایک ایسے معبود پر ایمان رکھتے ہیں جس سے ہم محبت کرتے ہیں، جس سے امید رکھتے ہیں اور جس کی خوشنودی چاہتے ہیں۔ یہ چیز اس وقت تک ممکن ہی نہیں ہے جب تک ہمیں یہ یقین نہ ہو کہ وہ ظلم و ناانصافی کے ہر شائبہ سے پاک ہے۔ وہ اپنا انعام انہی پر فرمائے گا جو اس کی اطاعت کریں گے اور سزا انھی کو دے گا جو اس کے مستحق ٹھہریں گے۔ کسی ظالم و نامنصف آقا سے محبت کرنا انسانی فطرت کے بالکل خلاف ہے۔

۳۔ تیسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات پر غور کرنے سے فطرت میں اللہ تعالیٰ پر ایمان لانے کا جو تقاضا ابھرتا ہے اس کی بنیاد شکر پر ہے۔ یہ شکر اس صورت میں لازم ہوتا ہے جب ہم یہ مانیں کہ یہ منعم کا حق اور اس کے انعام کا مقتضا ہے۔ یہی رمز ہے کہ قرآن میں شرک کو ظلم اور ایمان کو شکر قرار دیا گیا ہے۔ اسی اصول پر تمام حقوق کے استحقاق کی بنیاد عدل کے وجوب پر رکھی گئی ہے۔ یہ شریعت اور قانون کی ایک بدیہی حقیقت ہے۔ اس وجہ سے ہر شریعت کی اساس و بنیاد قسط ہے۔

۴۔ چوتھا یہ کہ ایمان کا ثمرہ اطاعتِ الٰہی ہے اور اطاعت کا ثمرہ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر گوشے میں افعال اور ان کے اثرات میں یہ رشتہ اپنے خلق و تدبیر اور اپنے امر و حکم سے قائم کر رکھا ہے اور مختلف طریقوں سے اس حقیقت کی طرف ہماری رہنمائی فرمائی ہے اور ہم چونکہ اعمال کے ان نتائج پر پورا اعتماد رکھتے ہیں اس وجہ سے اس کے وعدے پر بھروسہ رکھتے ہوئے اس کی اطاعت کرتے ہیں۔ اگر اس بات پر ہمارا ایمان نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کر سکتا تو تمام اعمال کی بنیاد ہی ڈھے جائے گی اور پھر سارا اعتماد دو چیزوں میں سے کسی ایک چیز پر رہ جائے گا یا تو نصاریٰ کی طرح جھوٹی شفاعت پر جن کا سارا اعتماد حضرت مسیحؑ پر ہے، جن کو معبود بنا کر وہ ان کی عبادت کرتے اور جن سے خدا سے بڑھ کر محبت کرتے ہیں یا پھر یہود کی طرح کامل سرگشتگی اور ناعاقبت بینی پر۔ انھوں نے ہوا کے رُخ پر اپنی کشتی چھوڑ دی، اپنے تکبر اور حسد کے سبب سے وہ خدا کے فیصلے پر راضی نہ ہوئے گویا ان کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہاں نیک اور بد میں امتیاز کے لیے کوئی ضابطہ ہی نہیں ہے۔ اس ضلالت سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ اس بات پر پورا یقین رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ قائم بالقسط ہے، اس کا ہر حکم عدل اور اس کا ہر وعدہ سچا ہے۔ جیسا کہ اس نے فرمایا ہے۔ تَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا

ان چاروں پہلوؤں پر جو شخص بھی غور کرے گا اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جائے گی کہ ایمان بالقسط ایمان کے نہایت اہم ارکان میں سے ہے اور اس پر عقاید، اخلاق اور شرائع کے نہایت بنیادی مسائل مبنی ہیں۔

۷۔ آگے کا مضمون —— آیات ۲۳-۲۷

پہلے ان منکرین قرآن کی حالت پر تعجب کا اظہار کیا ہے کہ اہل کتاب ہونے کی وجہ سے ان سے توقع تو اس بات کی تھی کہ جس کتاب کا ایک حصہ ان کو دیا گیا تھا لیکن اپنی بدبختی سے اس کو انھوں نے ضائع کر دیا اس کو از سرِ نو اس کی مکمل صورت میں پا کر اس کی قدر کریں گے اور اس کی روشنی میں اپنے تمام اختلافات رفع کر کے نئے سرے سے عدل و حق کی راہ اختیار کریں گے لیکن انھوں نے حسبِ عادت اعراض ہی کی روش اختیار کی۔

اس کے بعد ان کے اس اعراض کے ایک نہایت اہم سبب کا سراغ دیا ہے کہ یہ اپنے آپ کو ایک برگزیدہ امت سمجھنے کی وجہ سے یہ غلط عقیدہ ایجاد کر بیٹھے ہیں کہ یہ دوزخ کے عذاب سے بہر شکل محفوظ ہیں، اوّل تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس سرسری طور پر کچھ سزا بھگت کر اس سے نجات پا جائیں گے۔ یہ عقیدہ ان کی ایک من گھڑت ایجاد ہے جس کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن اسی خود فریبی نے اُن کو ان کے دین سے بالکل غافل کر دیا ہے حالانکہ ایک دن

رتی رتی کا حساب ہونا ہے۔ اس دن ان کی آنکھیں کھلیں گی کہ ان کا سارا کیا دھرا ان کے سامنے موجود ہے اور خدا کی میزان نے نہ ان کے ساتھ کوئی رعایت کی ہے اور نہ کوئی کمی۔

اس کے بعد اس امر کا اعلان ہے کہ یہ یہود و نصاریٰ اب منصبِ امامت سے معزول ہوئے اور شریعتِ الٰہی کی یہ امانت اس امت کے سپرد کی جا رہی ہے جس کو خدا نے اس امانت کا اہل پایا ہے۔ مالک الملک خدا ہی ہے، وہ جس سے چاہے چھینے اور جس کو چاہے بخشے، عزت اور ذلت سب اسی کے ہاتھ میں ہے، رات کو دن میں داخل کرنا اور زندہ کو مردہ سے نکالنا اسی کا کام ہے" یہ بات خبر کے بجائے دعا کے اسلوب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے واسطہ سے آپؐ کے صحابہؓ کو تلقین کی گئی ہے جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ بارِ گراں اب جن کے کندھوں پر ڈالا جا رہا ہے وہ اس کو خدا کی امانت سمجھیں اور اس کے اٹھانے میں اسی کے سہارے کے طالب بنیں۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۳-۲۷

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ
اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَ
هُمْ مُّعْرِضُوْنَ ﴿۲۳﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ
اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ۖ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۴﴾
فَكَيْفَ اِذَا جَمَعْنٰهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۚ وَوُفِّيَتْ كُلُّ
نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۵﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ
الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ
وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۭ بِيَدِكَ الْخَيْرُ ۭ اِنَّكَ
عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۶﴾ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ
فِي الَّيْلِ ۡ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ ۡ
وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۲۷﴾

ترجمۂ آیات ۲۳-۲۷

ذرا ان کو تو دیکھو جن کو کتابِ الٰہی کا ایک حصّہ عطا ہُوا، ان کو اللہ کی کتاب ہی کی طرف دعوت دی جا رہی ہے تاکہ ان کے درمیان فیصلہ کرے۔ پھر ان کا ایک گروہ منہ پھیر لیتا ہے اور یہ منہ پھیر لینے ہی والے لوگ ہیں۔ یہ اس سبب سے ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ بس گنتی کے چند دن چھوئے گی۔ یہ جو کچھ گھڑتے رہے ہیں اس نے ان کو ان کے دین کے بارے میں دھوکے میں ڈال دیا ہے۔ اس وقت کیا ہوگا جب ہم ان کو ایک ایسے دن کے لیے اکٹھا کریں گے جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے اور ہر جان کو جو اس نے کمائی کی ہوگی پوری کی جائے گی، ان پر کوئی ظلم نہیں کیا جائے گا۔ ۲۳-۲۵۔

دعا کرو، اے اللہ، بادشاہی کے مالک، تو ہی جس کو چاہے بادشاہی دے، جس سے چاہے بادشاہی چھینے اور تو ہی جس کو چاہے عزت بخشے اور جس کو چاہے ذلّت دے، تیرے ہی ہاتھ میں خیر ہے۔ بے شک تو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور ظاہر کرتا ہے زندہ کو مردہ سے اور ظاہر کرتا ہے مردہ کو زندہ سے اور تو جس پر چاہتا ہے اپنا بے حساب فضل کرتا ہے۔ ۲۶-۲۷

۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يُدْعَوْنَ اِلٰى كِتٰبِ اللّٰهِ لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ (۲۳)

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب پر ہم سورہ بقرہ میں لکھ چکے ہیں۔ ہر جگہ اس کو واحد کے معنی میں لینا صحیح نہیں ہے، اس کا خطاب جماعت سے بھی ہوتا ہے، گویا فرداً فرداً جماعت کا ہر فرد مخاطب ہوتا ہے۔ پھر یہ محض ایک سادہ خطاب ہی نہیں ہے بلکہ یہ فی الجملہ اظہارِ تعجب کا مفہوم بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔

'اَلَمْ تَرَ' کے خطاب کی نوعیت

قرآن اور دوسرے آسمانی صحیفوں میں نسبت جزو کل کی ہے۔

'نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ' سے مراد تورات اور انجیل وغیرہ ہیں اور کتاب اللہ سے مراد قرآن مجید ہے۔ جس طرح پچھلے آسمانی مذاہب اور شریعتِ اسلامی میں نسبت جزو اور کل کی ہے اسی طرح دوسرے آسمانی صحیفوں اور قرآن میں بھی نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اللہ کی شریعت انسانی ذہن اور انسانی معاشرہ کے تدریجی ارتقا کے لحاظ سے درجہ بدرجہ عطا ہوئی ہے۔ جب تک انسان، کامل شریعت اور کامل کتاب کا اہل نہیں ہوا تھا اس وقت تک اس کو کامل شریعت اور کامل کتاب نہیں دی گئی بلکہ اس کے حالات اور اس کی ضروریات کے مطابق کتاب دی گئی لیکن یہ کتاب اصلاً اس کامل شریعت اور اس کامل کتاب ہی کا ایک حصہ تھی جو اس کے لیے پہلے سے خدا کی اسکیم میں مقرر تھی۔ انبیائے بنی اسرائیل نے جو تعلیم دی وہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے کوئی الگ چیز نہیں بلکہ اسی تعلیم کا اتنا حصہ تھا جو ان کے دور اور ان کے حالات کے لیے موزوں تھا، اسی طرح تورات اور انجیل قرآن مجید سے کوئی الگ چیز نہیں ہیں بلکہ اسی صحیفۂ کامل کے یہ وہ اوراق تھے جو آخری امت سے پہلے کی امتوں کے لیے نازل ہوئے۔ اس طرح گویا تمام آسمانی کتابیں ایک ہی کتابِ الٰہی کے مختلف حصے اور مختلف ابواب کی حیثیت رکھتی ہیں، اصلاً اور فطرتاً ان میں کامل ہم آہنگی و ہم رنگی ہے۔ اگر تورات اور انجیل میں ملاوٹ اور تحریف نہ واقع ہوئی ہوتی تو ان کی تعلیم اور قرآن کی تعلیم میں اجمال و تفصیل اور آغاز و تکمیل کے سوا کوئی فرق نظر نہ آتا تاہم آج بھی ایک صاحب نظر آسانی سے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ سب صحیفے ایک ہی مشکوٰۃِ علم و معرفت کے انوار اور ایک ہی شجرۂ طوبیٰ کے برگ و بار ہیں۔ اس باہمی یک رنگی کی وجہ سے ان لوگوں کے لیے جو تورات و انجیل کو جانتے اور مانتے ہوں قرآن کا پہچاننا کچھ مشکل نہ تھا بشرطیکہ انھوں نے اپنی آنکھوں پر تعصب اور ضد کی پٹیاں نہ باندھ رکھی ہوتیں، جس کتاب کے ابتدائی ابواب انھوں نے پڑھے ہوں، جس کے انداز، اسلوب اور مزاج سے آشنا ہوں، جس کی ہدایات و تعلیمات کا ابتدائی عکس اور خاکہ انھوں نے دیکھا ہو، جس کی پیشین گوئیوں سے وہ باخبر اور ان کے مصداق کے وہ منتظر ہوں، یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ کتاب عزیز جب اپنے اصلی جمال و کمال کے روپ میں نمایاں ہو تو وہ اس کو نہ پہچان سکیں، پھر کس قدر تعجب کی بات ہے کہ اہل کتاب نے اس سے منہ موڑا اور جان کر اس سے انجان بن گئے!

قرآن کی ضرورت رفع اختلاف کے پہلو سے

'لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ' یہ قرآن کا وہ مقصد بیان ہوا جو اہل کتاب کو، اگر وہ اللہ کی شریعت کے قدر دان ہوتے تو بہت عزیز ہونا تھا۔ اوپر بیان ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی ہدایت کے لیے تورات اور انجیل اتاری تھیں لیکن انھوں نے ان میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیے اس لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید کو فرقان بنا کر اتارا تاکہ یہ تمام اختلافات کا فیصلہ کر کے اصل حق کو پھر واضح کر دے۔ اسی بات کو یہاں پھر دہرایا ہے کہ اس کتاب کی طرف جو ان کو بلایا جا رہا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس میں بلانے والے کا کوئی فائدہ ہے بلکہ سراسر انھی کا فائدہ ہے۔ ان کو اس لیے بلایا جا رہا ہے کہ خدا کی شریعت میں انھوں نے جو اختلافات

پیدا کر دیے ہیں وہ رفع ہوں اور جو ہدایت انھوں نے گم کر دی تھی اس سے پھر بہرہ مند ہوں۔

ثُمَّ يَتَوَلّٰى فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ، 'ثُمَّ' یہاں استعجاب کے مفہوم میں ہے اور 'فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ' سے مقصود یہ ظاہر کرنا نہیں ہے کہ اہل کتاب کا ایک قلیل گروہ اس کتابِ الٰہی سے منہ موڑ رہا ہے، اس لیے کہ اس جرم کے مرتکب تو اہل کتاب من حیث الجماعت ہوئے تھے، ان کے اندر سے صرف تھوڑے سے لوگ نکلے، جیسا کہ قرآن کے دوسرے مقامات سے واضح ہے، جو اسلام لانے والے بنے، بلکہ اس میں اصلی زور 'مِّنْهُمْ' کے لفظ پر ہے یعنی تعجب کا اظہار اس بات پر ہے کہ یہ منہ موڑنے والا گروہ ان اہل کتاب کا ہے جو سب سے زیادہ سزاوار اس بات کے تھے کہ سب سے پہلے اس پر ایمان لانے والے بنتے لیکن وہ ایمان کی راہ میں سبقت کرنے کے بجائے کفر کی راہ میں سبقت کرنے والے بنے۔

یہود کا جماعتی مزاج

آخر میں 'وَهُمْ مُّعْرِضُوْنَ' سے اہل کتاب کے اصل جماعتی مزاج پر روشنی ڈال دی کہ حق سے ان کا یہ اعراض کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ ہمیشہ سے ان کی روش یہی رہی ہے۔ اس فقرے میں اہل کتاب کے لیے سخت ملامت کا پہلو بھی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تسکین و تسلی کا بھی۔ مطلب یہ ہے کہ حق سے اعراض جن کی فطرت ثانیہ اور جن کا قومی مزاج بن چکا ہو ان کے دل میں اگر حق نہیں اترتا تو اس میں قصور تمھارا یا حق کا نہیں ہے بلکہ ان کے فساد مزاج کا ہے۔ پتھر میں جونک کہاں لگی ہے!

جو لوگ بنی اسرائیل کی تاریخ سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ حضرت موسیٰؑ سے لے کر سیدنا مسیحؑ تک بلا استثنا ہر پیغمبر نے ان کے مزاج پر ماتم کیا ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم انبیائے بنی اسرائیل کے صحیفوں سے اس کی مثالیں پیش کرتے۔

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ وَغَرَّهُمْ فِيْ دِيْنِهِمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ (۲۴)

یہ مضمون سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم اس کے ہر پہلو کی وضاحت کر چکے ہیں۔ وہاں ارشاد ہوا ہے کہ وَقَالُوْا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ۭ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ بَلٰي مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْۗـَٔتُهٗ فَاُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۸۰-۸۱ بقرہ (اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں تو دوزخ کی آگ نہیں چھوئے گی مگر گنتی کے چند دن، ان سے پوچھو کہ کیا تم نے اللہ سے عہد کرا لیا ہے تو اللہ اپنے عہد کے خلاف نہیں کرے گا یا تم اللہ پر ایک تہمت باندھ رہے ہو جس کے بارے میں تمھارے پاس کوئی علم نہیں۔ اصل معاملہ تو یوں ہے کہ جس نے گناہ کی کمائی کی اور اس کے اس گناہ نے اس کو اپنے لپیٹ میں لے لیا تو یہی لوگ دوزخ والے ہیں، یہ اس میں ہمیشہ رہیں گے)

بقرہ میں یہ آیت بنی اسرائیل کی ان جھوٹی آرزوؤں (امانی) کے ضمن میں وارد ہے جن کو کوئی سند

یہود کی جھوٹی آرزوؤں کی ایک مثال

ان کے دین میں موجود نہیں تھی۔ ان کے علماء نے محض اپنے جی سے گھڑ کر ان کو اپنی شریعت کا جزو بنا دیا تھا اور دل پسند ہونے کی وجہ سے یہ بدعتیں ان کے عوام کے دلوں میں اس طرح راسخ ہو گئی تھیں کہ اب ان کا سارا انحصار انھی جھوٹی آرزوؤں پر رہ گیا تھا۔ ازاں جملہ ان کا یہ من گھڑت عقیدہ بھی تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ برگزیدہ امت ہیں اس وجہ سے ان کے اعمال خواہ کچھ بھی ہوں لیکن ان کے لیے دائمی عذابِ نار نہیں ہے، اوّل تو یہ دوزخ میں ڈالے ہی نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے گئے بھی تو بس تھوڑی بہت اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر چھوٹ جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ ایجاد کر لینے کے بعد دین کی اصلی ذمہ داریوں کو سوچنے سمجھنے کی ان کو کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہ گئی تھی، پھر وہ اس قرآن کی طرف کیوں توجہ کرتے جو ان کو اس جنت الحمقا سے نکال کر ان کو روز روز ان کی ان ذمہ داریوں کے آگے کھڑا کرنا چاہتا تھا جو ان پر فی الواقع ان کے دین کی رُو سے عاید ہوتی تھیں۔ قرآن نے واضح کیا کہ ان کا یہ عقیدۂ افتراء علی اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے اوپر ایک تہمت اور ایک بہتان ہے۔ اس نے کہیں بھی بنی اسرائیل کو یہ لائسنس نہیں دیا ہے کہ وہ جو چاہیں کرتے رہیں، بس چند دن کی سزا کے بعد وہ جنت میں پہنچ جائیں گے۔ ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ درحقیقت ان کی اسی قسم کی من گھڑت بدعات و خرافات ہیں جن میں مبتلا ہو جانے کے سبب سے وہ اپنے دین کے معاملے میں دھوکے میں پڑے ہیں۔ اب ان کا دین ان کی چند دل پسند آرزوؤں اور ان کے چند فریب خوابوں کا ایک مجموعہ بن کر رہ گیا ہے جن میں ان کے لیے خدا کے ہاں حقوق تو بے شمار ہیں، ایک سے ایک بڑھ کر، لیکن یہ ان کے اوپر چند رسوم کے سوا کوئی ذمہ داری عاید نہیں کرتا۔

فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ ۖ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (۲۵)

یعنی یہ تو یہ امیدیں لگائے بیٹھے ہیں اور آخرت سے متعلق یہ لذیذ خواب دیکھ رہے ہیں لیکن اس وقت کیا بنے گا جب ہم ان کو ایک ایسے یوم الفصل کے احوال و نتائج دیکھنے کے لیے جمع کریں گے جو اس کائنات کی ایک اٹل حقیقت ہے اور جس کے پیش آنے میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے؟ ہمارے نزدیک لام یہاں 'فی' کے معنی میں بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ اس کے اندر ظرفیت کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے۔ اور عربی زبان کے قواعد کی رُو سے اس بات کی بھی گنجائش ہے کہ یہاں حرفِ جر کے بعد ایک مضاف محذوف مان لیا جائے۔ ہم نے اسی دوسرے پہلو کو سامنے رکھ کر آیت کی وضاحت کی ہے۔

اس دن کی ایک خصوصیت تو یہ بیان ہوئی کہ اس کے آنے میں کسی شک کی گنجائش نہیں ہے دوسری یہ کہ اس دن ہر نفس کو اس کی کمائی پوری کی جائے گی، کسی کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اب یہ اہل کتاب خود سوچ لیں کہ آج ایک من گھڑت عقیدے میں مبتلا ہو کر یہ جس خواب خوش کے مزے لے رہے ہیں اس سے بیدار ہونے کے بعد انھیں کس حقیقت سے دوچار ہونا ہے۔

قُلِ اللَّهُمَّ مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَن تَشَاءُ وَتَنزِعُ الْمُلْكَ مِمَّن تَشَاءُ ۖ وَتُعِزُّ مَن

تَشَآءُ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ بِيَدِكَ الْخَيْرُ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۲۶-۲۷)

امتِ مسلمہ کے لیے ایک عظیم بشارت دعا کے اسلوب میں

یہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اور آپ کے واسطے سے پوری امت کو ایک دعا تلقین کی گئی ہے جو مندرجہ ذیل امور پر مشتمل ہے۔

۱۔ پہلی چیز وہ عظیم بشارت ہے جو اس امت کے لیے اس کے اندر مضمر ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یہ دعا در پردہ اشارہ کر رہی ہے کہ اہل کتاب کی ضد اور ان کے حسد کے علی الرغم امامت و سیادت کا وہ منصب جس پر بنی اسرائیل اب تک فائز رہے ہیں اب وہ بنی اسمٰعیل کی طرف منتقل ہو رہا ہے اور بنی اسرائیل کی کوئی مخالفت خدا کے اس فیصلہ کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ اپنے ملک کا مالک خدا ہے، جس کو چاہے وہ ملک بخشے اور جس سے چاہے چھین لے، جس کو چاہے عزت دے، جس کو چاہے ذلت دے، خیر کے تمام خزانوں کا مالک وہی ہے۔ بنی اسرائیل یہ جو سمجھتے رہے ہیں کہ تمام خیر کے وارث و مورث وہی ہیں، کسی اور کے لیے، خاص کر بنی اسمٰعیل کے لیے، اس خیر میں کوئی حصہ نہیں ہے، اس دعا نے ان کے اس خیالِ باطل کی بساط الٹ دی۔ اس میں یہ اشارہ ہے کہ اب مالک کائنات نے اس خزانۂ خیر کی کنجیاں بدعہدوں اور خائنوں سے چھین کر ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے جو اس امانت کے اہل ہیں۔

۲۔ اس بشارت کے ساتھ اس میں بنی اسرائیل کے لیے انذار بھی ہے اور یہ انذار درحقیقت مذکورہ بالا بشارت ہی کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب سیادت بنی اسمٰعیل کو حاصل ہو گی تو لازماً اس سیادت سے بنی اسرائیل محروم ہوں گے، جب بنی اسماعیل عزت سے سرفراز ہوں گے تو لازماً بنی اسرائیل کے لیے ذلت مقدور ہو چکی ہے۔ نصب و عزل، عزت و ذلت اور حیات و موت دونوں کا ذکر کر کے قرآن نے اپنے مخالفین اور موافقین دونوں کے لیے تقدیر کا فیصلہ سنا دیا۔

۳۔ اس میں اس امت کے لیے ایک عظیم نصیحت بھی ہے کہ اب یہ امانت جو تمھاری طرف منتقل ہو رہی ہے تو یہود کی طرح یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ یہ تمھارے استحقاق ذاتی کا کرشمہ یا تمھارے حسب و نسب کا ثمرہ ہے بلکہ یہ سراسر خدا کا فضل ہے جس کے تم اس وقت تک سزاوار قرار پاؤ گے جب تک اس کا حق ادا کرتے اور اس کی ذمہ داریوں کو اٹھانے کے معاملے میں برابر خدا سے دعا کرتے رہو گے۔

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوئی کہ یہ آیت درحقیقت یہود کے عزل کا اعلان اور امتِ مسلمہ کے نصب کی بشارت ہے، لیکن بات بجائے خبر اور بشارت کے دعا کے اسلوب میں کہی گئی ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو یہ کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک حالات ابھی پردے میں تھے اور جو چیز پردے میں ہو اس کے متعلق یہی اسلوب موزوں ہے کہ امت اس کے لیے دعا کرے اور دوسری یہ کہ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ امت اس بشارت کو فخر اور غرور کے ساتھ نہ قبول کرے بلکہ تواضع، تذلل،

احساس عبدیت اور دعا کے ساتھ قبول کرے اس لیے کہ سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے، جو محروم ہوتا ہے وہ بھی خدا ہی کے حکم سے محروم ہوتا ہے اور جو پاتا ہے وہ بھی خدا ہی کے ہاتھ سے پاتا ہے۔

بشارت کے دعائیہ اسلوب میں ظاہر ہونے کی بعض اور نہایت بلیغ مثالیں بھی قرآن میں موجود ہیں۔ مثلاً ہجرت کے حکم سے ذرا پہلے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ دعا سکھائی گئی:

وَقُلْ رَّبِّ اَدْخِلْنِیْ مُدْخَلَ صِدْقٍ وَّاَخْرِجْنِیْ مُخْرَجَ صِدْقٍ وَّاجْعَلْ لِّیْ مِنْ لَّدُنْكَ سُلْطٰنًا نَّصِیْرًا ۝ وَقُلْ جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ اِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا (۸۰-۸۱- بنی اسرائیل)

اور دعا کرو کہ اے رب مجھے داخل کر عزت کے ساتھ اور مجھے نکال عزت کے ساتھ اور مجھے خاص اپنے پاس سے نصرت کا پروانہ عطا فرما۔ اور یہ اعلان کر دو کہ حق آگیا اور باطل نابود ہوا اور باطل نابود ہونے ہی کے لیے ہے۔

اس دعا میں ہجرت کی خبر بھی ہے اور ساتھ ہی اس بات کی بشارت بھی کہ آپ کا مکہ سے نکلنا اور دارالہجرت میں داخل ہونا دونوں عزت کے ساتھ ہوگا اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حفاظت کے لیے خاص بدرقہ اور نصرت کا خاص پروانہ عطا ہوگا بلکہ اس میں ایک لطیف بشارت اس بات کی بھی ہے کہ آپ کے پُروقار داخلہ کا انتظام آپ کے نکلنے سے پہلے ہی ہو چکا ہے۔ اس کا اشارہ اس بات سے ہو رہا ہے کہ دعا میں داخل ہونے کا ذکر نکلنے کے ذکر پر مقدم رکھا گیا ہے بلکہ زیادہ تدبر سے کام لیجیے تو یہ بات بھی آیت سے نکلتی ہے کہ ہجرت درحقیقت فتح کا دیباچہ اور غلبۂ حق کا مقدمہ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کو خبر اور بشارت کے اسلوب میں کہنے کے بجائے دعا کے اسلوب میں کہا گیا ہے اور اس میں حکمت وہی ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔

نظامِ تکوینی کی شہادت

'تُوْلِجُ الَّیْلَ' الآیہ میں اسی بات پر جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوئی اس کائنات کے نظام تکوینی کی شہادت کا حوالہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو خدا رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور رات کے بعد دن کو نمودار کرتا ہے، جو مردہ سے زندہ کو اور زندہ سے مردہ کو ظاہر کرتا ہے اس کے سوا دنیا میں عزل و نصب اور عزت و ذلت کا اختیار ہو بھی کسے سکتا ہے!

یہ دن کو رات میں داخل کرنا اور رات کو دن میں داخل کرنا رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے آمد و شد کی نہایت خوب صورت تشبیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے دونوں ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے تعاقب کر رہے ہیں، کبھی رات دن کے اندر گھس جاتی ہے، کبھی دن رات کے اندر چھپ جاتا ہے، یہ چکر پورے تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ قرآن میں یہ تشبیہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوئی ہے۔ اسی طرح موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے ظاہر ہونے کے نشانات بھی ہر گوشے میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں، مادیات میں بھی، معنویات میں بھی۔ یہ ایک لطیف تعریض اس صورتِ حال پر بھی ہے جو بنی اسرائیل کی موت

اور بنی اسماعیل کی زندگی سے نمایاں ہو رہی تھی۔ حضرت ابراہیمؑ نے جو پودا فلسطین کی سرسبز و شاداب زمین میں لگایا تھا اب وہ سوکھ چکا تھا اور جیسا کہ حضرت یحییٰؑ نے فرمایا، اس کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس انھوں نے جو پودا عرب کی خشک اور بنجر زمین میں لگایا تھا اور جو مرجھایا ہوا پڑا تھا اب اس میں شگوفے نکل رہے تھے اور جیسا کہ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا، وہ ایک تناور درخت بن کر ایک عالم کو اپنے سائے کی پناہ میں لینے والا تھا۔

'مبغیر حساب' دو مفہوم

'وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ' رزق یہاں فضل و انعام کی تعبیر ہے، روزی کے محدود مفہوم میں نہیں ہے۔ بِغَيْرِ حِسَابٍ یہاں دو مفہوموں پر مشتمل ہے۔ ایک کثرت کے مفہوم پر یعنی وہ جس کو چاہتا ہے بے اندازہ فضل و انعام سے نوازتا ہے جس کی کوئی حد و نہایت نہیں، جیسا کہ فرمایا ہے۔ وَاِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ (صابروں کو ان کے صبر کا بے حساب اجر ملے گا) دوسرے بے سان گمان کے مفہوم پر، جیسا کہ فرمایا ہے وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۶۵۔ طلاق (اور اس کو وہاں سے روزی دے گا جہاں سے اس کو گمان بھی نہ ہوگا)

۹۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۲۸-۳۲

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو گئی کہ اب اہل کتاب کی حیثیت ایک اجڑے ہوئے گھر کی ہے جس کا ڈھے جانا مقدر ہو چکا ہے اس وجہ سے آگے کی آیات میں ان کمزور اور مبتلائے نفاق مسلمانوں کو جو اہل کتاب بالخصوص یہود کی طرف میلان رکھتے تھے متنبہ فرمایا کہ اب ان سے موالات رکھنا ایک اجڑے ہوئے گھر کی دربانی ہے اور اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب وہ گھر گرے تو اس کے نیچے وہ لوگ بھی دب کے رہ جائیں جو اس کی دیواروں کے نیچے سائے کی تلاش میں گئے ہیں۔

اس کے بعد ان کے اس نفاق پر تنبیہ فرمائی کہ اگر ان کے دلوں میں کفر اور اہل کفر کی محبت چھپی ہوئی ہے تو وہ یہ یاد رکھیں کہ خدا سے کوئی چیز بھی ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے، ایک دن آئے گا جب ہر شخص کے سامنے اس کا سارا کھلا چھپا آجائے گا، اس دن خدا کا عدل ظاہر ہو گا اور ہر شخص اس کا مزا چکھے گا۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے اس وجہ سے وہ پہلے سے اس دن سے آگاہ کر رہا ہے۔

پھر ایمان اور محبتِ الٰہی کا صحیح تقاضا واضح فرمایا کہ جو لوگ اللہ پر ایمان اور اس کی محبت کے مدعی ہوں ان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے مخالفوں سے موالات رکھیں بلکہ ان کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ وہ اللہ کے رسول کی پیروی کریں، جو لوگ ایسا کریں گے خدا بھی ان سے محبت کرے گا۔ یہی راہ خدا کے محبوب بننے کی راہ ہے۔ جو لوگ اس کے خلاف روش اختیار کریں گے وہ

درحقیقت کافر ہیں اور اللہ تعالیٰ کافروں سے محبت نہیں رکھتا۔
اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۲۸-۳۲

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ
تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸﴾
قُلْ اِنْ تُخْفُوْا مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ اَوْ تُبْدُوْهُ يَعْلَمْهُ اللّٰهُ ۭ
وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ
خَيْرٍ مُّحْضَرًا ښ وَّمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوْۗءٍ ڔ تَوَدُّ لَوْ اَنَّ بَيْنَهَا
وَبَيْنَهٗٓ اَمَدًۢا بَعِيْدًا ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ
بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِيْ يُحْبِبْكُمُ
اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوْبَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۱﴾ قُلْ اَطِيْعُوا
اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾

ترجمہ آیات ۲۸-۳۲

اہل ایمان مومنوں کے برخلاف کافروں کو اپنا دوست نہ بنائیں اور جو ایسا کریں گے
تو اللہ سے ان کو کوئی تعلق نہیں، مگر یہ کہ تم اُن سے بچو جیسا بچنے کا حق ہے، اللہ تمھیں
اپنی ذات سے ڈراتا ہے اور اللہ ہی کی طرف لوٹنا ہے، کہہ دو کہ جو کچھ تمھارے دلوں
میں ہے اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو، اللہ اس سے باخبر ہے اور وہ اس سب کو جانتا ہے
جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ جس دن ہر جان
اپنی کی ہوئی نیکی کو اپنے سامنے موجود پائے گی اور جو برائی کی ہو گی اس کو بھی موجود

پائے گی اور وہ آرزو کرے گی کہ کاش اس کے اور اس کے درمیان ایک زمانہ دراز حائل ہوتا اور اللہ اپنی ذات سے تمھیں ہوشیار کرتا ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ بڑا مہربان ہے۔ ۲۸-۳۰

کہہ دو، اگر تم اللہ کو دوست رکھتے ہو تو میری پیروی کرو، اللہ تم کو دوست رکھے گا اور تمھارے گناہوں کو بخشے گا، اللہ بخشنے والا، رحم کرنے والا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی، اگر یہ اعراض کریں تو یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۳۱-۳۲

۱۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُونَ الْكٰفِرِينَ أَوْلِيَآءَ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ وَمَن يَفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِي شَيْءٍ إِلَّآ أَن تَتَّقُوا مِنْهُمْ تُقٰىةً ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهُ ۗ وَإِلَى اللّٰهِ الْمَصِيرُ (۲۸)

"مُؤْمِنُونَ" کا لفظ اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن مراد اس سے خاص طور پر وہ مسلمان ہیں جو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے بلکہ کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں، جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے، غیر مطمئن ہونے کے باعث، یہود کی طرف میلان رکھتے تھے، اور یہود اسلام اور مسلمانوں کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے اس میں وہ ان کو آلۂ کار بنا لیتے تھے اور یہ ان کے آلۂ کار بن جاتے تھے۔ ان کو مخاطب کرکے فرمایا کہ اب یہود کے ساتھ موالات اور دوستی اُجڑے گھر کی دربانی بھی ہے اور یہ حرکت ایمان و اسلام کے دعوے کے منافی بھی ہے۔

[آیت ۲۸ میں 'مؤمنین' سے مراد مذبذب مسلمان اور 'کافرین' سے مراد یہود ہیں]

"کٰفِرِينَ" سے یہاں مراد اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جیسا کہ آیت ۲۱ میں ان کے کفر کی تصریح گزر چکی ہے۔

"وَلِی" کے معنی کارساز، حمایتی، ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا حمیت و حمایت کے جذبے سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ مِن دُونِ الْمُؤْمِنِينَ کی قید ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لیے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات

[کفار سے مسلمانوں کے برخلاف موالات ناجائز ہے]

کا تعلق قائم کرے۔ اس قید نے یہ بات واضح کر دی کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی، عدل اور احسان کی ممانعت نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے معاملے میں ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کر سکتے ہیں بشرطیکہ وہ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ نہ ہوں۔ اس مسئلے پر تفصیلی بحث ہم آگے موزوں مقام پر کریں گے۔

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا الآیۃ کا صحیح مفہوم

اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا مِنْهُمْ تُقٰىةً (مگر یہ کہ ان سے بچو جیسا کہ بچنے کا حق ہے) تُقٰىةً، جس طرح اسی سورہ کی آیت ۱۰۲ اِتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ میں مفعول مطلق کے طور پر استعمال ہوا ہے اسی طرح یہاں بھی مفعول مطلق ہے جس سے فعل کی تاکید ظاہر ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو مسلمان اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے موالات کا تعلق رکھتے ہیں ان کا اللہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس قسم کے لوگ، جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے 'وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ' انہی لوگوں کے اندر شامل ہیں جن سے یہ موالات رکھتے ہیں۔ اللہ اور اعداء اللہ دونوں کے ساتھ بیک وقت دوستی قائم نہیں رکھی جا سکتی، اللہ سے دوستی کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں سے اپنا دامن بچا کے رکھو جو اللہ کے، اس کے دین کے اور اس کے وفادار بندوں کے دشمن ہیں[1]۔ یہ جملہ گویا لَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ سے استثناء ہے یعنی اس نفی سے مستثنیٰ صرف وہی ہیں جو ان کفار کی مخالفِ اسلام موالات سے اس طرح بچیں جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے۔ اس آیت سے جن لوگوں نے تقیہ کا جواز نکالا ہے انھوں نے لغت، نظائرِ قرآن اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کیا ہے لیکن صحیح تاویل واضح ہو جانے کے بعد اب اس کی تردید کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو

'وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ' (اور اللہ تمھیں اپنی ذات سے ہوشیار کرتا ہے) میں منافقین کے لیے تنبیہ کا ایک خاص پہلو ہے۔ وہ یہ کہ اللہ کی کریمی سے دھوکے میں پڑ کے اس کی ذات کے دوسرے پہلوؤں کو نظر انداز نہ کر جاؤ۔ وہ اگر شرارتوں سے درگزر کرتا ہے، سازشوں کو نظر انداز کرتا ہے اور ریشہ دوانیوں کا فوراً نوٹس نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ جرائم اس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ ان جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا بلکہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ وہ بندوں کو آخری حد تک مہلت دیتا ہے۔ یہ مہلت بہرحال مہلت ہے جو ایک دن ختم ہونی ہے۔ اس کے بعد اس کا عدل ظہور میں آئے گا اور یہ عدل بھی اس کی ذات ہی کا ایک پہلو ہے۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا ہے تو اس سے کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ یہ ظہور میں آئے گا ہی نہیں۔ خدا کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں، جب اس کی ذات کا یہ پہلو سامنے آئے گا

---

[1] اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیشِ نظر رہے: 'لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ' (المجادلۃ ۵۸: ۲۲) تم کوئی ایسی قوم نہیں پا سکتے جو اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتی ہو، پھر وہ ان لوگوں سے دوستی رکھے جو اللہ اور اس کے رسول سے دشمنی رکھتے ہیں۔

تو ہر شخص پر کھل جائے گا کہ اس سے زیادہ زور آور، اس سے زیادہ بے لاگ اور اس سے بڑا منتقم و قہار کوئی بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے اسی پہلو سے یہاں ہوشیار کیا ہے اور آگے واضح ہو گا کہ بار بار ہوشیار کیا ہے۔ ایک دوسری جگہ فرمایا ہے۔ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيمِ (اے انسان تجھ کو تیرے رب کریم کے بارے میں کس چیز نے دھوکے میں ڈال رکھا ہے) اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔

جن کمزور اور منافق قسم کے مسلمانوں کو یہاں تنبیہ فرمائی انھی کا ذکر اسی سورہ میں آگے بھی آ رہا ہے اس سے اس آیت کے بعض مخفی گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا
بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ
خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ قَدْ
بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ
وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ
قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن
كُنتُمْ تَعْقِلُونَ ۝ هَا أَنتُمْ أُولَاءِ
تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ
وَتُؤْمِنُونَ بِالْكِتَابِ كُلِّهِ
وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا وَ
إِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ الْأَنَامِلَ
مِنَ الْغَيْظِ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ
إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ
إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ
وَإِن تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا
بِهَا وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ
كَيْدُهُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ بِمَا
يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝ (۱۱۸-۱۲۰ آل عمران)

اے ایمان والو، اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ، وہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے، وہ تمھارے لیے زحمتوں کے آرزو مند ہیں، ان کی زبانوں سے ان کی دشمنی آشکارا ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ اس سے بھی شدید ہے۔ ہم نے تمھیں واضح تنبیہات پہنچا دی ہیں، اگر تم سمجھنے والے لوگ ہو۔ تم ہی ہو کہ ان سے محبت رکھتے ہو اور وہ تم سے محبت نہیں رکھتے حالانکہ تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تمھارے سامنے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب وہ الگ ہوتے ہیں تو غصے سے تم پر انگلیاں کاٹتے ہیں، کہہ دو کہ تم اپنے اس غصے میں مر جاؤ، اللہ دلوں کے بھیدوں سے باخبر ہے۔ اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں بری لگتی ہے اور اگر کوئی گزند تمھیں پہنچ جائے تو اس سے خوش ہوتے ہیں۔ اگر تم ثابت قدم اور تقویٰ پر قائم رہے تو ان کی چالوں سے تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچے گا۔ اللہ ان کے اعمال کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔

قُلْ إِن تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ مُّحْضَرًا وَمَا عَمِلَتْ مِن سُوءٍ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ بِالْعِبَادِ (۲۹-۳۰)

'مَافِیْ صُدُوْرِکُمْ' میں اشارہ ہے اس نفاق اور اہل کفر کی دوستی کی طرف جو یہ لوگ اپنے دلوں میں رکھتے تھے۔ فرمایا کہ اس کو چھپاؤ یا ظاہر کرو خدا سے کوئی چیز بھی چھپی نہیں ہے۔ وہ صرف تمہارے دلوں کے رازوں ہی سے نہیں بلکہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اور جو کچھ ہو رہا ہے، سب سے باخبر بھی ہے اور ہر چیز پر قادر بھی ہے۔ اس علم و قدرت کے باوجود اگر وہ ڈھیل دے رہا ہے تو اس لیے کہ اس نے جزا اور سزا کے لیے ایک خاص دن مقرر کر رکھا ہے جس میں ہر ایک کے سامنے اس کی نیکی اور بدی سب آجائے گی اور ایسے نتائج کے ساتھ سامنے آئے گی کہ جو لوگ اس ڈھیل سے دھوکے میں پڑ کر اس دن کو اتنا بعید سمجھ بیٹھے کہ اس کے لیے کسی فکر و اہتمام کی ضرورت ہی سے نچنت ہو گئے، وہ یہ آرزوئیں کریں گے کہ کاش ان کے اور ان کے ان نتائج اعمال کے درمیان ایک زمانۂ بعید کی دوری حائل ہو جائے۔

مَاعَمِلَتْ مِنْ سُوْءٍ، کے بعد 'مُحْضَرًا' کا لفظ محذوف ہے۔ چونکہ پہلے ٹکڑے میں اس کا اظہار ہو چکا ہے اس وجہ سے دوسرے میں تکرار سے بچنے کے لیے اس کو حذف کر دیا۔ بَیْنَهَا وَبَیْنَهٗ میں پہلی ضمیر کا مرجع نفس، دوسری کا سوء محضر ہے۔

وَیُحَذِّرُکُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ 'رَءُوْفٌ'، کے لفظ پر ہم کہیں بحث کر آئے ہیں کہ اس میں دفع شر کا پہلو غالب ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے بندوں پر غایت درجہ مہربان ہے، وہ ان کو ان کے اعمال کے نتائج بد سے بچانا چاہتا ہے اس وجہ سے وہ ان کو اپنی ذات سے بار بار ہوشیار کر رہا ہے کہ وہ اس کی ڈھیل سے کسی غلط فہمی میں نہ پڑیں۔ وہ ڈھیل تو بے شک دیتا ہے لیکن جب پکڑے گا تو اس کی پکڑ بھی بڑی سخت ہو گی۔

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ قُلْ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا یُحِبُّ الْکٰفِرِیْنَ (۳۱-۳۲)

اہل ایمان کے لیے صحیح روش

یہ ان مذبذب قسم کے مسلمانوں کو اس صحیح رویے کی تعلیم دی گئی ہے جو سچے مسلم کی حیثیت سے انھیں اختیار کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ اگر تم اللہ کے ساتھ محبت رکھنے کے مدعی ہو تو اس محبت کے ساتھ ان لوگوں کی محبت جمع نہیں ہو سکتی جو اللہ کے، اس کی کتاب کے اور اس کے دین کے دشمن ہیں بلکہ اس کا راستہ یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی پیروی کرو۔ اگر تم رسول کی پیروی کرو گے تو یہی راستہ اللہ سے محبت کرنے کا ہے۔ اور اس کا انعام یہ ہے کہ اللہ بھی تم سے محبت کرے گا اور اب تک تم سے جو غلطیاں اور کمزوریاں صادر ہوئی ہیں ان کو معاف فرما دے گا۔ اللہ غفور رحیم ہے۔

اس کے بعد نہایت واضح الفاظ اور تہدید آمیز انداز میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ اعلان کرا دیا کہ ان کو خبردار کر دو کہ سیدھے سیدھے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کریں اور اگر وہ

اس چیز سے اعراض کرتے ہیں تو یاد رکھیں کہ وہ بھی انھی کافروں میں شامل ہیں جن سے ان کا یارانہ ہے اور اس کے ساتھ اس بات کو بھی یاد رکھیں کہ اللہ کافروں کو کبھی دوست نہیں رکھتا۔

ان دونوں آیتوں میں بعض باتیں خاص طور پر ملحوظ رکھنے کی ہیں۔

ایک یہ کہ ان دونوں کا لب و لہجہ الگ الگ ہے۔ پہلی آیت میں شفقت ہے اور دوسری میں تنبیہ بلکہ تہدید۔ گویا درشتی و نرمی بہم در بر است۔

دوسری یہ کہ ایمان کی اصل روح اللہ کی محبت ہے اور اس محبت کے لیے یہ شرط ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی محبت جمع نہ ہونے پائے جو اس کے ضد ہو۔

تیسری یہ کہ اللہ سے محبت کرنے کا واحد راستہ رسول کی پیروی ہے، اس سے ہٹ کر جو راستے نکالے گئے ہیں وہ سب بدعت و ضلالت ہیں۔

چوتھی یہ کہ خدا کی محبوبیت کا راستہ بھی رسولؐ کی پیروی ہی ہے۔ اگر کسی شخص کی زندگی رسولؐ کی سنت سے منحرف ہو اور وہ اس زعم میں مبتلا ہو کہ وہ خدا کا محبوب ہے یا دوسرے اس کو محبوبِ خدا سمجھیں تو یہ بالکل خبط ہے۔

پانچویں یہ کہ دین کا کم سے کم مطالبہ اللہ و رسول کی اطاعت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ مطالبہ پورا کرنے سے اعراض اختیار کرتا ہے تو اس کا شمار دین کے منکروں میں ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں سے محبت نہیں رکھتا۔

۱۱۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۳۳-۴۴

آیت ۳۲ پر سورہ کی تمہید ختم ہوئی۔ اب آگے نصاریٰ کی بدعات کی تردید شروع ہو رہی ہے جو اس سورہ میں اصل مضمون کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا آغاز بھی ایک تمہید سے ہوا ہے۔ پہلے اس سلسلۂ رشد و ہدایت کا حوالہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے اس دنیا کی رہنمائی کے لیے قائم فرمایا۔ اس ذیل میں حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، آلِ ابراہیمؑ اور آلِ عمران کا ذکر ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا کی امامت و ہدایت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس زمرے میں آلِ عمران کا ذکر خاص طور پر سیدنا مسیحؑ کے ذکر کی گویا تمہید ہے اس لیے کہ اسی مبارک خاندان کی چشم و چراغ حضرت مریمؑ ہیں اور انھی حضرت مریمؑ کے بطن سے سیدنا مسیحؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ مقصود حضرت آدمؑ سے لے کر آلِ ابراہیمؑ و آلِ عمران تک کے اس شجرے کا حوالہ دینے سے یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ اور ان کی والدہ ماجدہ حضرت مریمؑ کے متعلق نصاریٰ کے سامنے یہ بات واضح طور پر آجائے کہ ان کی اپنی مانی ہوئی تاریخ سے جو بات ثابت ہوتی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ حضرت مسیحؑ یا ان کی والدہ کوئی مافوق بشر ہستی ہیں بلکہ ان کا تعلق بھی رشد و ہدایت کے اسی سلسلۃ الذہب سے

ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی ہدایت کے لیے منتخب فرمایا۔ اس مبارک خانوادہ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ارشاد و ہدایت کے لیے برگزیدگی کا شرف ضرور حاصل ہوا لیکن یہ برگزیدگی اللہ کی بندگی اور اس کی بندگی کی دعوت کے لیے تھی، جس طرح اس سلسلے میں دوسرے اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں اسی طرح حضرت مسیح بھی خدا کے ایک برگزیدہ بندے ہیں۔ پھر ان کو اور ان کی والدہ کو الوہیت کا درجہ دینے کا جواز کہاں سے پیدا ہوتا ہے۔

آگے حضرت مریمؑ کی ابتدائی زندگی کے واقعات کا حوالہ ہے کہ ان کی ولادت سے پہلے کس طرح ان کی والدہ نے اپنے پیٹ کے بچے کے لیے ایک منت مانی، پھر جب توقع کے خلاف ان کے ہاں لڑکی کی ولادت ہوئی تو انھیں کس نوعیت کا اضطراب پیش آیا پھر اللہ تعالیٰ نے ان کا یہ اضطراب کس طرح دور فرمایا، حضرت زکریا نے ان کو کس طرح اپنی تربیت میں لیا اور کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی قبولیت سے نوازا یہاں تک کہ ان کے روحانی فیوض و برکات سے حضرت زکریا جیسے صاحبِ فیوض و برکات بھی اس اس درجہ متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے لیے بھی اولادِ صالح کی دعا مانگی۔ حضرت مریمؑ کی اس سرگزشت کا حوالہ دینے سے مقصود نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کرنا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی ایک پاکیزہ خصائل تابعدار اور فرمانبردار بندی کی سرگزشت ہے نہ کہ ان کے زعم کے مطابق نعوذ باللہ خدا کی ماں کی!

اس کے بعد حضرت زکریا کی دعا کی قبولیت کا ذکر ہے کہ باوجودیکہ وہ خود بڑھاپے کی آخری منزل میں داخل ہو چکے تھے اور ان کی بیوی بھی بانجھ تھیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کو حضرت یحییٰؑ کی ولادت کی بشارت دی اور وہ اس بشارت کے بموجب پیدا ہوئے۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ خارق عادت ولادت اللہ تعالیٰ کی قدرت کی ایک نشانی ہے، اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جس کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف ہو اس کو خدا یا اوتار بنا دیا جائے۔ اگر نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کی خارق عادت ولادت کی دلیل پر ان کو خدا بنا بیٹھے تو یہ دلیل تو حضرت یحییٰؑ کے حق میں بھی موجود ہے!

اس روشنی میں اب ابطالِ نصرانیت کی اس تمہید کو پڑھیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۳۳-۴۴

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى
الْعَالَمِينَ ﴿٣٣﴾ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ﴿٣٤﴾ إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا
فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّىْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰى ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا
وَضَعَتْ ؕ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى ۚ وَاِنِّىْ سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَ
اِنِّىْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ﴿۳۶﴾ فَتَقَبَّلَهَا
رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا ۙ وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۚؕ
كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ
قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ؕ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ
يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۷﴾ هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ
قَالَ رَبِّ هَبْ لِىْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ
الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ يُّصَلِّىْ فِى الْمِحْرَابِ ۙ
اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًۢا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَسَيِّدًا
وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ
غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِىَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِىْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ
مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّىْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ
النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ
بِالْعَشِىِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ ع ۱۷
اصْطَفٰىكِ وَطَهَّرَكِ وَاصْطَفٰىكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۲﴾
يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾
ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ؕ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ

إِذْ يُلْقُونَ أَقْلَامَهُمْ أَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ ﴿۴۴﴾

ترجمۂ آیات ۳۳-۴۴

اللہ نے آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کو اہلِ عالم کی رہنمائی کے لیے منتخب فرمایا، یہ ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔ اور اللہ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ۳۳-۳۴

یاد کرو جب عمران کی بیوی نے دعا کی کہ اے میرے رب جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں نے اس کو ہر چیز سے چھڑا کر تیرے لیے خاص کیا، سو تو اس کو میری طرف سے قبول فرما، بے شک تو ہی ہے جو سننے والا جاننے والا ہے۔ تو جب اس نے اس کو جنا تو اس نے کہا کہ اے رب یہ تو میں لڑکی جنی ہوں ــــ اور اللہ کو خوب پتا تھا اس چیز کا جو وہ جنی تھی ــــ اور لڑکا لڑکی کی مانند تو نہیں ہوتا، اور میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان رجیم سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔ تو اس کے رب نے اس کو اپنی پسندیدگی کی قبولیت سے نوازا، اس کو عمدہ طریقے پر پروان چڑھایا اور زکریا کو اس کا سرپرست بنایا۔ جب جب زکریا محراب میں اس کے پاس جاتا وہاں رزق پاتا، اس نے پوچھا اے مریم یہ چیز تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے۔ اس نے کہا یہ اللہ کے پاس سے ہے۔ بے شک اللہ جس پر چاہے بے حساب فضل فرماتا ہے۔ ۳۵-۳۷

اس وقت زکریا نے اپنے رب کو پکارا۔ اس نے دعا کی اے میرے پروردگار! تو مجھے بھی اپنی جناب سے پاکیزہ اولاد عطا فرما، بے شک تو دعا سننے والا ہے۔ تو فرشتوں نے اس کو ندا دی جب کہ وہ محراب میں نماز میں کھڑا تھا کہ اللہ تجھ کو یحییٰ کی خوش خبری دیتا ہے، جو اللہ کے ایک کلمہ کے مصداق، سردار، لذاتِ دنیا سے کنارہ کش اور زمرۂ صالحین

سے نبی ہوں گے۔ اس نے کہا اے میرے رب میرے ہاں لڑکا کیسے ہوگا، میں تو بوڑھا ہو چکا اور میری بیوی بھی بانجھ ہے؟ فرمایا، اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس نے کہا اے میرے رب تو میرے لیے کوئی نشانی ٹھہرا دے۔ فرمایا تیرے لیے نشانی یہ ہے کہ تو تین دن لوگوں سے بات نہ کر سکے گا مگر اشارے سے۔ اور اپنے رب کو بہت زیادہ یاد کیجیو اور صبح و شام اس کی تسبیح کیجیو۔ ۳۸-۴۱

اور جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ نے تم کو برگزیدہ کیا۔ تم کو پاک کیا اور تم کو دنیا کی عورتوں پر ترجیح دی۔ اے مریم اپنے رب کی فرمانبرداری میں لگی رہو اور رکوع سجدہ کرنے والوں کے ساتھ سجدہ اور رکوع کرتی رہو۔ ۴۲-۴۳

یہ غیب کی خبروں میں سے ہیں جو ہم تم کو وحی کر رہے ہیں اور تم تو ان کے پاس موجود نہیں تھے جب وہ اپنے قرعے ڈال رہے تھے کہ کون مریم کی سرپرستی کرے اور تم اس وقت بھی ان کے پاس موجود نہ تھے جب وہ آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ ۴۴

۱۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰٓى اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّاٰلَ اِبْرٰهِيْمَ وَاٰلَ عِمْرٰنَ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝ ذُرِّيَّةًۢ بَعْضُهَا مِنْۢ بَعْضٍ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۳۳-۳۴)

حضرت مسیحؑ کا خاندان

آدم، نوح اور ابراہیم (علیہم السلام) یہ سلسلہ نبوت و رسالت کے اساطین و عمائد ہیں۔ ان کا ذکر ہو گیا تو گویا نبوت کے پورے مبارک سلسلے کا ذکر ہو گیا۔ حضرت ابراہیم کے ذکر کے ساتھ ان کے آل کے ذکر نے ان دونوں شاخوں کو جمع کر دیا جو ان سے پھوٹی ہیں۔ یعنی حضرت اسحاق کی شاخ کا بھی، جس کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور حضرت اسماعیلؑ کی شاخ کا بھی جس میں خاتم الانبیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ آلِ ابراہیم کے بعد آلِ عمران کا ذکر یہاں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ اس خاندان مبارک کا ذکر ہے جس میں حضرت مریمؑ کی ولادت باسعادت ہوئی۔ عمران بن ماتان، حضرت مریمؑ کے والد ماجد کا نام ہے۔

یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے جدامجد ہیں۔ اس سارے شجرے کے ذکر سے مقصود یہ دکھانا ہے کہ حضرت عیسیٰ بھی اسی سلسلۂ مبارک کی ایک کڑی ہیں، ان کی والدہ، ان کے نانا اور ان کے دوسرے اجداد سب معلوم ہیں۔ یہ سارے خاندان ایک دوسرے سے وابستہ و پیوستہ اور ایک دوسرے کی ذرّیت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ پھر اسی خاندان سے اٹھے ہوئے ایک شخص کو الوہیت کے مقام پر پہنچا دینے کے کیا معنی؟

'وَاللّٰہُ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جن لوگوں کو نبوّت و رسالت کے لیے انتخاب فرمایا، یہ انتخاب تمام تر سمع و علم پر مبنی تھا، اس نے جن کو اس منصب کے لیے اہل پایا ان کو اس کے لیے انتخاب فرمایا۔ اس چیز کا انحصار تمام تر اہلیت و صلاحیت اور اللہ تعالیٰ کی حکمت و مصلحت پر ہے، اس میں کسی خاندان کے شرفِ ذاتی کو کوئی دخل نہیں ہے، جیسا کہ شرفِ نسبی کے گھمنڈ میں مبتلا ہونے والوں نے گمان کیا۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ (۳۵)

حضرت مریمؑ کی ابتدائی سرگزشت

اوپر کی آیت میں آلِ عمران کا شجرہ نسب واضح کرنے کے بعد اب یہ حضرت مریمؑ کی ولادت کا ذکر فرمایا کہ جب یہ ابھی ماں کے پیٹ ہی میں تھیں تو ان کی والدہ۔ عمران کی بیوی نے یہ منّت مانی تھی کہ اس پیدا ہونے والے بچے کو اللہ تعالیٰ کے لیے نذر کر دوں گی۔ کسی بچے کو اللہ تعالیٰ کے لیے نذر کرنے کا مقصد بنی اسرائیل میں یہ ہوتا تھا کہ اس کو معبد کی خدمت کے لیے خاص کر دیا جائے گا۔

'مُحَرَّرًا' کے معنی ہیں آزاد کر کے۔ یعنی بڑے ہونے پر اس بچے پر گھر در اور کمانے کھلانے کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوگی، اس کی ساری زندگی صرف بیت المقدس کی خدمت ہی کے لیے وقف ہوگی۔ آگے آ رہا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کو توقع لڑکے کی ولادت کی تھی لیکن پیدا ہوئی لڑکی۔ یہ چیز ان کے لیے موجبِ تردد ہوئی کیونکہ ہیکل کی خدمت کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کے لینے کا رواج نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت مریمؑ کی والدہ کی نذر قبول فرمائی اور وہ ہیکل میں داخل کر لی گئیں ——— حضرت مریمؑ کی یہ ابتدائی سرگزشت اور آگے کے حالات کے بیان کرنے سے مقصود یہ واضح کرنا ہے کہ جس اللہ کی بندی کی زندگی پیدا ہونے کے پہلے ہی سے خدا اور اس کے ہیکل کی خدمت اور اللہ کی عبادت و اطاعت کے لیے وقف ہو چکی تھی اور پیدا ہونے کے بعد سے دمِ واپسیں تک اس کے لیے وقف رہی یہ کیسی خرو باختگی ہے کہ اس کو خدا کی بندی کے بجائے نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا گیا۔

فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی ؕ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ ؕ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی ۚ وَاِنِّیْ سَمَّیْتُهَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُهَا بِکَ وَذُرِّیَّتَهَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (۳۶)

'اِنِّیْ وَضَعْتُهَا اُنْثٰی' سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ حضرت مریم کی والدہ کو، جیسا کہ اوپر گزرا، توقع فرزند

کی ولادت کی تھی اور اسی توقع پر انھوں نے منت مانی تھی لیکن ولادت، توقع کے خلاف، لڑکی کی ہوئی۔ اس پر انھوں نے اپنے رب کے حضور اپنے تردد کا اظہار فرمایا کہ یہ تو میں لڑکی جنی ہوں اور بہرحال وہ بچہ جس کو میں نے تیری نذر گمان کیا تھا، میرے خیال کے مطابق لڑکا تھا، یہ لڑکی اس کا بدل تو نہیں ہو سکتی لیکن اس پر بھی اگر تو یہ نذرِ حقیر قبول فرمائے تو یہ تیرا فضل ہی فضل ہوگا۔

'وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ' (اور اللہ خوب جانتا تھا اس چیز کو جو وہ جنی تھی) یہ حضرت مریمؑ کی والدہ کی بات کے بیچ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک جملہ معترضہ ہے۔ والدۂ مریمؑ کا یہ کہنا کہ اِنِّیْ وَضَعْتُهَآ اُنْثٰی (میں تو یہ لڑکی جنی ہوں) نومولود سے متعلق ایک کہتری کے احساس کی غمازی کر رہا تھا اور انھیں اللہ تعالیٰ کے حضور میں اپنا یہ ہدیہ بہت حقیر محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت درجہ رافت و رحمت سے یہ واضح فرمایا کہ والدۂ مریمؑ تو مریمؑ کو ایک لڑکی ہونے کی بنا پر نہایت حقیر چیز سمجھ رہی تھیں لیکن اللہ کو خوب علم تھا کہ لڑکی کی صورت میں ان کے پیٹ سے کیسی عظیم اور بابرکت ہستی ظہور میں آئی ہے!

'وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْاُنْثٰى' یہ والدۂ مریمؑ کی بات کا حصہ ہے اور اس کا مطلب وہی ہے جو ہم اوپر بیان کر چکے ہیں، یعنی کہاں وہ لڑکا جو ذہن میں تھا اور کہاں یہ لڑکی جو وجود میں آئی۔ یہ اس کا بدل تو نہیں ہو سکتی تاہم تو قبول فرمائے تو تیری نوازش۔

'وَاِنِّیْٓ اُعِيْذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ' یہ دعا والدۂ مریمؑ کی طرف سے مریمؑ اور ان کی اولاد کے لیے ایک فطری چیز ہے۔ مقصود اس ذکر سے یہ ہے کہ جس لڑکی کی ماں اپنی لڑکی اور اس کی اولاد کے لیے یہ دعا مانگتی ہے اور جس کو خدا کے حضور نذر کی حیثیت سے پیش کرتے ہوئے اس درجہ کہتری کا احساس اس کے اندر پیدا ہوتا ہے اسی کو نصاریٰ بعد میں خدا کی ماں کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ قرآن کا مقصد اس ساری سرگزشت کے پیش کرنے سے یہی ہے کہ واقعات کی اصل نوعیت سامنے لا کر وہ لوگوں کو دکھائے کہ کس طرح سیدھے سادے واقعات کو ایک افسانہ بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُوْلٍ حَسَنٍ وَّاَنْۢبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَّكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۭ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ ۙ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا ۚ قَالَ يٰمَرْيَمُ اَنّٰى لَكِ هٰذَا ۭ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَاۗءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ (۳۷)

حضرت مریمؑ کا روحانی فضل و کمال

فَتَقَبَّلَهَا الآیہ یعنی والدۂ مریمؑ کو ان کے لڑکی ہونے کی بنا پر جو احساس تھا اس کے برعکس اللہ تعالیٰ نے اپنے حسنِ قبولیت سے ان کو نوازا، ان کی تمام عقلی، اخلاقی، روحانی صلاحیتیں خوب پروان چڑھیں۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فضل ہوا کہ ان کی کفالت و تربیت کی ذمہ داری حضرت زکریا نے اٹھائی جو حضرت مریمؑ کے خالو بھی تھے اور اس دور میں بیت المقدس کے اسرائیلی اصطلاح میں کاہنِ اعظم بھی۔

'کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا' محراب سے مراد یا تو معبد کا وہ حصّہ ہو جو عورتوں کی عبادت اور اعتکاف کے لیے مخصوص تھا یا کوئی خاص گوشہ اور حجرہ جو حضرت مریمؑ کے لیے خاص کیا گیا ہو۔ بیت المقدس میں اس طرح کے حجرے اور گوشے عبادت گزاروں کے لیے بنے ہوئے تھے۔ 'کُلَّمَا دَخَلَ عَلَیْهَا زَکَرِیَّا الْمِحْرَابَ' سے بیک وقت دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حضرت زکریا حضرت مریم کی دیکھ بھال کے لیے اکثر ان کے پاس جاتے رہتے تھے، دوسری یہ کہ حضرت مریم اپنا سارا وقت محراب میں، ذکر و عبادت میں، گزارتی تھیں۔

'وَجَدَ عِنْدَهَا رِزْقًا' سے حضرت مریم کے غیر معمولی روحانی کمال کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحبِ کمال بھی ان کے پاس جاتے تو ان کے کمالِ روحانی کے نفحات محسوس کرتے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعجاب و تحسین کے طور پر یہ بھی پوچھ بیٹھے کہ اے مریم! یہ چیزیں تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہیں۔

'رزق' سے مراد حکمت و معرفت ہیں

'رزق' سے مراد یہاں حکمت و معرفت ہے۔ قرآن نے وحی و ہدایت کے لیے یہ لفظ ایک سے زیادہ مقامات میں استعمال کیا ہے۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ تعبیر موجود ہے۔ حضرت مسیحؑ کا ارشاد مشہور ہے کہ آدمی صرف روٹی سے نہیں جیتا بلکہ اس کلمے سے جیتا ہے جو خداوند کی طرف سے آتا ہے۔ آگے والی آیت میں آ رہا ہے کہ حضرت زکریا حضرت مریم کی علم و معرفت کی باتوں سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے پیرانہ سالی میں، بیوی کے بانجھ ہونے کے باوجود، اپنے لیے بھی ایسی ہی اولادِ صالح کی دعا مانگی — ظاہر ہے کہ حضرت زکریا جیسے صاحبِ معرفت کو سیب و انگور والا رزق اس درجہ متاثر نہیں کر سکتا تھا کہ وہ یہ کرشمہ دیکھ کر اولاد کی دعا شروع کر دیں۔ اس طرح کی باتیں اربابِ کمال کے ہاں کوئی خاص درجہ و مرتبہ نہیں رکھتی ہیں۔ حضرت زکریا جیسے صاحبِ کمال تو متاثر ہو سکتے تھے تو کسی ایسے ہی رزقِ روحانی سے متاثر ہو سکتے تھے جو خود ان کی اشتہائے روحانی کو بھی بھڑکا دے، جس کو دیکھ کر وہ بھی عش عش کر اٹھیں اور جو ان کے اندر بھی یہ تمنا پیدا کر دے کہ کاش ان کی نسل سے بھی کوئی اس کمال کا حامل اٹھے۔

'اَنّٰی لَکِ هٰذَا' (یہ چیز تمھیں کہاں سے حاصل ہوتی ہے؟) بغرض استفسار و تحقیق نہیں بلکہ بطور استعجاب و تحسین کے ہے۔ جب کسی کا کمال اس کی عمر کے اعتبار سے بہت زیادہ اور متکلم کے گمان و خیال سے بہت بڑھ کر ہو تو اس طرح کا استعجاب قدرتی ہے۔ یہ استعجاب اظہارِ تحسین کا ایک اسلوب ہے۔ اس سے حضرت زکریا کی تواضع اور قدر دانی کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ اپنی ایک زیرِ تربیت لڑکی کو، جس کی عمر ابھی کچھ بھی نہیں ہے، اس کی صلاحیتوں پر کس فیاضی سے داد دے رہے ہیں۔ حضرت مریم کا جواب 'هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ' بھی اس کم سنی میں ان کی پختگیِ عقل کا شاہد ہے کہ انھوں نے اس سب کو اللہ کا فضل و احسان قرار دیا، اس کو اپنے زہد و ریاضت کا کرشمہ نہیں قرار دیا۔ اِنَّ اللّٰهَ یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ، ہمارے نزدیک حضرت مریمؑ کے جواب کا حصّہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ تعالیٰ

کی طرف سے حضرت مریم کی تحسین اور اپنے فضل بے پایاں کا اظہار ہے۔ بِغَیْرِ حِسَاب کا مفہوم ہم اوپر واضح کر آئے ہیں۔

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهُ قَالَ رَبِّ هَبْ لِي مِن لَّدُنكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً إِنَّكَ سَمِيعُ الدُّعَاءِ (۳۸)

حضرت یحییٰؑ کی ابتدائی سرگزشت

'هُنَالِكَ' سے اس بات کا اظہار ہو رہا ہے کہ حضرت مریم کی حیرت انگیز حکمت و معرفت سے حضرت زکریا اس درجہ متاثر ہوئے کہ اولاد کی آرزو جو ان کے اندر دبی ہوئی تھی وہ دفعتہً بھڑک اٹھی کہ کاش حکمت و معرفت کا کوئی ایسا ہی وارث اللہ تعالیٰ ان کو بھی بخشے۔ چنانچہ اس کے لیے انھوں نے اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ 'مِن لَّدُنكَ' کے الفاظ سے یہ ظاہر ہو رہا ہے کہ اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ ہونے کی وجہ سے ظاہری حالات کو تو وہ غیر مساعد پا رہے تھے لیکن اللہ تعالیٰ سے یہ امید رکھتے تھے کہ وہ اگر چاہے تو اس کے فضل و قدرت سے ایک بوڑھے کی تمنا بھی بر آ سکتی ہے اور ایک بڑھیا بانجھ کی گود بھی ہری ہو سکتی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں، اصل چیز تو خدا کی قدرت اور اس کی عنایت ہے۔

فَنَادَتْهُ الْمَلَائِكَةُ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ أَنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيَىٰ مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَسَيِّدًا وَحَصُورًا وَنَبِيًّا مِّنَ الصَّالِحِينَ (۳۹)

ملائکہ کے جمع لانے کی وجہ

مَلَائِكَة کا لفظ یہاں اور خاص اس سیاق میں جہاں جہاں بھی آیا ہے جمع کی صورت میں آیا ہے۔ اس کی وجہ ہمارے نزدیک یہ ہے کہ حضرت زکریا نے ہاتفِ غیبی کی ندا سنی، تعین کے ساتھ انھوں نے فرشتے کو نہیں پہچانا، اس ابہام کے سبب سے قرآن نے کسی خاص فرشتہ کے بجائے فرشتوں کا ذکر فرمایا ہے جس سے یہ بات تو نکلتی ہے کہ زکریا کو جو آواز سنائی دی وہ ملکوتی تھی لیکن ساتھ ہی اس بات کا بھی اظہار ہو رہا ہے کہ یہ محض ایک غیبی آواز تھی جو ان کے کانوں میں پڑی۔

'وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ' یعنی ہاتفِ غیبی کی یہ آواز انھیں اس وقت سنائی دی جب وہ حجرے کے اندر نماز میں کھڑے تھے۔ یہ ایک قرینہ تھا اس بات کا کہ یہ آواز ملکوتی ہی ہو گی اس لیے کہ نماز کی حالت فرشتے کے قرب و اتصال کے لیے سب سے زیادہ موزوں ہے۔ ایک اور اشارہ اس سے یہ بھی نکلتا ہے کہ دعا و مناجات اور اپنے رب سے راز و نیاز کے لیے سب سے زیادہ موزوں وقت وہ ہوتا ہے جب بندہ نماز میں ہوتا ہے۔ اسی سے نماز میں زندگی اور حرارت پیدا ہوتی ہے اور یہی نماز ہماری زندگی کا ربط براہ راست ہمارے خالق و مالک سے قائم کرتی ہے۔ قرآن میں تمام مشکلات و مسائل کے اندر نماز کی جو تاکید پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو کی جاتی ہے اس سے بھی یہی بات نکلتی ہے کہ زندگی کی مشکلات کے حل کی کلید اسی کے اندر ہے۔ احادیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی نمازوں کی جو تفصیلات ملتی ہیں ان سے بھی یہی انداز ہوتا ہے کہ ان کی نمازیں فی الواقع خدا سے راز و نیاز کی نمازیں تھیں، ان کی تمام دعائیں اور فریادیں نماز کے

سجدوں اور قیام میں ہوتی تھیں اور وہ اپنی نمازوں سے جب لوٹتے تھے تو اپنے دامن اور اپنی جھولیاں بھر کے لوٹتے تھے۔ ان کے لیے نماز زندگی کی ایک ایسی ہی ضرورت تھی جس طرح پیاسوں کو گھاٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری نمازوں کے اندر یہ شان باقی نہیں ہے۔ اب نمازیں صرف رسم داری کی نوعیت کی چیز بن کر رہ گئی ہیں، زندگی سے ان کا کوئی تعلق باقی نہیں رہا ہے۔ اب ہم نمازیں تو بے جان اور بے روح پڑھتے ہیں اور لمبی لمبی دعائیں نمازوں سے فارغ ہو کر مانگتے ہیں، حالانکہ مانگنے کا اصلی وقت نمازوں میں ہوتا ہے جب کہ بندہ اپنے رب کے حضور میں ہوتا ہے۔

'اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکَ بِیَحْیٰی الآیہ' یہ وہی حضرت یحییٰؑ ہیں جن کا نام انجیلوں میں یوحنا آیا ہے۔ انجیلوں کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرت عیسٰیؑ سے صرف چھ ماہ پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ان کی تین خصوصیات بیان کی گئی تھیں۔

'کلمۃ من اللہ' کی تصدیق

ایک یہ کہ وہ 'مُصَدِّقًا بِکَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ' ہوں گے، یعنی اللہ تعالیٰ کے ایک کلمہ کی تصدیق کریں گے اور اس کی بشارت دیں گے۔ 'کَلِمَۃٍ مِّنَ اللّٰہِ' سے مراد حضرت عیسٰی علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ آگے آیت ۴۵ میں تصریح کے ساتھ ان کا ذکر اسی لقب سے ہوا ہے یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ ۴۵-اٰلِ عمران (اے مریم اللہ تم کو اپنے ایک کلمے کی بشارت دیتا ہے جس کا نام عیسٰی بن مریم ہوگا) حضرت عیسٰیؑ کو کلمۃ اللہ کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کی ولادت اسباب کے عام ضابطے کے خلاف اللہ تعالیٰ کے کلمہ 'کن' سے ہوئی۔ 'کلمۃ' کی تنکیر سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان گنت کلمات میں سے حضرت عیسٰیؑ بھی ایک کلمہ ہیں۔ جس طرح اس کائنات کی بے شمار چیزیں مجرد کلمہ 'کن' سے ظہور میں آئی ہیں اسی طرح حضرت عیسٰی علیہ السلام بھی اس کلمہ سے ظہور میں آئے ہیں۔ اس سے نصاریٰ کے ایک دعوے کی تردید ہو رہی ہے۔ وہ یہ کہ وہ کہتے ہیں کہ کلمۃ اللہ صرف حضرت مسیحؑ ہیں اور پھر اس سے ان کی الوہیت کا عقیدہ ثابت کرتے ہیں۔

'بِکَلِمَۃٍ' کی 'ب' اس بات کا قرینہ ہے کہ یہاں تصدیق کا لفظ بشارت کے مفہوم پر بھی مشتمل ہے۔ یعنی حضرت یحییٰؑ، حضرت عیسٰیؑ کی تصدیق بھی کریں گے اور ان کی بشارت بھی دیں گے۔ انجیلوں سے ثابت ہے کہ انھوں نے یہ دونوں فرض انجام دیئے۔ انھوں نے خود اپنی زندگی کا جو مشن واضح کیا وہ یہی تھا کہ وہ آنے والے کی راہ صاف کرنے آئے ہیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنے اس مشن کی تکمیل کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ ان کی زندگی سراپا سیدنا مسیحؑ کی تصدیق تھی۔ ان کی ولادت بھی سمجھیے کہ ایک پہلو سے حضرت مسیحؑ کی ولادت کی طرح خارق عادت ہی تھی۔ زہد و توکل اور تجرد میں بھی ہو بہو اپنے بعد آنے والے کا نقش اوّل تھے اور منادی تو انھوں نے جس شان سے حضرت عیسٰیؑ کی کی ہے واقعہ یہ ہے کہ اس سے دشت و جبل گونج اٹھے۔

نبی اپنی فطرت اور دعوت کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے

دوسری یہ کہ وہ "سیّد" ہوں گے۔ سیّد کے معنی سردار کے ہیں۔ نبی اپنی فطرت، اپنی دعوت اور اپنے مشن کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ وہ داعی بن کر لوگوں کو پکارتا، منذر بن کر لوگوں کو جگاتا اور ہادی و مرشد بن کر لوگوں کی رہنمائی کرتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ قدرت کی طرف سے تمام لوازم و اسلحہ سے مسلح ہوتا ہے۔ اس کا سینہ خلق کے لیے شفقت و رافت سے لبریز ہوتا ہے، اس کے کلام میں بے پناہ سطوت و جلالت ہوتی ہے، اس کی آواز اور اس کے انداز میں ہیبت ہوتی ہے، اس کی تابناک پیشانی اس کی عظمت و صداقت کی گواہی دیتی ہے۔ اگرچہ وہ کمل کی پوشاک پہنتا ہو اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتا ہو لیکن اس کے رعب و دبدبہ سے بادشاہوں پر لرزہ طاری ہوتا ہے[1]۔ وہ حق کے لیے ان کو بھی اسی طرح سرزنش کرتا ہے جس طرح دوسروں کو کرتا ہے۔ انجیلوں میں حضرت یحییٰؑ اور حضرت عیسیٰؑ دونوں حضرات کے متعلق آتا ہے کہ وہ 'با اختیار' کی طرح بات کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے کلام میں با اختیاری کی یہ شان ان کی اس منصبی سرداری ہی کا ایک جلوہ تھی۔ اس کی تحویل میں قدرت کی طرف سے ایک گلہ بھی ہوتا ہے جس کی چرواہی اس کے سپرد کی جاتی ہے اور اس بات سے اس کی حیثیت عرفی میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا کہ گلے نے اس کی اطاعت کی یا نہیں کی۔ اگر اس نے اپنا فرض ادا کیا تو اس نے سرداری کا حق ادا کر دیا اور یہی اس سے مطلوب ہوتا ہے۔

اس لفظ سے اس گمان کی پوری پوری تردید ہو رہی ہے کہ حضرت یحییٰؑ کوئی راہب تھے اور ان کی زندگی خلق سے الگ تھلگ تھی۔ وہ اپنی ذات کے معاملے میں بلاشبہ زاہد تھے لیکن ان کی زندگی کا لمحہ لمحہ اس توبہ کی منادی کے لیے وقف تھا جس کے لیے وہ مامور ہوئے تھے اور اسی راہ میں انھوں نے اپنا سر کٹوا دیا۔

'حصور' کا مفہوم

تیسری یہ کہ وہ 'حصور' ہوں گے۔ حصور، حصر سے فعول کے وزن پر ہے جس کے لغوی معنی ہوں گے اپنے آپ کو گھیرے رکھنے والا۔ یہیں سے اس کا استعمال اس شخص کے لیے ہوا جو لذات دنیا سے منقطع اور اپنے آپ کو کامل ضبط میں رکھنے والا ہو۔ یوں تو یہ ضبطِ نفس اس سرداری کی خصوصیات میں سے ہے جس کا ذکر اوپر ہوا اس لیے کہ جو اپنے آپ کو ضبط میں رکھ سکے گا وہی خلق کو بھی ضبط میں رکھنے والا بن سکے گا۔ لیکن حضرت یحییٰؑ و حضرت مسیحؑ دونوں نبیوں کی زندگیاں بالکل درویشانہ تھیں، انھوں نے زندگی کی ان لذتوں سے بھی فائدہ نہیں اٹھایا جو عام حالات میں کسی درجے میں بھی داخل دنیاداری نہیں قرار دی جا سکتیں لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان حضرات کے حالات خاص تھے۔ ان کے

---

[1] انجیل میں ہے کہ حضرت یحییٰ کمل کی پوشاک پہنتے تھے اور جنگلی شہد اور ٹڈیوں پر گزارہ کرتے تھے لیکن وقت کے حکمراں کو انھوں نے اس کی ایک بے ہودگی پر سخت سرزنش کی۔

زمانے میں یہود پر دنیا کی محبت اتنی غالب آگئی تھی کہ ان کا رخ موڑنے کے لیے ان کو زندگی کا ایک بالکل زاہدانہ و درویشانہ نمونہ دکھانا پڑا۔ یہ علاج بالضد کی ایک شکل ہے جو جسمانیات کی طرح روحانیات و اخلاقیات میں بھی خاص حالات میں اختیار کرنی پڑتی ہے۔ مقصود تو اس سے یہ ہوگا کہ یہ امت بالتدریج اس نقطۂ اعتدال کو اختیار کرنے کے قابل بنے جو بالآخر اللہ کے آخری دین میں ان کے سامنے آنے والا تھا لیکن نصاریٰ نے ان کے اس زہد کو رہبانیت کا رنگ دے دیا اور بعد کے زمانوں میں رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔

نبیا من الصالحین کا مفہوم

چوتھی یہ کہ وہ نبی ہوں گے۔ نبی کا مفہوم واضح ہے۔ البتہ اس کے ساتھ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ کی جو وضاحت ہے اس سے مقصود ان کے زمرے کو بتانا ہے کہ وہ باہمہ صفات و کمالات تھے زمرۂ صالحین ہی میں سے، یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی مقام حاصل ہوگیا ہو۔ درآنحالیکہ کمالات و فضائل کے علاوہ حضرت عیسیٰؑ سے رشتہ داری کا تعلق بھی رکھتے ہیں اور ان کی ولادت بھی حضرت عیسیٰؑ کی ولادت سے بہت اشبہ ہے بلکہ انجیلوں سے تو یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ انھی نے حضرت عیسیٰؑ کو بپتسمہ دیا اور حضرت عیسیٰؑ نے ان کی بابت فرمایا کہ ماؤں نے جن کو جنا ان میں یوحنا سے بڑا کوئی نہیں۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ۭ قَالَ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ (۴۰)

سوال طلب تصدیق کے لیے

یہ سوال تعجب یا شک یا انکار کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ یہ نہایت حسین و بلیغ انداز سے طلب تصدیق ہے۔ ان کے سامنے اس بشارت کے ظاہر ہونے میں جو رکاوٹیں تھیں وہ بیان کر کے حضرت زکریا نے چاہا کہ یہ تصریح کرالیں کہ ان رکاوٹوں کے باوجود یہ بشارت ظاہر ہونے کی شکل یہ ہوگی۔ كَذٰلِكَ اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَاۗءُ۔ یہ بات یوں ہی ہوگی۔ یعنی اللہ کا ارادہ یوں ہی ہے کہ یحییٰؑ کی ولادت بوڑھے باپ اور بانجھ ماں کے ہاں ہو۔ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہی ہے۔ اسباب تو محض ظاہر کا پردہ ہیں۔ اللہ چاہے تو پتھر کے اندر سے پانی کے چشمے جاری ہو سکتے ہیں اور صحرا کے سینے سے حجاب اٹھ سکتے ہیں۔ قرآن میں اس قسم کا سوال و جواب حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت میں بھی منقول ہے۔ اس کی نوعیت بھی بعینہٖ یہی ہے۔

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ۭ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ۭ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ (۴۱)

اس بات کی نشانی کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہے

حضرت زکریا نے یہ باتیں ایک ہاتف غیبی سے سنی تھیں اور اچھی ساعت اور اچھے حالات میں سنی تھیں اس وجہ سے ان کو گمان تو یہی تھا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے۔ لیکن وہ نہایت متواضع، متقی اور محتاط بندے تھے اس وجہ سے دل کے ایک گوشے میں کھٹک یہ بھی تھی کہ ممکن ہے

یہ اپنے ہی گنبدِ دل کی صدائے بازگشت سنائی دی ہو، ممکن ہے اس کے اندر نفس کی مخفی آرزوؤں کو کوئی دخل ہو جس سے شیطان نے کوئی فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہو، اس وجہ سے انھوں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اے رب میرے لیے کوئی ایسی نشانی ٹھہرا دے جس سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت تیری ہی طرف سے ہے، اس میں نفس یا شیطان کا کوئی دھوکا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست منظور فرمائی اور فرمایا کہ تمھارے لیے نشانی یہ ہے کہ تم تین شبانہ روز کسی سے کوئی بات زبان سے نہ کر سکو گے، صرف اشارے سے کر سکو گے، البتہ اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اس کی تسبیح کر سکو گے سو اس دوران میں زیادہ سے زیادہ اللہ کا ذکر کرنا اور شام و صبح اپنے پروردگار کی تسبیح میں مشغول رہنا۔

ظاہر ہے کہ ایک خاص مدت کے لیے آدمی پر ایک ایسی حالت کا طاری ہو جانا کہ وہ زبان سے کوئی دنیوی قسم کی بات تو نہ کر سکے لیکن تسبیح و تہلیل کر سکے کسی شیطانی تصرف کا نتیجہ نہیں ہو سکتی، یہ ہو سکتی ہے تو رحمانی تصرف ہی کا کرشمہ ہو سکتی ہے۔ کسی شیطانی اثر سے یہ بات پیدا ہوتی تو اس کا نتیجہ اس کے بالکل برعکس ظاہر ہونا تھا، یعنی آدمی اپنی دنیاداری کی باتیں تو کر سکتا لیکن اللہ اللہ کرنا اس پر شاق گزرتا۔ اگر حضرت زکریا پر یہ حالت غیر اختیاری طور پر طاری کر دی گئی تو یقیناً یہ اس بات کی ایک قطعی نشانی تھی کہ ان کو بیٹے کی جو بشارت ملی ہے من جانب اللہ ہے، اس میں شیطانی دھوکے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں ضمناً اس بات کی تردید بھی کر دی جو انجیل لوقا میں بیان ہوئی ہے کہ حضرت زکریا کو جو یہ حالت پیش آئی وہ ان کے اس جرم کی سزا کے طور پر تھی کہ انھوں نے فرشتے کی بات کا اعتبار نہ کیا اور سوال کر بیٹھے کہ مجھے اس کی کوئی نشانی دی جائے۔

جو لوگ قرآن کے اسلوبِ بیان سے اچھی طرح آشنا نہیں ہیں ان کو ممکن ہے یہ شبہ پیش آئے کہ آیت میں یہ تو مذکور ہے کہ تم تین دن کسی سے بجز اشارہ کے بات نہ کر سکو گے لیکن اس بات کی تصریح نہیں ہے کہ ذکر و تسبیح کر سکو گے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ آیت میں اس تصریح کی جگہ تسبیح و تہلیل کی ہدایت رکھ دی گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ہدایت اسی لیے کی گئی ہے کہ وہ یہ کام کر سکتے تھے۔ اگر اس ہدایت کے ساتھ وہ تصریح بھی ہوتی تو یہ ایک بے فائدہ طوالت ہوتی جو قرآن کی بلاغت کے شایانِ شان نہیں ہے۔

'بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْکَارِ' اور اس قسم کے دوسرے اسالیب، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ احاطہ کے مفہوم پر دلیل ہوتے ہیں، جس طرح ہم بولتے ہیں صبح و شام، رات دن اللہ کو یاد رکھو۔

• وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰکِ وَطَہَّرَکِ وَاصْطَفٰکِ عَلٰی نِسَآءِ الْعٰلَمِیْنَ ۝ یٰمَرْیَمُ اقْنُتِیْ لِرَبِّکِ وَاسْجُدِیْ وَارْکَعِیْ مَعَ الرّٰکِعِیْنَ (۴۲-۴۳)

'اِصْطِفَاء' کے معنی چھانٹنے اور انتخاب کرنے کے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا مفہوم اللہ تعالیٰ

حضرت مریمؑ کا اصطفا کس کام کے لیے تھا

کا اپنے کسی بندے کو کسی کارِ خاص کے لیے منتخب کر لینا ہے۔ حضرت مریم کو اللہ تعالیٰ نے اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ یہ نشانی ایک بہت بڑی خدائی امانت بھی تھی جو ان کے سپرد ہونے والی تھی اور ساتھ ہی ایک عظیم ابتلا بھی۔ یہ چیز اس بات کی مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اس بارِ امانت کے اٹھانے کے لیے ان کی خاص تربیت فرمائے تاکہ وہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کی اہل بن سکیں۔ اسی تربیت کو یہاں 'تطہیر' سے تعبیر فرمایا ہے۔ پھر اس اصطفا کے متعلق تصریح فرمائی کہ یہ اصطفا کوئی معمولی اصطفا نہیں تھا بلکہ یہ تمام عالم کی عورتوں پر تھا۔ اصطفا کے بعد 'علیٰ' کا صلہ جب آتا ہے تو اس کے اندر ترجیح اور فضیلت کا مفہوم بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم امانت سپرد کرنے کے لیے تمام دنیا کی عورتوں میں سے انھیں کا انتخاب فرمایا۔ یہ ایک ایسا شرف ہے جس میں حضرت مریم کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔

اس بارِ امانت کی تیاریوں کے لیے ہاتفِ غیبی نے ان کو ہدایت کی کہ اُقْنُتِیْ لِرَبِّكِ الآیۃ قنوت کے معنی دوسرے مقام پر ہم واضح کر چکے ہیں کہ پوری نیازمندی اور پورے تذلل کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف جھک جانے کے ہیں۔ اس نیازمندی اور تذلل کا بہترین اظہار نماز میں ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے بعد وَاسْجُدِیْ وَارْكَعِیْ گویا 'وَاقْنُتِیْ' کے اجمال کی تفصیل ہوئی۔ بلاغت کا یہ نکتہ بھی یہاں ملحوظ رہے کہ نماز کا ذکر یہاں اس کے اہم اجزا سے ہوا ہے۔ یہ اسلوب قرآن نے جہاں جہاں اختیار کیا ہے اس سے نماز کے استغراق و انہماک، اس کی مداومت اور اس کے لیے اضطراب و بیقراری کا اظہار ہوتا ہے۔ اس نکتے کی خدا نے چاہا تو ہم آیت تَرَاهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا کی تفسیر کرتے ہوئے وضاحت کریں گے۔ اس کے ساتھ مَعَ الرّٰكِعِیْنَ کی قید باجماعت کی اہمیت کو بھی واضح کرتی ہے اور یہ اس نماز کی تصویر بھی ہے جس کی سعادت حضرت مریم کو حاصل تھی۔ وہ چونکہ ہیکل ہی میں معتکف تھیں اس وجہ سے انہیں خلوت کی نمازوں کے ساتھ ساتھ جماعت کی نمازوں کی برکات بھی حاصل تھیں۔

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْغَیْبِ نُوْحِیْهِ اِلَیْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ اَیُّهُمْ یَكْفُلُ مَرْیَمَ ۪ وَمَا كُنْتَ لَدَیْهِمْ اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ (۴۴)

ایک التفات

یہ ایک آیت اثنائے کلام میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت رکھتی ہے۔ آپ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہ غیب کی باتیں ہیں یعنی تمھارے علم و اطلاع سے باہر کی ہیں اس لیے کہ نہ تو یہ ساری باتیں تورات و انجیل ہی میں موجود ہیں اور نہ تم شخصاً ہی ان واقعات کے پیش آنے کے وقت موجود تھے، پھر اس صحت و صداقت کے ساتھ تمھارا ان واقعات کا پیش کرنا کہ اہل کتاب کی بھی آنکھیں کھل جائیں بغیر اس کے کس طرح ممکن ہوا کہ اللہ نے تم کو منصبِ رسالت سے نوازا اور شرفِ وحی سے ممتاز کیا۔ یہ اہل کتاب پر تمھاری نبوت و رسالت کی ایک بہت بڑی حجت ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ انجیلوں میں اہل کتاب کی تاریخ کا یہ حصہ تقریباً غائب ہے، بس کچھ غیر مربوط باتیں لوقا میں حضرت یحییٰؑ کے متعلق ملتی ہیں اور بعض اشارات حضرت مریمؑ کے متعلق، اور سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ حضرت مریم کا ذکر جو ہے بھی وہ ایک عام عورت کا ذکر معلوم ہوتا ہے، حد یہ ہے کہ انجیل کے بعض مقامات سے تو یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ حضرت مسیحؑ بھی ان کا اس طرح احترام نہیں کرتے تھے جس طرح ماں کا احترام کرنا چاہیئے۔ عیسائیوں نے عقیدے کے طور پر چاہے حضرت مریمؑ کو جو درجہ بھی دیا ہو لیکن انصاف یہ ہے کہ ان کا اصلی اور حقیقی شرف قرآن ہی نے نمایاں کیا ہے۔ آگے مناسب مقامات پر ہم اس مسئلے پر تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

حضرت مریمؑ کے معاملہ میں قرعہ اندازی کی نوعیت

اقلام سے مراد قرعے کے تیر ہیں۔ جوئے کے تیروں کا استعمال تو شریعت میں حرام ہے لیکن قرعے کے لیے تیروں کے استعمال میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ حقوق مساوی ہونے کی صورت میں تصفیہ نزاع کے لیے قرعے کا طریقہ بالکل جائز ہے۔ یہاں یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ قرعہ اندازی کا یہ طریقہ صرف حضرت مریم کی کفالت ہی کے باب میں اختیار کیا گیا یا دوسرے زیر تربیت خدام ہیکل کے لیے بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ ہمارے نزدیک دونوں ہی باتوں کا امکان ہے۔ اس بات کا بھی امکان ہے کہ تمام نو وارد خدام کی کفالت کا فیصلہ اسی طریقہ سے ہوتا رہا ہو اور اس کا بھی امکان ہے کہ حضرت مریم کا معاملہ لڑکی ہونے کی وجہ سے خاص نزاکت کا حامل تھا اس وجہ سے قرعہ سے اس کا فیصلہ کیا گیا ہو۔ قرعہ ایک اشارۂ غیبی پر بھی محمول کیا جاتا ہے۔ ہیکل میں اس کے خدام کے فرائض کی تقسیم کے لیے قرعہ کا طریقہ رائج تھا۔ لوقا میں ذکر ہے کہ جس روز حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت ملی ہے اس روز جس خدمت پر وہ مامور تھے اس کا فیصلہ قرعہ ہی کے ذریعے ہوا تھا۔

جھگڑا کس بات کے لیے تھا؟

'وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ إِذْ يَخْتَصِمُونَ' میں جس جھگڑے کا ذکر ہے اس کا تعلق صرف حضرت مریم کی سرپرستی سے نہیں معلوم ہوتا، ایسا ہوتا تو اس کا ذکر الگ کرنے کی ضرورت نہیں تھی بلکہ اس کو بھی پہلے ٹکڑے ہی کے تحت آنا تھا۔ ہمارے خیال میں یہ جھگڑا خدام ہیکل میں اس سوال پر ہوا ہوگا کہ ایک لڑکی ہیکل کے زمرۂ خدام میں شامل ہو سکتی ہے یا نہیں؟ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ اس کی روایت ہیکل کی تاریخ میں کم از کم معروف نہیں تھی۔ اس وجہ سے یہ سوال موجب نزاع ہو سکتا تھا۔ ویسے یہ بات بھی بعید نہیں ہے کہ محض تنافس فی الخیر اس جھگڑے کا باعث ہوا ہو اس لیے کہ ایک ایسی لڑکی کی کفالت جو معبد کی خدمت کے لیے وقف کی جا رہی ہو اور جس کی قبولیت روز اوّل سے نمایاں ہو، ایک بہت بڑی سعادت تھی جس سے محروم ہونا ہیکل کے خدام میں سے کوئی بھی پسند نہ کر سکتا تھا۔

۱۳۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۴۵-۶۳

اب یہ وہ اصل بات آ رہی ہے جو درحقیقت سورہ کا عمود ہے۔ ہم تمہید میں اشارہ کر چکے ہیں کہ

اس سورہ میں خطاب نصاریٰ سے ہے اور مقصود ان پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے باب میں حقیقتِ حال کا اظہار ہے۔ اوپر خاندانِ عمران کا شجرہ، حضرت مریم کی ولادت اور ان کے بارے میں ان کی ماں کی نذر، حضرت زکریا کی بیٹے کے لیے دعا اور حضرت یحییٰ کی ولادت کے واقعات جو بیان ہوئے ہیں، سب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ذکر کی تمہید و تقریب کے طور پر بیان ہوئے ہیں۔ اب آگے یہ بیان ہو رہا ہے کہ جس طرح فرشتے نے حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت دی تھی اسی طرح فرشتے نے حضرت مریم کو بھی بشارت دی کہ ان کے ہاں اللہ کے کلمۂ 'کن' کے ذریعے سے ایک فرزند کی ولادت ہوگی جس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ جس طرح حضرت یحییٰ کے بابت ارشاد ہوا کہ وہ سردار، ضابط، نبی اور صالح ہوں گے اسی طرح عیسیٰ بن مریم کے بابت فرمایا کہ دنیا اور آخرت دونوں میں باوقار، مقرب اور صالح ہوں گے پھر جس طرح حضرت زکریا نے اپنے بڑھاپے اور بیوی کے بانجھ پن کے باعث اس بشارت پر تعجب کا اظہار کیا اسی طرح حضرت مریم نے بھی تعجب کا اظہار فرمایا کہ جب انھیں کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا تو انھیں اولاد کس طرح ہوگی۔ فرشتے نے جو جواب حضرت زکریا کو دیا تھا وہی جواب حضرت مریم کو دیا کہ اصل چیز اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، جب وہ کسی کام کے کرنے کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو ہو جانے کا حکم دیتا ہے اور وہ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اسی کلمۂ 'کن' کے ذریعے سے وہ مسیح عیسیٰ بن مریم کو پیدا کرے گا اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے گا اور ان کو بنی اسرائیل کی طرف اپنا رسول بنا کر بھیجے گا۔

اس کے بعد تین آیتوں میں حضرت عیسیٰؑ کی زبان سے وہ ابتدائی پیغام ہے جو انھوں نے اپنی رسالت کے اثبات اور اس مقصد کے اظہار کے طور پر بنی اسرائیل کو دیا ہے۔

پھر دو آیتوں میں اس امر کا بیان ہے کہ جب بنی اسرائیل کے علما اور فقیہوں نے اپنی ضد اور ہٹ دھرمی سے آپ کو مایوس کر دیا تو آپ نے ان کو چھوڑ کر ان غریبوں کو اپنا معتمد اور ساتھی بنایا جو ان پر ایمان لائے تھے اور انھی کو اللہ کے دین کی نصرت و حمایت کے لیے کمربستہ ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ یہی غریب لوگ آپ کے ساتھی بنے اور حضرتؑ نے انھی کو تبلیغِ دین کی مہم پر روانہ کیا۔

اس کے بعد چار آیتوں میں اس ردِ عمل کا ذکر ہوا ہے جو حضرت عیسیٰؑ کی اس آخری کوشش کا بنی اسرائیل کے لیڈروں، فقیہوں اور فریسیوں پر ہوا اور ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے جس طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی مدد فرمائی اور آئندہ مدد فرمانے کا وعدہ کیا اس کا حوالہ ہے۔

اس کے بعد پانچ آیتیں التفات کی ہیں جن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے یہ واضح فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے بارے میں اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی ہے۔ اگر اس وضاحت کے بعد بھی نصاریٰ تم سے حجت کرتے رہیں تو ان سے کہو کہ آؤ مباہلہ کریں، اگر وہ اس سے بھی گریز کریں تو سمجھ لو کہ یہ پکے مفسد ہیں، ان کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت کیجیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آيات ٤٥-٦٣

إِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ إِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ
مِّنْهُ ۖ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ
وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿٤٦﴾ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ
وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ ۗ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا
يَشَآءُ ۗ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿٤٧﴾
وَيُعَلِّمُهُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ﴿٤٨﴾
وَرَسُوْلًا اِلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ اَنِّيْ قَدْ جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ
مِّنْ رَّبِّكُمْ ۙ اَنِّيْٓ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ
الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ
وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۗ
اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿٤٩﴾ وَ
مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ
بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ﴿٥٠﴾ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۗ
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿٥١﴾ فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ
قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۗ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ

اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۵۲﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا
بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿۵۳﴾
وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ۭ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۵۴﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ ع ۵ ۱۳
يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْٓا اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ
فِيْمَا كُنْتُمْ فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۵۵﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۡ وَمَا
لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۵۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ
فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۵۷﴾ ذٰلِكَ
نَتْلُوْهُ عَلَيْكَ مِنَ الْاٰيٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِيْمِ ﴿۵۸﴾ اِنَّ مَثَلَ
عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ
قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ﴿۵۹﴾ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ
الْمُمْتَرِيْنَ ﴿۶۰﴾ فَمَنْ حَاۗجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَكَ مِنَ
الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَاۗءَنَا وَاَبْنَاۗءَكُمْ وَنِسَاۗءَنَا
وَنِسَاۗءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ۣ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ
اللّٰهِ عَلَي الْكٰذِبِيْنَ ﴿۶۱﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا
مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ﴿۶۲﴾ فَاِنْ تَوَلَّوْا

فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ ﴿۶۳﴾ ع ۹ ۱۴

ترجمۂ آیات ۴۵-۶۳

یاد کرو، جب فرشتوں نے کہا اے مریم! اللہ تمھیں اپنی طرف سے ایک کلمہ کی خوشخبری دیتا ہے۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ بن مریم ہوگا۔ وہ دنیا اور آخرت دونوں میں ذی وجاہت اور اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ وہ لوگوں سے گہوارے میں بھی بات کرے گا اور ادھیڑ ہو کر بھی اور وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوگا۔ وہ بولی کہ اے میرے پروردگار میرے کس طرح لڑکا ہوگا جب کہ کسی مرد نے مجھے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ ارشاد ہوا، اسی طرح اللہ پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے۔ جب وہ کسی امر کا فیصلہ فرما لیتا ہے تو اس کو کہتا ہے کہ ہو جا سو وہ ہو جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اس کو کتاب اور حکمت، تورات اور انجیل سکھائے گا اور اس کو بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گا۔ چنانچہ اس نے بنی اسرائیل کو دعوت دی کہ میں تمھارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں ——— میں تمھارے لیے مٹی سے پرندوں کی صورت کے مانند صورت بناتا ہوں پھر اس میں پھونک مار دیتا ہوں تو وہ اللہ کے حکم سے واقعی پرندہ بن جاتی ہے اور میں اللہ کے حکم سے اندھے اور کوڑھی کو اچھا اور مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور میں تمھیں بتا سکتا ہوں جو کچھ تم کھاتے اور ذخیرہ کرتے ہو اپنے گھروں میں۔ بے شک ان باتوں کے اندر تمھارے لیے نشانی ہے اگر تم ایمان رکھنے والے ہو۔ اور میں مصداق ہوں اپنے سے پیشتر سے آئی ہوئی تورات کا اور اس لیے آیا ہوں کہ بعض ان چیزوں کو تمھارے لیے حلال ٹھہراؤں جو تم پر حرام کر دی گئی ہیں اور میں تمھارے پاس تمھارے خداوند کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں تو اللہ سے ڈرو اور میری اطاعت کرو۔ بے شک اللہ ہی میرا بھی رب ہے، تمھارا بھی رب ہے تو اسی کی بندگی کرو۔ یہی

سیدھی راہ ہے۔ ۴۵-۵۱

پس جب عیسٰی نے ان کی طرف سے کفر کو بھانپ لیا تو اس نے دعوت دی کہ کون میرا مددگار بنتا ہے اللہ کی راہ میں؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار اور آپ گواہ رہیئے کہ ہم مسلم ہیں۔ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لائے اس چیز پر جو تو نے اتاری اور ہم نے رسول کی پیروی کی سو تو ہم کو گواہی دینے والوں میں لکھ۔ ۵۲-۵۳

اور انھوں نے خفیہ چالیں چلیں تو اللہ نے بھی ان کا خفیہ توڑ کیا اور اللہ بہترین توڑ کرنے والا ہے۔ جب کہ اللہ نے کہا کہ اے عیسٰی میں تمھیں قبض کر لینے والا ہوں اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے ان سے تمھیں پاک کرنے والا ہوں۔ جن لوگوں نے تمھاری پیروی کی ہے ان کو قیامت تک کے لیے ان لوگوں پر غالب کرنے والا ہوں جنھوں نے تمھارا انکار کیا ہے۔ پھر میری طرف تم سب کا پلٹنا ہوگا اور میں تمھارے درمیان ان چیزوں کے بارے میں فیصلہ کروں گا جن میں تم اختلاف کرتے رہے ہو۔ تو جن لوگوں نے کفر کیا ان کو سخت عذاب دوں گا، دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ رہے وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنھوں نے نیک عمل کیے تو ان کو ان کا پورا اجر دے گا اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ ۵۴-۵۷

یہ ہم تمھیں سنا رہے ہیں اپنی آیات اور اپنی پر حکمت یاد دہانی میں سے۔ عیسٰی کی مثال اللہ کے نزدیک آدم کی سی ہے۔ اس کو مٹی سے بنایا، پھر اس کو امر کیا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا۔ یہی بات تمھارے رب کی طرف سے حق ہے تو تم شک کرنے والوں میں سے نہ بنو۔ سو جو تم سے اس بارے میں حجت کریں بعد اس کے کہ تمھارے پاس صحیح علم آچکا ہے تو ان سے

کہو کہ آؤ، ہم اپنے بیٹوں کو بلائیں، تم اپنے بیٹوں کو بلاؤ، ہم اپنی عورتوں کو جمع کریں تم اپنی عورتوں کو جمع کرو، ہم اپنے آپ کو اکٹھا کریں تم اپنے آپ کو اکٹھا کرو، پھر ہم مل کر دُعا کریں اور جھوٹوں پر لعنت بھیجیں۔ بے شک یہی سچا بیان ہے۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور اللہ ہی عزیز اور حکیم ہے۔ پس اگر وہ اعراض کریں تو اللہ مفسدوں کو خوب جانتا ہے۔ ۵۸-۶۳

۱۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيْهًا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ (۴۵)

'اذ' کا اعادہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں جو بات کہی جا رہی ہے یہ اس سے الگ ہے جو اوپر کہی گئی۔ پہلے حضرت مریم کو دعا اور عبادت میں مشغول ہو جانے کی تاکید ہوئی پھر کچھ عرصے کے بعد فرشتہ یہ بشارت لے کر حضرت مریم کے پاس آیا۔

'کلمہ' کا مفہوم اور اس کے نکرہ لانے کا فائدہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یہاں موقع کی رعایت سے ایک نکتہ توجہ کے لائق ہے۔ وہ یہ کہ اصل بشارت تو یہ تھی کہ حضرت مریم کے ہاں بغیر مرد کی ملاقات کے مجرد اللہ تعالیٰ کے امر و حکم سے ایک بیٹا ہوگا لیکن بات حضرت مریم سے کہی جا رہی تھی جو کنواری بھی تھیں اور شرم و حیا کی پیکر بھی۔ اس وجہ سے نہایت اختصار بلکہ ابہام کے ساتھ صرف کلمہ کی بشارت دی گئی۔ البتہ آگے حضرت عیسیٰؑ کے نام اور صفات کے ذکر سے بات واضح ہو گئی کہ کلمہ سے مراد کیا ہے۔

'مسیح' حضرت عیسیٰؑ کا لقب ہے۔ لقب کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ نام سے پہلے اس کو لاتے ہیں۔ 'مسیح' لقب ہے

بنی اسرائیل میں یہ روایت رہی ہے کہ ان کے ہاں جو نبی ہونے والا ہوتا اس کے سر پر اس کا پیشرو نبی ایک قسم کا مقدس تیل مل کر اس کو اپنا جانشین بناتا۔ جب نبوت کے ساتھ ساتھ ان کے ہاں بادشاہی کا سلسلہ شروع ہوا تو مسح کرنے کی یہی روایت بادشاہوں کے لیے بھی اختیار کی گئی۔ جو وقت کا نبی ہوتا وہ ہونے والے بادشاہ کے سر پر مقدس تیل ملتا جس سے واضح ہو جاتا کہ یہ مستقبل کا بادشاہ بھی ہے اور خدا کا برگزیدہ بھی، تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ طالوت اور حضرت داؤدؑ کو سموئیل نبی نے اسی طرح مامور کیا تھا۔ حضرت مسیحؑ کے بارے میں انجیلوں سے یہ تو ثابت ہے کہ حضرت یحییٰؑ نے ان کو بپتسمہ دیا لیکن تیل ملنے

کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ممکن ہے اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ پیدائشی مسیح تھے۔ بخاری شریف میں ان کا جو حلیہ بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر کا حال یہ تھا کہ گویا اس سے تیل ٹپک رہا ہے۔ ممکن ہے ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان کو مسیح کا لقب عنایت ہوا ہو۔ انجیل میں ان کے لیے "خدا کا مسیح" کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

'وجیہ' کا مفہوم حضرت مسیحؑ کی وجاہت کے بعض پہلو

'وجیہ' کے لفظ سے اس سرداری کی شان کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جس کا ذکر اوپر حضرت یحییٰؑ کے بیان میں گزر چکا ہے۔ لوقا کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیحؑ نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی لیکن اس کم سنی کے باوجود ان کی تعلیم کی حکمت و معرفت، کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی، سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی کے عالم میں ایک ایک سے پوچھتے پھرتے تھے کہ یہ کون ہے جو اس شکوہ سے بات کرتا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہوا ہے۔ یہودیہ کی بستیوں میں جب انھوں نے تبلیغ شروع کی تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ خلقت ان پر ٹوٹی پڑتی تھی۔ فقیہ اور فریسی سب پر ایک سراسیمگی کا عالم تھا، وہ ان کو زچ کرنے اور عوام میں ان کی مقبولیت کم کرنے کے لیے ان سے طرح طرح کے سوالات کرتے لیکن سیدنا مسیحؑ دو دو لفظوں میں ان کو ایسے دندان شکن جواب دیتے کہ پھر ان کو زبان کھولنے کی جرأت نہ ہوتی۔ تھوڑے ہی دنوں میں ان کی وجاہت کا یہ غلغلہ ہوا کہ عوام ان کو اسرائیل کا بادشاہ کہنے اور ان کی بادشاہی کے گیت گانے لگے، یہاں تک کہ رومی حکام — ہیرودیس اور پیلاطوس — کے سامنے بھی یہ مسئلہ ایک نہایت اہم مسئلہ کی حیثیت سے آگیا لیکن وہ بھی اپنی تمام قوت و جبروت کے باوجود سیدنا مسیحؑ کی عظمت و صداقت اور ان کی بے پناہ مقبولیت سے مرعوب ہو گئے۔

اس وجاہت کا دوسرا پہلو یہ ہے کہ باوجودیکہ سیدنا مسیحؑ بن باپ کے پیدا ہوئے اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچے کے لیے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا لیکن سیدنا مسیحؑ چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ 'کن' سے پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے اس کا معجزانہ اثر یہ ظاہر ہوا کہ روزِ اوّل سے ان کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل رہی جو اس عہد میں کسی کو بھی حاصل نہیں ہوئی۔ وہ زندگی بھر اپنے جانی دشمنوں میں گھرے رہے لیکن اس پہلو سے کسی کو ان پر طعن کرنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ یہود کے ایک گروہ نے اگر جسارت بھی کی تو بعد کے زمانوں میں کی، ان کے عہد مبارک میں کسی کو بھی اس قسم کی جرأت نہ ہو سکی۔ ان کی اس وجاہت کی بشارت ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریمؑ کو اس لیے دی گئی کہ ان کو اس پہلو سے کوئی خلجان نہ ہو کہ بن باپ کے پیدا ہونے کے سبب سے بچے کی یا خود ان کی وجاہت پر کوئی اثر پڑے گا۔

اس کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ اس سے ان تمام خرافات کی تردید ہو رہی ہے جو انجیلوں میں مذکور ہیں کہ یہودیوں نے سیدنا مسیح کے نعوذ باللہ طمانچے لگائے، ان کا مذاق اڑایا، ان کو گالیاں دیں، ان کے منہ پر تھوکا۔ ان خرافات کا اکثر حصہ، جیسا کہ ہم آگے واضح کریں گے، غلط ہے۔ اللہ کے رسولوں کے دشمن ان کی توہین و تحقیر کی جسارت تو کرتے ہیں اور اس سلسلے میں ایک حد تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کو ڈھیل بھی مل جاتی ہے لیکن یہ ڈھیل بس ایک خاص حد تک ہی ہوتی ہے، جب کوئی قوم اس حد سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اپنے رسول کو اپنی حفاظت میں لے لیتا ہے اور اس ناہنجار قوم کا بیڑا غرق کر دیا جاتا ہے۔ آگے اس سنت اللہ کی ہم وضاحت کریں گے۔

حضرت مسیحؑ ابن مریم ہیں

اس آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو ابن مریم کہہ کر قرآن نے ان لوگوں کے لیے گفتگو کی ہر گنجائش ختم کر دی ہے جو نہایت کمزور تاویلات کے ذریعے سے قرآن کے نہایت واضح نصوص کی تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر حضرت عیسیٰؑ کسی باپ کے بیٹے تھے تو آخر قرآن کو مسیح بن مریم کہنے کے بجائے ان کے باپ کی طرف ان کی نسبت کرنے میں کیا رکاوٹ تھی؟ قرآن بھی مسیح بن یوسف کہہ سکتا تھا لیکن اس نے ایسا نہیں کہا۔ آخر کیوں نہیں کہا؟

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا وَّمِنَ الصّٰلِحِيْنَ (۴۶)

حضرت مسیحؑ کا کلام گہوارے میں

سیدنا مسیح کا گہوارے میں بات کرنا حضرت مریم کی پاکدامنی کے اظہار کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک معجزہ تھا۔ اس معجزے کی بشارت بچے کی ولادت کی بشارت کے ساتھ ہی حضرت مریم کو اس لیے دے دی گئی کہ وہ مطمئن رہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے ان کو واسطہ بنایا ہے تو ان کے ناموس کو اعدا کی بدزبانیوں سے بچانے کے لیے بھی اس نے ایسا انتظام فرمایا ہے کہ کسی تہمت کے لیے کوئی گنجائش باقی نہیں رہے گی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر نہایت مہربان ہے، کس طرح ممکن تھا کہ وہ اپنی ایک مومنہ و قانتہ بندی کو ساری خدائی کی تہمتوں کا ہدف بنا دے اور اس کی مدافعت میں کوئی ایسی زبان نہ کھولے جو سب کی زبانیں بند کر دے۔

کہل کا مفہوم

'کہل' کے معنی ادھیڑ کے ہیں۔ موجودہ انجیلوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ادھیڑ ہونے سے بہت پہلے دنیا سے رخصت ہو گئے تھے لیکن قرآن کی اس آیت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مریم کو ضمناً حضرت عیسیٰؑ کے کہولت تک پہنچنے کی بھی بشارت دی گئی تھی۔ رسولوں کے معاملے میں اللہ تعالیٰ کی جو سنت رہی ہے اس کے لحاظ سے یہی بات صحیح معلوم ہوتی ہے۔ انجیل میں بھی بعض اشارات اس کی تائید میں ہیں۔ مثلاً یوحنا ۸: ۵۷ میں ہے۔

"اور یہودیوں نے اس سے کہا تیری عمر تو ابھی پچاس برس کی بھی نہیں ہے پھر کیا تو نے ابرہام کو دیکھا ہے؟"

ظاہر ہے کہ یہ بات ایسے ہی شخص کو مخاطب کر کے کہی جا سکتی ہے جو پچاس سال کے قریب پہنچ رہا ہو۔

گہوارے میں کلام کے ساتھ ان کے کہولت کے کلام کا حوالہ دینے سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ ان کی گہوارے کی بات بچوں کی سی نہیں ہو گی بلکہ اس کے اندر بھی پختہ سن و سال کی دانائی ہو گی اس لیے کہ یہ بات من جانب اللہ ہو گی۔

آخر میں وَمِنَ الصّٰلِحِیْنَ فرما کر، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، یہ واضح کر دیا کہ وہ صالحین کے زمرے میں سے ہوں گے یعنی ان تمام کمالات و اوصاف کے باوجود یہ نہیں ہے کہ ان کو الوہیت کا کوئی درجہ حاصل ہو جائے۔ بس وہ اللہ کے صالح بندوں میں سے ہوں گے۔

قَالَتْ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ ؕ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ؕ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ (۴۷)

آیت ۴۰ کے تحت اس آیت کے اہم اجزا کی وضاحت گزر چکی ہے۔ البتہ اس میں اس کلمہ کی وضاحت بھی ہو گئی ہے جس سے حضرت عیسیٰ کی ولادت ہوئی۔ اِذَا قَضٰۤی اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَہٗ کُنْ فَیَکُوْنُ۔ (اللہ جب کسی امر کا فیصلہ کر لیتا ہے تو اس کو حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے)

وَیُعَلِّمُہُ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَالتَّوْرٰىۃَ وَالْاِنْجِیْلَ (۴۸)

انجیل مجموعۂ حکمت ہے

تورات اور انجیل کے الفاظ یہاں کتاب اور حکمت کی تفسیر کے طور پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو ان دونوں چیزوں کی تعلیم دے گا۔ سیدنا مسیح جہاں تک کتاب و شریعت کا تعلق ہے حضرت موسیٰؑ کی شریعت ہی کے پیرو اور داعی تھے، وہ تورات سے کوئی الگ شریعت لے کر نہیں آئے تھے۔ اس حقیقت کا اعلان بار بار بڑے زور اور تاکید کے ساتھ انھوں نے خود فرمایا ہے۔ انجیلوں میں ان کی تصریحات موجود ہیں۔ البتہ انھوں نے اس شریعت کی روح اور اس کی حکمت نہایت معجزانہ انداز میں بے نقاب فرمائی ہے اور اناجیل درحقیقت ان کی انھی حکمتوں کا مجموعہ ہیں۔ یہود نے تورات کو بالکل بے روح احکام اور بے جان رسوم کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا تھا اس وجہ سے ان کی شریعت زندگی سے بالکل خالی ان کے لیے صرف ایک بوجھ بن کر رہ گئی تھی۔ حضرت مسیح نے اس کے اندر اپنی تعلیم حکمت سے زندگی پیدا کی لیکن یہود نے اس کی قدر نہ کی۔

وَرَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ ۙ اَنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ ۙ اَنِّیْۤ اَخْلُقُ لَکُمْ مِّنَ الطِّیْنِ کَہَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ فَیَکُوْنُ طَیْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ ۚ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِیْ بُیُوْتِکُمْ ؕ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ (۴۹)

نبی اور رسول میں فرق

رَسُوْلاً سے پہلے ایک فعل محذوف ہے۔ یعنی یَبْعَثُہٗ رَسُوْلاً سیدنا مسیح حضرت یحییٰ کی طرح صرف ایک نبی نہیں تھے بلکہ جس طرح حضرت موسیٰؑ فرعون اور اس کی قوم کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے اسی طرح یہ بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ رسول اور نبی میں فرق ہوتا ہے رسول جس قوم کی طرف بھیجا جاتا ہے اس کے لیے خدا کی عدالت بن کر آتا ہے۔ اس کے لازماً اس قوم کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ اگر وہ ایمان لاتی ہے تو نجات پاتی ہے اور اگر اپنے کفر پر اڑی رہ جاتی ہے اور اپنے نبی کو گزند پہنچانے کی کوشش کرتی ہے تو فنا کر دی جاتی ہے۔ اس حقیقت کی طرف حضرت یحییٰؑ نے مختلف اسلوبوں سے اشارہ فرمایا تھا۔ مثلاً یہ کہ میں تو تمھیں پانی سے بپتسمہ دے رہا ہوں، پر جو آ رہا ہے وہ تمھیں آگ سے بپتسمہ دے گا، یا یہ کہ، اب درختوں کی جڑوں پر کلہاڑا رکھا ہوا ہے؛ یا یہ کہ، اس کے ہاتھ میں اس کا چھاج ہو گا اور وہ اپنے کھلیان کو اچھی طرح پھٹکے گا اور گندم کو بھس سے علیحدہ کرے گا، اس کی پوری تفصیل دوسرے مقام میں آئے گی۔

اس سے حضرت عیسیٰ کی رسالت کا بنی اسرائیل کے لیے خاص ہونا بھی واضح ہو گیا۔ سیدنا مسیح کا خود اپنا اعلان بھی یہی ہے۔ انھوں نے جب اپنے حواریوں کو تبلیغِ دین کی مہم پر روانہ کیا تو ان کو غیر بنی اسرائیل کی طرف جانے سے نہایت صاف لفظوں میں روک دیا۔ انھوں نے فرمایا کہ میں صرف بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں ہی کی تلاش کے لیے آیا ہوں؛ ایک غیر اسرائیلی عورت ان سے دعائے شفا کی طالب ہوئی تو انھوں نے اس جواب میں یہی کہا کہ بچوں کے حصے کی روٹی کتوں کے آگے ڈالنا ٹھیک نہیں؛ انجیل میں ضیافت والی جو تمثیل ہے اس میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے۔ آپ کی دعوت جن معرفات پر مبنی تھی یہ معرفات بنی اسرائیل کے لیے دلیل و حجت بن سکتے تھے لیکن دوسری قوموں کے لیے ان کا سمجھنا ممکن نہیں تھا۔ اس وجہ سے یہ دعوت اپنی فطرت ہی کے لحاظ سے دوسری قوموں کے لیے بالکل ناموزوں تھی۔ چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ دوسری قوموں نے، جن کے سامنے یہ دعوت پیش گئی، اس کو بالکل نہیں سمجھا۔ انھوں نے انجیلوں سے بس یہ سمجھا کہ حضرت عیسیٰ نے بے شمار معجزے دکھائے ہیں۔ اس کا جو اثر ان پر پڑا وہ یہ کہ انھوں نے ان معجزات کے بل پر ان کو ایک معبود بنا کر رکھ دیا۔

سرگزشتوں کے بیان میں غیر ضروری حصے کا حذف

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ یہاں رَسُوْلاً اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ کے بعد حضرت مسیح کی سرگزشت کا وہ سارا حصہ حذف ہے جو اس بشارت اور ان کے عملاً بنی اسرائیل کے سامنے دعوتِ رسالت لے کر اٹھنے کے درمیان کی مدت سے تعلق رکھنے والا ہے۔ قرآن نے انبیا علیہم السلام کی سرگزشتوں کے بیان میں حذف کا یہ طریقہ بہت استعمال کیا ہے۔ اس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قاری کی توجہ کلام کے اصل مقصد پر مرکوز رہتی ہے، کوئی زائد چیز بیچ میں مخل نہیں ہونے پاتی۔ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ ان کے مقصدِ بعثت کو واضح کر دینے کے بعد گویا ان کو داعی بنا کر بنی اسرائیل کے سامنے کھڑا کر دیا کہ انھوں نے ان کو یہ دعوت

دی اور اپنی رسالت کے ثبوت میں یہ نشانیاں دکھائیں۔

تورات اور قرآن کے بیان کا ایک فرق

یہاں جو معجزات مذکور ہیں ان میں سے پہلے اور آخری کے سوا انجیل میں بھی سب مذکور ہیں۔ البتہ قرآن میں ان میں سے ہر ایک کے ساتھ باذن اللہ کی قید لگی ہوئی ہے لیکن انجیل میں اس قسم کی تصریحات غائب ہیں۔ اس لیے کہ جب حضرت عیسیٰؑ کے لیے خدا کا تصور پیدا ہوا ہو گا تو اس قسم کے الفاظ خدائی کے تصور سے بے جوڑ سمجھ کر نکال دیئے گئے ہوں گے۔ لیکن یہ لوگ کہاں کہاں حقائق کو چھپائیے، ان کی ساری کوششوں کے علی الرغم آج بھی انجیلوں میں توحید خالص کی ایسی شہادتیں موجود ہیں کہ حیرت ہوتی ہے کہ ان روشن شواہد کے ہوتے ہوئے نصاریٰ شرک میں کس طرح مبتلا ہو گئے؟ آگے بعض چیزوں کی طرف ہم اشارہ کریں گے۔

نکرہ وحدت کے لیے نہیں بلکہ تعمیم کے لیے

'جِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ' لفظ 'آیت' کی تنکیر وحدت کو نہیں بلکہ تعمیم کو ظاہر کرتی ہے۔ یعنی میں اپنی رسالت کے ثبوت میں اپنے رب کی طرف سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اس سے قطع نظر کہ ان کی تعداد کیا ہے۔

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ (۵۰)

'مصدقاً لما بین یدی' کے دو مفہوم

'مُصَدِّقًا' ہے تو حال لیکن یہ محض مشابہت کی وجہ سے سابق جملے پر عطف ہو گیا ہے۔ اس کے دو مفہوم ہیں اور ان دونوں مفہوموں کی دوسرے مقام میں ہم وضاحت کر چکے ہیں۔ ایک یہ کہ میں تورات کی تصدیق کرتا ہوں۔ اس تصدیق کے شواہد انجیلوں میں موجود ہیں۔ حضرت مسیحؑ نے بڑے زور اور بڑی تاکید کے ساتھ یہ بات بار بار فرمائی ہے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں بلکہ اس کو قائم کرنے آیا ہوں۔ انھوں نے یہ بھی فرمایا کہ آسمان اور زمین ٹل جائیں گے لیکن اس کا (تورات) ایک نقطہ بھی نہیں ٹل سکتا جب تک ہر بات پوری نہ ہو لے، انھوں نے عملاً جس شریعت کی خود پیروی کی اور جس کی پیروی کی ہدایت اپنے پیروؤں کو دی وہ تورات ہی کی شریعت تھی۔ انھوں نے تورات پر جو اضافہ فرمایا ہے وہ شریعت کا نہیں بلکہ صرف حکمت کا ہے اور اس اضافے کی نوعیت یہ ہے کہ انھوں نے تورات کے اس باطن کو کھول دیا ہے جس سے یہود کے علما اور فریسیوں کی آنکھیں بند تھیں۔ ان کے نام لیواؤں نے تورات سے بغاوت کا اعلان تو پال کے زمانے سے کیا ہے۔

دوسرا یہ کہ میں تورات کی پیشین گوئیوں کا مصداق ہوں، میرے ظہور سے ان کی تصدیق ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیشرو نبیوں سے ایسی پیشین گوئیاں موجود تھیں جن کی بنا پر یہود کو ایک نبی کی بعثت کا انتظار تھا۔ چنانچہ حضرت عیسیٰؑ کی شہرت ہوئی تو بہت سے حلقوں میں یہ چرچا ہونے لگا کہ جس کا انتظار تھا وہ آ گیا۔ بعض لوگ اس منتظر کا نام ایلیا لیتے تھے۔ انجیلوں میں حضرت یوحنا کے متعلق بھی منقول ہے کہ جب وہ ہیرودیس کے حکم سے جیل میں تھے تو انھوں نے اپنے چند شاگردوں کو

حضرت مسیحؑ کی خدمت میں بھیج کر پچھوایا کہ "وہ جس کا انتظار تھا تو ہی ہے، یا ہم کسی اور کا انتظار کریں"؟ حضرت مسیحؑ نے پیغام لانے والوں سے کہا کہ جو کچھ دیکھ رہے ہو وہ جا کر بتا دو کہ "لنگڑے چل رہے ہیں، گونگے بول رہے ہیں، اندھے دیکھ رہے ہیں، اب اور کس بات کا انتظار ہے"۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے متعدد ایسی باتوں کا خود بھی حوالہ دیا ہے جو ان کے بارے میں پچھلے نبیوں نے فرمائی ہیں۔ یہ حوالے انجیلوں میں موجود ہیں۔

حضرت مسیحؑ نے کن حرام کردہ چیزوں کو حلال ٹھہرایا

'وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ' یہ جملہ بھی معنی پر عطف ہے۔ بعض حرام کردہ چیزوں کے حلال کرنے سے ان چیزوں کو حلال کرنا مراد ہے جو علمائے یہود نے محض اپنے من گھڑت فتووں اور اپنے غلو کی وجہ سے حرام کر رکھی تھیں اور یہ چیزیں روایت بن کر شریعت میں داخل ہو گئی تھیں۔ مثال کے طور پر سبت کے احترام کے مسئلہ کو لیجیے۔ اس حکایت کو یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے اس قدر بڑھا دیا تھا کہ سبت کے دن کسی مریض کو شفا کی دعا دینا بھی ان کے نزدیک احترام سبت کے منافی تھا۔ چنانچہ احترام سبت کے مسئلے پر حضرت مسیحؑ اور علمائے یہود کے درمیان متعدد مناظروں کا ذکر انجیلوں میں بھی ہے۔ اسی طرح متعدد ایسی روایات کا بھی انجیلوں میں ذکر ہے جن کو سیدنا مسیحؑ اور ان کے شاگردوں نے علانیہ توڑا اور جب ان کے توڑنے پر علمائے یہود نے ان پر بے دینی کا الزام لگایا تو آپؑ نے ان کی اس جھوٹی دینداری کی اچھی طرح قلعی کھولی۔

إِنَّ اللَّهَ رَبِّي وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ هَٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيمٌ (۵۱)

خدا کے لیے لفظ 'اب' کے استعمال کی حقیقت

انجیلوں میں خدا کے لیے میرا باپ اور تمھارا باپ، کی جو تعبیر بار بار آتی ہے یہ قرآن نے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دراصل جو بات فرمائی تھی وہ یہ تھی کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمھارا رب بھی، سو اسی کی بندگی کرو۔ لیکن نصاریٰ نے متشابہات کی پیروی کی اور آپؑ کی واضح تعلیمات کو نظر انداز کر دیا۔ عبرانی میں 'اب' کا لفظ باپ اور رب دونوں معنوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح ابن کا لفظ بیٹے اور عبد دونوں معنوں میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی لفظ دو معنوں میں استعمال ہوتا ہے تو سیاق و سباق متعین کرتا ہے کہ لفظ کس مفہوم میں استعمال ہوا ہے لیکن جب نصاریٰ نے حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ بنا لیا تو جو چیز بھی انھیں مفید مطلب نظر آئی اس کو انھوں نے اسی عقیدے کی تائید میں استعمال کر لیا قطع نظر اس سے کہ اس کا موقع و محل کیا ہے۔ پھر جب اصل انجیل کی جگہ صرف اس کے ترجمے رہ گئے تو ہر چیز کی تعبیر بھی یک قلم بدل کے کچھ سے کچھ ہو گئی۔ لیکن ان ساری تحریفات کے باوجود آج بھی انجیل میں ایسی تصریحات موجود ہیں جن سے صاف واضح ہے کہ حضرت مسیحؑ جب خدا کو 'اب' کہتے ہیں تو اس سے ان کی مراد 'رب' ہی ہوتی ہے چنانچہ بعض مقامات میں انھوں نے دوسرے مترادف اس لفظ کے استعمال کر کے مطلب کو بالکل واضح کر دیا ہے چنانچہ یوحنا

باب ۲۰: ۱۸ میں ہے:-

"لیکن میرے بھائیوں کے پاس جاکر ان سے کہہ کہ میں اپنے باپ اور تمھارے باپ اور اپنے خدا اور تمھارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں۔"

اس ارشاد سے صاف واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ جس معنی میں اللہ تعالیٰ کو اپنا 'اب' کہتے ہیں اس معنی میں وہ اس کو تمام خلق کا 'اب' کہتے ہیں اور اس سے یہ بھی واضح ہے کہ وہ اس لفظ کو اللہ تعالیٰ کی تعبیر کے لیے اس کی ربوبیت کے پہلو سے استعمال کرتے ہیں نہ کہ اس کے ساتھ اپنا نسبی رشتہ جوڑنے کے لیے۔ علاوہ ازیں وہ خدا کے لیے خدا کی تعبیر بھی استعمال کرتے ہیں اور اس کو جس طرح دوسروں کا خدا کہتے ہیں اسی طرح اس کو اپنا بھی خدا کہتے ہیں۔

توحید صراط مستقیم ہے

هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ یعنی خدا تک پہنچنے کی سیدھی راہ یہی ہے کہ اسی کو سب کا رب مانا جائے اپنا بھی اور دوسروں کا بھی اور اسی کی عبادت کی جائے۔ جن لوگوں نے دوسرے وسیلے اور واسطے بیچ میں پیدا کر لیے ہیں انھوں نے اس سیدھی راہ میں بہت سے کج پیچ پیدا کر لیے ہیں جس کے سبب سے وہ شرک و گمراہی کی وادیوں میں بھٹک گئے ہیں۔ یہ راہ بغیر کسی کجی (عوج) کے ہے، یہ سیدھی خدا تک پہنچاتی ہے۔ نکرہ یہاں اس شاہراہ فطرت کی اہمیت و شان کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ۝ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ (۵۲-۵۳)

'حواری' کا مفہوم

'حواری' کا لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کے لغوی مفہوم میں اہل لغت کا اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک اس کے معنی خیر خواہ، حامی، ناصر اور مددگار کے ہیں۔ جس طرح لفظ انصار مدینہ کے ان جانثاروں کے لیے خاص ہوا جنھوں نے ابتدائے دعوت ہی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دیا اسی طرح 'حوارئین' کا لفظ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ان خاص شاگردوں کے لیے استعمال ہوا جو آپ پر ایمان لائے، ہر قسم کے نرم و گرم حالات میں آپ کے ساتھ رہے، آپ نے پوری شفقت اور دل سوزی سے شب و روز جن کی تعلیم و تربیت کی اور جو بالآخر آپ کے داعی، نقیب اور آپ کے پیغام بر بن کر بنی اسرائیل کی ایک ایک بستی میں پہنچے۔ ان شاگردوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ انجیل میں موجود ہے۔

'انصار' کا مفہوم

'انصار' ناصر کی بھی جمع ہے اور نصیر کی بھی۔ معنی واضح ہیں۔ ہمارے نزدیک، جیسا کہ اوپر ہم نے اشارہ کیا، معنی کے اعتبار سے انصار اور حوارئین کے لفظ میں کچھ ایسا فرق نہیں ہے۔ چنانچہ اسی اشتراک معنوی کے پہلو سے حوارئین کو قرآن نے، جیسا کہ ہم سورۂ صف میں بتائیں گے، انصارِ مدینہ کے سامنے بطور مثال پیش کیا ہے۔

آیت ۵۲ کا مطلب

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء اور سرداروں کے رویے سے یہ محسوس کر لیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو انھوں نے اپنی ساری توجہ اپنے ان غریب ساتھیوں کی طرف پھیر دی جو اگرچہ منصب و جاہ نہیں رکھتے تھے لیکن دولت ایمان سے متمتع تھے۔ انبیا علیہم السلام کی یہ سنت رہی ہے کہ اوّل اوّل تو انھوں نے اپنی اپنی قوموں کے بااثر لوگوں کو جھنجھوڑنے اور جگانے کی کوشش کی ہے لیکن جب انھوں نے یہ دیکھ لیا ہے کہ یہ خوابِ غفلت کے ماتے لوگ کروٹ بدلنے والے نہیں ہیں تو انھوں نے ان سرمستوں کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی ساری توجہ اپنے غریب باایمان ساتھیوں پر مرکوز کر دی ہے۔ قرآن مجید میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے اعراض کرنے اور اہل ایمان کو تذکیر کرنے کی جو بار بار ہدایت ہوئی ہے وہ اسی مرحلے کی بات ہے۔ اور یہی مرحلہ ہے جس میں سیدنا مسیحؑ نے دریا کے کنارے کے ماہی گیروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ، میں تمھیں آدمیوں کا پکڑنے والا بناؤں۔

انبیا کے کردار کا ایک پہلو

اس آیت سے حضرات انبیاء علیہم السلام کے کردار پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ حالات کے بگاڑ اور قوم کی ہٹ دھرمی سے مایوس اور دل شکستہ نہیں ہوتے بلکہ خدا کی راہ میں وہ اپنی جدوجہد جاری رکھتے ہیں۔ اگر زور و اثر رکھنے والے لوگ ان کا ساتھ نہیں دیتے تو وہ اپنے غریب، وفادار اور کمزور و بے اثر ساتھیوں ہی کو لے کر اپنا سفر شروع کر دیتے ہیں۔ حالات کی تاریکی ان کے اندر روشنی اور قوم کی بے مہری ان کے اندر مزید قوت اور عزم پیدا کرتی ہے۔ ع

حدی را تیز ترمی خواں چو محمل را گراں بینی

سورہ نوح کی تفسیر میں انبیا کے کردار کے اس پہلو پر انشاء اللہ ہم تفصیل کے ساتھ بحث کریں گے۔

مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ کا مفہوم

'مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ' سے ایک طرف تو اس جوشِ دعوت کا اظہار ہو رہا ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، دوسری طرف ان کے اس اقدام اور اس عزم و جزم کا اظہار ہو رہا ہے جو اللہ کے سوا ہر معیت و رفاقت سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ دعوت کی اس للکار میں یہ مضمون بھی مضمر ہے کہ میں تو اپنے رب کی راہ پر، یہ دیکھو، چل کھڑا ہوا ہوں، اب جس کے اندر حوصلہ ہو وہ اس وادیٔ پُرخار میں میرا ساتھ دے۔

نبی کا یہ فیصلہ کن عزم مُردوں کے اندر بھی زندگی کی لہر دوڑا دینے کا اثر رکھتا ہے۔ جن روحوں کے اندر کچھ صلاحیت ہوتی ہے وہ نہ صرف یہ کہ بیدار ہو جاتی ہیں بلکہ تڑپ اُٹھتی ہیں اور جب تڑپ اٹھتی ہیں تو برسوں کی منزل لمحوں میں طے کر لیتی ہیں۔ جو لوگ عربی کے اداشناس ہیں ان کے لیے یہاں ایک نکتہ قابلِ ذکر ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے تو فرمایا کہ مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ لیکن حواریین نے جو جواب دیا وہ یہ نہیں ہے کہ نَحْنُ اَنْصَارُکَ اِلَی اللّٰہِ بلکہ بے دھڑک جواب دیا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ سیدنا مسیحؑ کے ارشاد

زبان کا ایک نکتہ

میں 'الیٰ' اس مسافت کو واضح کر رہا ہے جو راہ اور منزل کے درمیان واقع ہے اور ایک داعی کی حیثیت سے ان کے شایانِ شان یہی تھا کہ اس راہ کی مشکلات اور درمیان کی مسافت سے آگاہ کر دیں لیکن حواریین نے اپنے جواب میں جوشِ فدویت کی ایک ہی جست میں گویا ساری مسافت طے کر لی ہے اور دعوتِ حق کے اس نازک مرحلے میں ان کے جذبۂ ایمان و اسلام کے شایانِ شان بات یہی تھی۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ حضرت مسیحؑ کے سوال میں تو بڑا اختصار ہے لیکن حواریین کے جواب میں بڑی تفصیل ہے۔ انھوں نے اپنے ایمان کا بھی اقرار کیا، اپنے مسلم ہونے پر بھی حضرت مسیحؑ کو گواہ ٹھہرایا، اور اپنے ایمان و اتباعِ رسول کے اقرار کے ساتھ خدا سے دعا بھی کی کہ ان کو حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا جائے۔

نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ کے مضمرات

اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حواریین اس بات کو اچھی طرح سمجھتے تھے کہ اللہ کے انصار میں سے ہونے کے معنی کیا ہیں اور یہ اجمال کن تضمنات و مضمرات پر مشتمل ہے۔ معلوم ہوا کہ اس کے تقاضوں میں سے یہ ہے کہ خدا پر صدقِ دل سے ایمان لایا جائے، اس کے جملہ احکام کی بے چون و چرا پیروی کی جائے، جو کچھ اس نے اتارا ہے اس کو مانا جائے، اس کے بھیجے ہوئے رسول کی پیروی کی جائے اور قول، عمل، زندگی اور موت سے اس حق کی شہادت دی جائے جس کا خدا نے امین بنایا ہے۔ یہی وہ شہادت ہے جو اگر جان دے کر دی جائے تو اصل شہادت کا درجہ حاصل کرتی ہے۔

یہ بات بھی یاد رکھیے کہ حواریین نے سیدنا مسیحؑ کو جس چیز پر خاص طور پر گواہ ٹھہرایا ہے وہ اپنا مسلم ہونا ہے۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ حواریین کے ذہن میں صرف اسلام اور مسلم کا تصور تھا، نصاریٰ اور نصرانیت کا کوئی تصور نہیں تھا۔ یہ بات اس سورہ کے عمود سے تعلق رکھتی ہے۔ ہم سورہ کے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں کہ اس سورہ کا عمود اسلام ہے۔

فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ، یہ اس بات کی دعا ہے کہ قیامت کے روز ان کا شمار حق کی شہادت دینے والوں میں لکھا ہوا حق کو چھپانے والوں میں نہ لکھا جائے۔ یہی شہادتِ حق وہ اصل ذمہ داری ہے جو ہر نبی کی امت پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی جاتی ہے۔ نبی، جان کی بازی لگا کر امت پر اللہ کے دین کی گواہی دیتا ہے اور نبی کے بعد یہ امت کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ اس حق کی گواہی، ہر طرح اور ہر خوف سے بے پروا ہو کر، خلق پر دے۔ یہ گواہی دل، زبان، قول، عمل اور جان و مال کی قربانی، ہر پہلو سے دینے کا مطالبہ ہے۔ اس شہادت کا ضد کتمانِ حق ہے جو شریعتِ الٰہی کے شدید ترین جرائم میں سے ہے۔ مذاہب کی تاریخ سے ثابت ہے کہ یہود اس جرم کے سب سے بڑے مجرم ہوئے ہیں اور یہ جرم من جملہ ان جرائم کے ہے جن کے سبب سے وہ اللہ تعالیٰ کی لعنت کے مستحق قرار پائے۔ حواریین کی اس دعا کے باطن پر غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ اس میں یہود کی اس حق پوشی پر بالواسطہ تعریض بھی ہے۔

اس آیت کا مضمون تھوڑے سے تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورۂ صف میں بھی بیان ہوا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰهِ كَمَا قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ لِلْحَوَارِيّٖنَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَكَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَيَّدْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى عَدُوِّهِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰهِرِيْنَ (۱۴)

اے ایمان والو، اللہ کے مددگار بن جاؤ، جیسا کہ عیسیٰ بن مریم نے حواریوں سے کہا کہ کون اللہ کی راہ میں میرا مددگار بنتا ہے؟ حواریوں نے جواب دیا کہ ہم ہیں اللہ کے مددگار۔ تو بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور ایک گروہ نے کفر کیا، پس ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابل میں مدد کی تو وہ ان پر غالب ہو گئے۔

یہاں یہ بات ظاہر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اللہ کی مدد سے مراد اللہ کے رسول اور اللہ کے اس دین کی تائید و حمایت ہے جس کو قائم کرنے کی دعوت لے کر اللہ کا رسول اٹھتا ہے۔ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ کے الفاظ سے خود اس حقیقت کا اظہار ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی امداد سے بے نیاز ہونے کے باوجود اس کو اپنی امداد سے جو تعبیر فرمایا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے اور اس میں اس کے بندوں کی فلاح و بہبود ہے۔

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ (۵۴)

لفظ مکر کا اصلی مفہوم

'مکر' کے معنی ہیں کسی کو نقصان پہنچانے کے لیے کوئی مخفی تدبیر کرنا۔ اس میں مذمت کا پہلو یہاں سے پیدا ہوا کہ مخفی تدابیر کا استعمال آدمی کی کمزوری کی دلیل ہے۔ چونکہ عام طور پر صورت یہی ہوتی ہے کہ خفیہ تدبیریں کمزور لوگ ہی استعمال کرتے ہیں اس وجہ سے اس کی مذمت کا پہلو ذہنوں پر غالب ہو گیا اور یہ گمان کیا جانے لگا کہ مکر لازماً مذموم ہی ہوتا ہے۔ لیکن یہ بات حقیقت کے خلاف ہے۔ خفیہ تدبیر بعض حالات میں کسی مکر کرنے والے کے مکر کے توڑ یا اس کی سزا کے طور پر بھی استعمال کرنی پڑتی ہے۔ ایک خفیہ چالیں چلنے والے کے خلاف اگر کوئی علانیہ انتقامی کارروائی کی جائے تو وہ اس کو ظلم و زیادتی قرار دے گا اور حالات سے ناواقف اس کو حق بجانب ٹھہرائیں گے۔ اسی طرح کوئی مخفی تدبیر کسی سازشی دشمن کے خلاف بعض اوقات اس کو متنبہ کرنے کے لیے اختیار کرنی پڑتی ہے تاکہ اس پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس کی سازشیں مخفی نہیں ہیں، جن کے لیے وہ یہ جال بن رہا ہے وہ اس کے اس جال سے واقف ہیں۔ یہ چیز اس کو رسوا بھی کرتی ہے اور آئندہ کے لیے اس کو ایسی حرکتوں سے باز رکھنے میں بھی مددگار ہوتی ہے بشرطیکہ اس کے اندر سبق حاصل کرنے کی صلاحیت ہو۔ یہاں جس مکر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کی گئی ہے اس سے مراد یہی مکر ہے جو حق کے دشمنوں کی سازشوں کے توڑ یا ان کی سرکوبی کے لیے اللہ تعالیٰ اختیار فرماتا ہے۔ یہ تدبیریں ایسی تیر بہدف ہوتی ہیں کہ دشمنوں کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں اور ساتھ ہی ان سے خلق کو

بے شمار برکتیں بھی حاصل ہوتی ہیں۔ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ سے اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ رہا یہ سوال کہ اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح کو یہود کے شر سے بچانے کے لیے کیا تدبیر اختیار فرمائی تو اس کے جواب کے لیے موزوں موقع سورۂ نساء میں آئے گا۔

حضرات انبیاء کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت

اس آیت میں جس بات کی طرف اشارہ ہے وہ تمام انبیاء علیہم السلام کی زندگی کی ایک مشترک حقیقت ہے۔ تمام انبیا کی زندگی شہادت دیتی ہے کہ جب انھوں نے اپنی قوم کے اعیان و اکابر سے مایوس ہو کر اپنی پوری توجہ اپنے غریب ساتھیوں اور قوم کے عام لوگوں پر مرکوز کی ہے اور ان کی دعوت ان لوگوں کے اندر اپنے اثرات پھیلانے لگی ہے تو یہ اعیان و اکابر اس چیز کو اپنے اقتدار کے لیے ایک شدید خطرہ سمجھ کر نبی کے خلاف مختلف قسم کی سازشوں میں مصروف ہو گئے ہیں تاکہ اس کے قتل کا کوئی بہانہ پیدا کر کے اپنے خیال کے مطابق اس مصیبت سے پیچھا چھڑائیں۔

سیدنا مسیح کے خلاف

یہ مرحلۂ آزمائش یوں تو ہر نبی کی زندگی میں، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، پیش آیا ہے، لیکن ہم یہاں سیدنا مسیح سے متعلق یہود کے اعیان و اکابر کی بعض سازشوں کا ذکر کرتے ہیں۔

یہود کی سازشیں

انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ یہود کے علماء اور ان کے کاہنوں اور فقیہوں نے اس موقع پر آنحضرت کے خلاف مختلف قسم کے جال پھیلائے۔

ایک تو انھوں نے آپ پر اور آپ کے ساتھیوں پر اسلاف کی روایات توڑنے اور بزرگوں کی توہین و تحقیر کا الزام لگایا تاکہ عوام کے جذبات ان کے خلاف بھڑکائے جا سکیں۔

دوسرا جال انھوں نے یہ بچھایا کہ اپنے مخصوص آدمی بھیج بھیج کر ان سے ایسے سوالات کیے جن کے جوابوں سے ان کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے کا مواد فراہم ہو سکے۔ یہ کام یہود کے فقیہوں اور فریسیوں نے بڑی سرگرمی سے انجام دیا اور سیدنا مسیح کی تمثیلوں اور تشبیہوں کے اندر سے انھوں نے اپنی دانست میں وہ مواد فراہم کر لیا جس کی بنیاد پر ان کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیا جا سکے۔

تیسرا یہ کہ اس زمانے میں چونکہ ملک پر سیاسی اقتدار رومیوں کا تھا اس وجہ سے ان کو بھڑکانے کے لیے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی گئی۔ پہلے تو خراج کی ادائیگی سے متعلق سیدنا مسیح علیہ السلام سے سوالات کیے گئے جن سے یہ ثابت ہو سکے کہ یہ شخص لوگوں کو قیصر کو خراج دینے سے روکتا ہے۔ لیکن اس قسم کے سوالوں کے جواب سیدنا مسیح نے ایسے دندان شکن دیئے کہ علمائے یہود اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، پھر انھوں نے یہ الزام لگایا کہ یہ شخص اسرائیل کا بادشاہ ہونے کا مدعی ہے۔ اس کے لیے حضرت مسیح کے بعض تمثیلی اقوال سے مواد حاصل کرنے اور اس کے ذریعہ سے رومی حکومت کو بھڑکانے کی کوشش کی گئی۔

چوتھی تدبیر یہ کی گئی کہ سیدنا مسیح کے بارہ شاگردوں میں سے ایک شاگرد یہودا کو، جو منافق تھا، یہود نے رشوت دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ آنحضرت کی مخبری کرے اور ان کو گرفتار کرائے۔

ان تمام سازشوں کی تفصیل انجیلوں میں موجود ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہ سارا مواد ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں جمع کر دیتے لیکن بہتر یہی معلوم ہوا کہ جس طرح قرآن نے صرف اشارے پر اکتفا کیا ہے اسی طرح ہم بھی اشارات ہی پر اکتفا کریں۔

پیغمبر کی زندگی کا یہی وہ مرحلہ ہوتا ہے جس میں وہ قوم کو چھوڑ کر اور اپنے دشمنوں سے اعلان براءت کر کے ہجرت کرتا ہے اور یہ ہجرت مختلف شکلوں میں، جن کی تفصیل اپنے مقام میں آئے گی، ظاہر ہوتی ہے۔

إِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسٰىٓ إِنِّي مُتَوَفِّيكَ وَرَافِعُكَ إِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِينَ كَفَرُوا وَجَاعِلُ الَّذِينَ
اتَّبَعُوكَ فَوْقَ الَّذِينَ كَفَرُوٓا إِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ثُمَّ إِلَيَّ مَرْجِعُكُمْ فَأَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيمَا
كُنْتُمْ فِيهِ تَخْتَلِفُونَ (۵۵)

حضرت مسیح کی حفاظت کے لیے تدبیر الٰہی

اب یہ بیان ہو رہا ہے اس بہترین مخفی تدبیر کا جو اللہ تعالیٰ نے سیدنا مسیح علیہ السلام کو یہود کی سازش سے بچانے کے لیے اختیار فرمائی اور جس سے ان کی سازش کے تمام تار پود بکھر کر رہ گئے۔

توفی کے لغوی اور مجازی مفہوم

'تَوَفِّیْ' کے اصل معنی عربی لغت میں الاخذ بالتمام کسی شے کے پورا پورا لے لینے یا کسی چیز کو اپنی طرف قبض کر لینے کے ہیں۔ موت دینے کے معنی میں اس لفظ کا استعمال حقیقۃً نہیں بلکہ مجازاً ہوا ہے۔ ایسے الفاظ جو اپنے حقیقی اور مجازی دونوں معنوں میں استعمال ہوتے ہیں، اپنے صحیح مفہوم کے تعین میں قرائن کے محتاج ہوتے ہیں۔

یہاں مندرجہ ذیل قرائن اس بات کے خلاف ہیں کہ اس کے معنی یہاں موت دینے کے لیے جائیں۔

قرائن جو اس بات کے خلاف ہیں کہ اس کے معنی موت دینے کے لیے جائیں

ایک یہ کہ یہ موقع اللہ تعالیٰ کی طرف سے سیدنا مسیحؑ اور ان کے ساتھیوں کے لیے بشارت اور وعدۂ نصرت کا ہے۔ جملہ رسولوں کی سرگزشتیں اس امر کی شاہد ہیں کہ جب ان کی قوموں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی حفاظت و نصرت کی بشارت دی ہے۔ یہاں بھی آیت پر نگاہ ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ پوری آیت بشارت اور وعدۂ نصرت ہی کی ہے۔ اس سیاق و سباق میں آخر یہ کہنے کا کیا محل ہے کہ میں تمھیں موت دینے والا ہوں، یہ تو وہی چیز ہوتی جس کے خواہاں یہود تھے۔ فرق صرف ذریعے کا ہوتا کہ موت یہود کے ہاتھوں نہیں بلکہ قدرت کے ہاتھوں واقع ہوتی۔

دوسرا یہ کہ اگر اس لفظ سے یہاں موت دینا مراد ہے تو اس کے بعد 'رَافِعُكَ إِلَيَّ' کے الفاظ بالکل غیر ضروری ہو کے رہ جاتے ہیں۔ آخر یہ کہنے کا کیا فائدہ کہ میں تمھیں موت دینے والا اور اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں؟ موقع دلیل ہے کہ یہاں 'مُتَوَفِّيكَ' کے بعد 'رَافِعُكَ إِلَيَّ' کے الفاظ 'تَوَفِّیْ' کے مفہوم کو واضح کر رہے ہیں کہ تمھاری 'تَوَفِّیْ' کی شکل یہ ہوگی کہ میں تمھیں اپنی طرف اٹھا لوں گا۔

تیسرا یہ کہ 'رَافِعُكَ إِلَيَّ' کے معنی مجرد رفع درجات لینا صحیح نہیں ہے۔ اس صورت میں 'إِلَيَّ' کا لفظ بالکل

بے ضرورت ہو کر رہ جاتا ہے اور قرآن میں کوئی لفظ بھی بے ضرورت استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگر صرف درجے کی بلندی کا اظہار مقصود ہوتا تو عربیت کے لحاظ سے 'رَافِعُكَ' کافی تھا۔ 'اِلَیَّ' کی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن میں دیکھ لیجیے جہاں بھی یہ لفظ بلند محی مرتبہ کے مضمون کے لیے استعمال ہوا ہے بغیر اِلیٰ کے استعمال ہوا ہے مثلاً

مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ	اور ان میں وہ بھی ہیں جن سے اللہ نے بات کی اور
دَرَجٰتٍ (۲۵۳۔ بقرہ)	بعض کے مدارج بلند کیے۔
وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ	اور اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے ان کا رتبہ
اِلَى الْاَرْضِ (۱۷۶۔ اعراف)	بلند کرتے لیکن وہ تو برابر زمین ہی کی طرف جھکا رہا۔
وَرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا (۵۷۔ مریم)	اور ہم نے اس کو فائز کیا اونچے درجے پر۔

اگر حرف 'اِلیٰ' کا صحیح صحیح حق ادا کیا جائے اور یہ حق ادا کرنا ضروری ہے تو 'رَافِعُكَ اِلَیَّ' کے معنی یہ ہوں گے کہ میں تم کو عزت و اکرام کے ساتھ اپنی جانب اٹھا لینے والا ہوں۔

چوتھا یہ کہ قرآن نے دوسرے مقام میں جہاں یہ مضمون بیان کیا ہے وہاں مُتَوَفِّيْكَ کا لفظ بالکل اڑا دیا ہے، قتل اور سولی کی نفی کے بعد جس چیز کا اثبات کیا ہے وہ صرف اٹھا لیے جانے کا ہے۔ 'بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ' (بلکہ اللہ نے اس کو اپنی جانب اٹھا لیا)۔ یہ اس بات کا نہایت واضح قرینہ ہے کہ قرآن نے یہ 'تَوَفِّيْ' کی اصل شکل بتائی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی جانب اٹھا لیا۔ آیت ملاحظہ ہو۔

وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ	اور نہ انھوں نے اس کو قتل کیا اور نہ اس کو سولی دی
شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا	بلکہ معاملہ ان کے لیے گھپلا کر دیا گیا اور جن لوگوں نے
فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ	اس بارے میں اختلاف کیا وہ اس کی طرف سے شک
بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَ	میں ہیں، انھیں اس کے بارے میں کوئی علم نہیں، محض
مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ	اٹکل کے تیر تکے چلا رہے ہیں اور انھوں نے اس کو
اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا	قتل یقیناً نہیں کیا بلکہ اس کو اللہ نے اپنی طرف اٹھا لیا
حَكِيْمًا۔ (۱۵۷۔ ۱۵۸)	اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

یہ آیت سب سے زیادہ موزوں مقام اپنے اندر رکھتی تھی اس بات کے بیان کے لیے کہ حضرت عیسیٰؑ کی موت کس طرح ہوئی؟ اس لیے کہ یہاں قرآن نے بڑی تاکید اور شدت کے ساتھ ان لوگوں کی تردید کی ہے جو ان کے قتل یا ان کی سولی کے مدعی تھے۔ اگر آپؑ کی موت واقع ہوئی ہوتی تو اس موقع پر قرآن صاف صاف یوں کہتا کہ نہ ان کو قتل کیا گیا اور نہ ان کو سولی دی گئی بلکہ اللہ نے ان کو وفات دی۔ لیکن قرآن نے نہ صرف یہ کہ یہ کہا نہیں بلکہ یہاں 'تَوَفِّيْ' کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا، صرف 'رَفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ' کا لفظ استعمال کیا۔ ہر صاحب ذوق اندازہ کر سکتا ہے کہ قتل اور سولی کی نفی کے بعد اس رفع سے موت مراد لینے کی کس حد تک گنجائش ہے۔

'وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا' یعنی اس گندے معاشرے سے الگ کر کے تمہیں صالحین و ابرار کے زمرے میں داخل کروں گا۔ انبیا علیہم السلام کے لیے سنتِ الٰہی یہ ہے کہ وہ جس قوم کی اصلاح کے لیے بھیجے جاتے ہیں اس کے اندر اس وقت تک وہ قیام کرتے ہیں جب تک ان کے ایمان لانے کی کچھ توقع ہوتی ہے۔ یہ توقع اس وقت ختم ہو جاتی ہے جب قوم کے لوگ نبی کے قتل کے درپے ہو جاتے ہیں۔ اس وقت نبی بحکمِ الٰہی ہجرت کر جاتا ہے۔ پھر جس طرح روح کی علیحدگی کے بعد جسم کے لیے سڑنے اور گلنے کے سوا کوئی اور شکل باقی نہیں رہ جاتی اسی طرح نبی کی علیحدگی کے بعد اس کے جھٹلانے والوں کے لیے ہزیمت اور ذلت کے سوا کوئی اور راہ باقی نہیں رہ جاتی۔ نبی اور اس کے ساتھی گندے ماحول سے نکل کر پاکیزہ اور صحت بخش ماحول میں داخل ہو جاتے ہیں جس سے ان کی روحانی قوت و صحت میں اضافہ ہوتا ہے۔ برعکس اس کے نبی کے دشمن زندگی بخش عناصر سے یک قلم محروم ہو کر پوری تیزی کے ساتھ ہلاکت کی وادی کی طرف چل پڑتے ہیں۔ استاذ امامؒ نے سورۂ کافرون کی تفسیر میں ہجرت کے ان اثرات و نتائج پر تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔

سیدنا مسیحؑ کا رفع آسمانی

سیدنا مسیحؑ بھی چونکہ ایک نوعیت کی ہجرت ہی سے اس وجہ سے جس طرح تمام رسولوں کو ہجرت کے بعد فتح و کامیابی کی بشارت ملی اسی طرح آپ کو بھی اس ہجرت کے ساتھ کامیابی و فتحمندی کی، جیسا کہ آگے بیان ہے، بشارت ملی۔

وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا الآیہ۔ اس میں اس بات کی بشارت ہے کہ حضرت مسیحؑ کے نام لیوا ان کے منکرین پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ تاریخی طور پر یہ بات ایک امر واقعہ ہے کہ نصاریٰ من حیث القوم اس بشارت کے بعد سے یہود پر ہمیشہ حاوی و غالب رہے ہیں۔ آج بھی جب کہ بظاہر یہود کی ایک چھوٹے سے خطہ میں سلطنت قائم ہو چکی ہے، یہ حقیقت اپنی جگہ پر اسی طرح قائم و ثابت ہے جس طرح پہلے قائم و ثابت تھی۔ اس لیے کہ یہود کی یہ نام نہاد سلطنت قائم بھی نصاریٰ ہی کے ہاتھوں ہوئی ہے اور باقی بھی انھی کے بل بوتے پر ہے۔

حضرت مسیحؑ کے متبعین کا یہود پر غلبہ

البتہ ایک بات یہاں دل میں ضرور کھٹکتی ہے وہ یہ کہ یہ نصاریٰ خود متبع مسیحؑ کب ہیں؟ یہ تو بالکل مبتدع اور حضرت مسیحؑ کی تعلیم سے یک قلم منحرف ہیں؟ اس کا جواب ہمارے نزدیک یہ ہے کہ 'اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' سے یہاں مراد صرف ان کے صحیح قسم کے متبعین ہی نہیں ہیں بلکہ اس میں ان کے عام متبعین اور نام لیوا بھی شامل ہیں۔ ہماری اس رائے کے حق میں کئی باتیں جاتی ہیں۔ مثلاً

ایک شبہ کا ازالہ

ایک یہ کہ قرآن میں 'اَهْلُ الْكِتَاب' اور 'اَلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتَاب' کے الفاظ بھی دو مختلف مفہوموں میں استعمال ہوئے ہیں۔ بعض جگہ ان سے اہل کتاب کو بحیثیت گروہ کے مراد لیا گیا ہے، اس سے بحث نہیں کہ فی الواقع ان کے عقائد و اعمال کیا ہیں، اور بعض جگہ ان سے صرف حقیقی اہل کتاب مراد لیے گئے ہیں۔ اسی طرح ہمارے نزدیک 'اَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ' اپنے اندر وسیع معنی رکھتا ہے۔ حضرت مسیحؑ کے تمام منتسبین اس میں شامل ہیں۔ عام اس سے کہ وہ ان کے حقیقی پیرو ہیں یا محض نام لیوا ہیں۔

دوسری یہ کہ یہاں 'الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ' کے مقابل 'الَّذِیْنَ کَفَرُوْا' رکھا ہے جس سے قرینہ یہی نکلتا ہے کہ تقابل درحقیقت منکرینِ مسیح اور منتسبینِ مسیح کے درمیان ہے نہ کہ مخلصین و مبتدعین کے درمیان۔

تیسری یہ کہ یہ موقع بشارت کا ہے۔ بشارت کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں وسعت ہو۔ اگر 'الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ' سے، صرف حقیقی متبعین ہی مراد ہوتے تو بشارت کا دائرہ بہت محدود ہو کر رہ جاتا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ذریتِ ابراہیمؑ کے لیے رزق کی جو بشارت دی تو اس کو صرف اہلِ ایمان ہی تک محدود نہیں رکھا بلکہ اہلِ ایمان اور غیر اہلِ ایمان سب کے لیے عام رکھا ہے اسی طرح یہاں 'الَّذِیْنَ اتَّبَعُوْکَ' بھی خالص اور غیر خالص متبعین کے لیے عام ہے۔

رسول اپنی قوم کے لیے عدالت ہوتا ہے

اوپر ہم اشارہ کر آئے ہیں کہ انبیا میں سے جو رسول کے درجے پر فائز ہوتے ہیں وہ اپنی قوم کے لیے عدالت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے لازماً قوم کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ ہو جاتا ہے۔ رسول اور اس کے ساتھیوں کو غلبہ حاصل ہوتا ہے اور اس کے مخالفین شکست کھاتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ یہ غلبہ رسول کی موجودگی میں حاصل ہو یا اس کے رخصت ہو چکنے کے بعد۔ سیدنا مسیحؑ کے متعلق قرآن کی تصریح کی روشنی میں اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ وہ صرف نبی ہی نہیں تھے بلکہ 'رَسُوْلًا اِلٰی بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ' بنی اسرائیل کی طرف رسول بنا کر بھیجے گئے تھے۔ ان کے اس منصب کا یہ لازمی تقاضا تھا کہ ان کے متبعین کو ان کے مخالفین پر وہ غلبہ حاصل ہوتا جس کی اس آیت میں بشارت ہے۔ 'لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِیْ' والی آیت میں بھی اسی سنت اللہ کا بیان ہے۔ یہی وہ عدالت ہے جس کا ذکر انجیلوں میں بار بار آتا ہے۔ رسولوں کی اس امتیازی خصوصیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ ان کے دشمنوں کو یہ مہلت نہیں دیتا کہ وہ ان کو قتل کر دیں۔ چنانچہ رسولوں میں سے کسی کا قتل ہونا ثابت نہیں۔ یہ بات بھی نصاریٰ کے اس دعوے کے خلاف جاتی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو سُولی پر چڑھایا گیا۔ اس مسئلے پر مفصل بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

فَاَمَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِیْدًا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَیُوَفِّیْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ (۵۶، ۵۷)

یہ اسی عدالت کا ظہور ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے اور جو کسی قوم کی طرف رسول کی بعثت کا لازمی نتیجہ ہے اس میں عذابِ دنیا اور عذابِ آخرت دونوں کی دھمکی ہے۔ یہود پر اس دنیا میں جو دل ہلا دینے والی آفتیں آئیں سب ان کے اسی کفر کا نتیجہ تھیں۔ 'وَاللّٰهُ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ' سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ مسیح پر ایمان رکھنے کے مدعی بھی اگر ایمان کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہو گئے تو آخرت کی پکڑ سے وہ بھی نہ بچ سکیں گے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو ایمان کے بعد شرک و بدعت میں مبتلا ہوں اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے بنیں۔

ذٰلِكَ نَتْلُوْهُ عَلَیْكَ مِنَ الْاٰیٰتِ وَالذِّكْرِ الْحَكِیْمِ (۵۸)

پیغمبر کی طرف التفات

یہ آیت اور اس کے ساتھ کی پانچ آیتیں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اثنائے کلام میں آپ کو مخاطب کر کے مخالفین خصوصاً نصاریٰ کے رویے کے مقابل میں تسلی بھی دی گئی ہے اور بعض ضروری ہدایات بھی دی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو عیسیٰؑ کی پوری تاریخ تمھیں سنائی گئی ہے تو یہ ہے اصل حقیقت مسیحؑ کی۔ یہ اس قسم کی من گھڑت داستان نہیں ہے جیسی کہ نصاریٰ نے تصنیف کر رکھی ہے بلکہ یہ اللہ کی آیات ہیں اور یہ ایک پُر حکمت یاد دہانی ہے۔ یعنی نصاریٰ نے تو اس کو ایک معمّا و چیستاں بنا کر رکھ دیا ہے جس سے صرف گمراہی حاصل کی جا سکتی ہے لیکن اللہ نے اس کو از سرِ نو تمھارے ذریعے سے آشکارا کیا ہے تاکہ اس سے حق و ہدایت اور حکمت و موعظت کی راہیں کھلیں۔ بعینہٖ اسی قسم کا التفات آگے آیت ۱۰۸ میں آ رہا ہے۔ اس سے اس آیت کے بعض الفاظ کی وضاحت بھی ہو رہی ہے۔ ارشاد ہے تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ۔ ۱۰۸ (یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ دنیا والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا) یعنی یہ حق کو از سرِ نو اس لیے واضح فرما دیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے گمراہی پر جمے رہنے کے لیے عذر باقی نہ رہ جائے، اور اگر وہ گمراہی پہ جمے رہیں تو ذمہ داری ان کی اپنی ہو۔

اِنَّ مَثَلَ عِيْسٰى عِنْدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ۭ خَلَقَهٗ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ (۵۹-۶۰)

عیسیٰؑ کی مثال آدمؑ کی ہے

یہ آیت اس باب میں خاتمۂ بحث کی آیت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح خدا نے آدمؑ کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کو فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے کلمہ 'کُن' سے عیسیٰؑ کو پیدا کر دیا۔ بلکہ ولادت کے معاملے میں آدمؑ کو اس اعتبار سے عیسیٰؑ پر فضیلت حاصل ہے کہ ان کی ولادت میں نہ باپ کو دخل ہے نہ ماں کو تو جب نصاریٰ ان کو معبود نہیں مانتے تو آخر حضرت عیسیٰؑ کو کیوں معبود بنا بیٹھے؟

لفظ 'ابن' کا استعمال دوسروں کے لیے

جس طرح پیدائش کے معاملے سے کسی مغالطے کے لیے کوئی وجہ موجود نہیں تھی، اسی طرح 'ابن' کے لفظ سے بھی، اگر نصاریٰ عقل سے کام لیتے تو کسی گمراہی میں پڑنے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ تورات اور انجیل میں 'ابن' کا لفظ صرف عیسیٰؑ ہی کے لیے نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ حضرت آدمؑ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے۔ ملاحظہ ہو لوقا ۳: ۳۸۔ فرشتوں کے لیے بھی استعمال ہوا ہے، ملاحظہ ہو پیدائش ۶: ۲ و ۴۔ حضرت یعقوبؑ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو استثنا ۱۴: ۱۔ نصاریٰ کے لیے بھی استعمال ہوا ہے ملاحظہ ہو یوحنا ۱: ۱۱-۱۲۔ اگر کسی کو معبود بنا دینے کے لیے یہ لفظ کافی ہے تو پھر حضرت عیسیٰؑ کی کوئی تخصیص نہیں رہ جاتی، پھر تو معبودوں کا ایک پورا لشکر تیار ہو سکتا ہے، نصاریٰ نے صرف حضرت عیسیٰؑ ہی پر کیوں قناعت کر لی؟

گویا بحث اتمامِ حجت کے آخری نقطہ پر پہنچ گئی اس وجہ سے قرآن نے یہ کہہ کر کہ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ الآیہ مزید بحث و گفتگو کا دروازہ بند کر دیا۔ اس جملے میں ہمارے نزدیک مبتدا محذوف ہے اور یہ بات ہم دوسرے

مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ جب مبتدا کو حذف کرتے ہیں تو اس سے مقصود مخاطب کی ساری توجہ خبر پر مرکوز کرانی ہوتی ہے۔ یعنی حضرت مسیح سے متعلق اصل حقیقت یہی ہے جو قرآن نے واضح کر دی ہے، باقی جو کچھ ہے وہ سب نصاریٰ کی افسانہ طرازی ہے۔ فَلَا تَكُنْ مِّنَ الْمُمْتَرِيْنَ میں ظاہر خطاب اگرچہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اس طرح کے مواقع میں، جیسا کہ ہم ایک سے زیادہ مواقع میں واضح کر چکے ہیں، روئے سخن پیغمبر کی طرف نہیں بلکہ امت کی طرف ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی عتاب مضمر ہوتا ہے تو اس کا تعلق درحقیقت مخالفین سے ہوتا ہے۔ لیکن وہ لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس وجہ سے ان کے بجائے اپنوں کو خطاب کر کے بات کہہ دی جاتی ہے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَاَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ (۶۱)

'العلم' سے مراد

'العلم' کے لفظ پر ہم دوسری جگہ گفتگو کر چکے ہیں کہ قرآن میں اس سے مراد وہ علم حقیقی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بذریعہ وحی آتا ہے۔ اس کا مقابل لفظ 'ظن' ہے۔

آیت ۶۱ کے بعض محذوفات

اس آیت میں عربی زبان کے اسلوب کے مطابق بعض چیزیں حذف ہیں۔ اگر محذوفات کو ظاہر کر دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہوگی۔ نَدْعُ نَحْنُ اَبْنَآءَنَا وَاَنْتُمْ اَبْنَآءَكُمْ وَنُحْضِرُ نَحْنُ اَنْفُسَنَا وَاَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ ثُمَّ نَبْتَهِلْ نَحْنُ وَاَنْتُمْ۔ ہم نے اپنے ترجمے میں ان محذوفات کو کھول دیا ہے۔

مباہلہ کا موقع و محل

'ابتہال' کے معنی دعا اور تضرع کے ہیں لیکن اس کے اندر ترک کا مفہوم بھی پایا جاتا ہے اس وجہ سے یہ ایک دوسرے پر لعنت کی بددعا کے لیے معروف ہے۔

جن معاملات میں بنائے اختلاف کوئی عقلی و استدلالی چیز ہو ان میں تو مسئلے کو طے کرنے کا صحیح طریقہ عقل و استدلال ہی ہے لیکن جہاں عقل و استدلال کے تمام مرحلے طے ہو چکے ہوں، مخاطب دلیل و حجت سے بالکل عاری ہو، حق اس کے سامنے سورج کی طرح روشن ہو، اس کے لیے اس سے گریز و فرار کی کوئی راہ نہ ہو لیکن وہ محض اپنی بات کی پچ اور ہٹ دھرمی کی آن قائم رکھنے کے لیے اپنی بات پر اڑا ہو تو ایسے مواقع کے لیے مباہلہ کا طریقہ آخری چارۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ نصاریٰ نے قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی جس سے یہ بات آخری درجے میں واضح ہو گئی کہ سیدنا مسیح کے بارے میں وہ اپنے موقف کو صحیح نہیں سمجھتے تھے بلکہ محض اپنے گروہی تعصب کے تحت اس کی حمایت کرتے تھے۔ برعکس اس کے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے یہ کھلا ہوا چیلنج اس بات کا نہایت کھلا ہوا ثبوت ہے کہ آپ کو اپنے موقف کی صحت و صداقت پر پورا پورا یقین تھا۔

مباہلے میں اپنے ساتھ اپنے اہل و عیال اور اپنے اعزا و متعلقین کی شمولیت اس کی سنجیدگی اور اہمیت کو دوچند بلکہ دہ چند کر دیتی ہے اس لیے کہ کوئی شخص جانتے بوجھتے اپنے زن و فرزند اور اپنے محبوں اور

محبوبوں پر لعنت کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۚ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِالْمُفْسِدِيْنَ (۶۲-۶۳)

یعنی حضرت عیسیٰؑ کی اصل حقیقت یہ ہے جو بیان ہوئی۔ ان کا جو درجہ و مرتبہ بھی ہے خدا کے ایک بندے اور اس کے نبی و رسول کی حیثیت سے ہے۔ خدائی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ معبود تو صرف اللہ تعالیٰ ہے اور وہ عزیز اور حکیم ہے۔ عزیز، یعنی سب پر غالب اور سب سے بالاتر، حکیم، یعنی اس کا ہر کام حکمت اور مصلحت پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ دونوں صفتیں شرک کی کامل نفی کرتی ہیں۔

شرک، فساد فی الارض ہے

دوسری آیت میں فرمایا کہ مباہلہ اس قضیے کو طے کرنے کی آخری صورت تھی لیکن اگر وہ اس پر بھی راضی نہیں ہیں تو اس کے صاف معنی یہ ہیں کہ وہ حق کی پیروی نہیں کرنا چاہتے بلکہ حق کی مخالفت کر کے خدا کی زمین میں فساد برپا کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ شرک تمام فساد کی جڑ ہے۔ اگر زمین و آسمان میں بہت سے معبود ہوتے تو ان کا سارا نظامِ تکوینی درہم برہم ہو کر رہ جاتا، اسی طرح اگر دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو اس دنیا کا سارا نظام عدل و قسط درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

۱۵۔ آگے کا مضمون —— آیات ۶۴-۷۱

توحید ایک مشترک حقیقت ہے

حضرت مسیح علیہ السلام کی اصلی حقیقت واضح اور نصاریٰ پر حجت تمام کر دینے کے بعد یہود و نصاریٰ دونوں کو مخاطب کر کے ان کو توحید اور اسلام کی دعوت دی ہے۔ اس کا آغاز اس طرح فرمایا ہے کہ توحید کو ایک مشترک حقیقت قرار دیا ہے کہ جس طرح اسلام اس کی دعوت لے کر آیا ہے اسی طرح پچھلے انبیا اور صحیفوں نے بھی اسی چیز کی دعوت دی ہے۔ اس وجہ سے اگر تم توحید کو جھٹلاتے ہو تو صرف قرآن کو نہیں جھٹلاتے بلکہ خود اپنے انبیا اور اپنے صحیفوں کو بھی جھٹلاتے ہو۔

حضرت ابراہیمؑ مسلم تھے

پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا حوالہ دیا ہے کہ اپنی بدعات کی تائید میں ان کے نام کو کیوں ملوث کرتے ہو؟ وہ تو نہ یہودی تھے، نہ نصرانی، وہ تو ایک حنیف مسلم تھے۔ تورات اور انجیل ان کے بعد نازل ہوئیں اور یہودیت و نصرانیت کے شاخسانے تم نے ان کے بعد کھڑے کیے، پھر اپنی حمایت میں ان کو کیوں گھسیٹنے کی کوشش کرتے ہو؟ ان کے ساتھ نسبت اور قربت کے حقدار تو وہ ہو سکتے ہیں جو ان کی ملتِ اسلام کی پیروی کریں، اور یہ شرف اگر حاصل ہے تو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والوں کو حاصل ہے نہ کہ تم کو جو اسلام کی مخالفت میں پیش پیش ہو۔

مسلمانوں کو تنبیہ

اس کے بعد مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ ان اہل کتاب کے فتنوں سے بچ کے رہو۔ ان کی ساری کوشش اس بات کے لیے ہے کہ تمھیں صراطِ مستقیم سے ہٹا کر گمراہی کی راہ پر ڈال دیں۔ ساتھ ہی اہل کتاب کو بھی سرزنش

کی ہے کہ جانتے بوجھتے کہ حق کیا ہے، اس حق کی مخالفت کرنا اور دوسروں کو بھی اس حق سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرنا آخر یہ کیا پیشہ ہے جو تم نے اہل کتاب ہوتے ہوئے اپنے لیے پسند کیا ہے؟ — اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۶۴-۷۱

قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَ
بَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ
بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا
اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿۶۴﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ
اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ؕ
اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۶۵﴾ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ حَاجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ
عِلْمٌ فَلِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَ
اَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا
وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۶۷﴾
اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۸﴾ وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ
مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ
وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۶۹﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ
الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۷۱﴾

ع ۱۵

ترجمۂ آیات ۶۴-۷۱

کہہ دو، اے اہل کتاب اس چیز کی طرف آؤ جو ہمارے اور تمھارے درمیان

یکساں مشترک ہے، یہ کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب ٹھہرائے۔ اگر وہ اس چیز سے اعراض کریں تو کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ ۶۴

اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو۔ درآنحالیکہ تورات اور انجیل نہیں نازل کی گئی ہیں مگر اس کے بعد؟ کیا تم اس بات کو نہیں سمجھتے؟ تمھیں لوگ ہو کہ تم نے حجت کی ان چیزوں کے بارے میں جن کے باب میں تمھیں کچھ علم تھا تو اس چیز کے بارے میں کیوں حجت کرتے ہو جس کے باب میں تمھیں کوئی علم نہیں؟ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ ابراہیم نہ تو یہودی تھا، نہ نصرانی۔ بلکہ حنیف مسلم تھا، اور وہ مشرکین میں سے بھی نہ تھا۔ ابراہیم کے ساتھ نسبت کے سب سے زیادہ حقدار وہ ہیں جنھوں نے اس کی پیروی کی، پھر یہ پیغمبر ہیں اور جو ان پر ایمان لائے اور اللہ اہل ایمان کا ساتھی ہے۔ ۶۵-۶۸

اہل کتاب کا ایک گروہ یہ آرزو رکھتا ہے کہ کاش تمھیں گمراہ کر دیں۔ حالانکہ وہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے ہی کو، لیکن وہ اس کا احساس نہیں کرتے۔ اے اہل کتاب اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم گواہ ہو۔ اے اہل کتاب تم کیوں حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرتے ہو اور حق کو چھپاتے ہو درآنحالیکہ تم جانتے ہو؟ ۶۹-۷۱

۱۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

قُلْ يَاأَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ (۶۴)

'يَاأَهْلَ الْكِتَابِ' کا خطاب اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں سے یکساں ہے لیکن اس سورہ میں نصاریٰ چونکہ

خاص طور پر مخاطب ہیں اس وجہ سے روئے سخن ان کی طرف زیادہ ہے۔

لفظ 'سواء' کی تحقیق

'سواء' کے معنی وسط کے ہیں، 'سواء الراس' سر کے بیچ کے حصے کو کہیں گے۔ 'سواء الطریق' کے معنی ہوں گے وسط شاہراہ۔ جو چیز دو جماعتوں کے بیچوں بیچ ہوگی وہ دونوں میں یکساں مشترک، مسلّم اور جانی پہچانی ہوئی ہوگی۔ توحید کے متعلق قرآن مجید کا دعویٰ یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اور مسلمانوں کے درمیان یکساں مشترک و مسلّم ہے۔ قرآن نے اسی مشترک کلمہ کو بنیاد قرار دے کر ان سے بحث کا آغاز کیا ہے کہ جب توحید ہمارے اور تمھارے درمیان ایک مشترک حقیقت ہے تو موازنہ کرو کہ اس قدر مشترک کے معیار پر قرآن اور اسلام پورے اترتے ہیں یا یہودیت اور نصرانیت؟

دعوت دین کا حکیمانہ طریقہ

بحث کا یہ طریقہ قرآن کے اس قرار دادہ طریقہ کے بالکل مطابق ہے جس کی اس نے آیت اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ (اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ذریعہ سے دعوت دو) میں تلقین فرمائی ہے۔ اس طریقۂ حکمت کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ اگر مخاطب سے بحث کے لیے کوئی مشترک بنیاد مل سکتی ہو تو اسی پر گفتگو کو آگے بڑھایا جائے، خواہ مخواہ اپنی انفرادیت کی دھونس جمانے کی کوشش نہ کی جائے۔ چنانچہ قرآن نے یہاں یہی طریقہ اختیار فرمایا ہے۔ اہل کتاب آسمانی صحیفوں کے حامل ہونے کے سبب سے توحید کی تعلیم سے اچھی طرح آشنا بھی تھے اور اس کے علمبردار ہونے کے مدعی بھی تھے۔ ان کے صحیفوں میں نہایت واضح الفاظ میں توحید کی تعلیم موجود تھی۔ انھوں نے اگر شرک اختیار کیا تھا تو اس وجہ سے نہیں کہ ان کے دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تھی بلکہ اپنے نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات کے بالکل خلاف محض بدعت کی راہ سے انھوں نے یہ چیز اختیار کی اور پھر متشابہات کی پیروی کر کے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس کے حق میں الٹی سیدھی دلیلیں گھڑنے کی کوشش کی۔ قرآن نے ان کو دعوت دی کہ یہ بات ہمارے اور تمھارے درمیان یکساں مسلّم ہے کہ اللہ کے سوا نہ کسی کی بندگی کی جائے، نہ اس کا کسی کو ساجھی ٹھہرایا جائے اور نہ ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب ٹھہرائے، پھر اس مُسَلَّم و مشترک حقیقت کے برخلاف تم نے خدا کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیوں بنا رکھا ہے اور اپنے احبار رہبان اور فقیہوں صوفیوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ کا درجہ کیوں دے دیا۔

اسی نقطہ سے بحث کا آغاز کیا ہے اور پھر بتدریج اس کے تقاضے اور لوازم واضح فرمائے ہیں اور جو چیزیں اس کے تقاضوں کے خلاف اہل کتاب میں پیدا ہو گئی تھیں ان کی تردید فرمائی ہے۔

یہ بات کہ توحید بنیادی طور پر ہمارے اور اہل کتاب کے درمیان ایک مشترک حقیقت کی حیثیت رکھتی ہے، وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ جو شخص بھی تورات اور انجیل پر نگاہ رکھتا ہے، وہ اس سے اچھی طرح واقف ہے۔ جہاں تک تورات کا تعلق ہے اس میں تو توحید کی تعلیم اس قدر وضاحت و قطعیت اور اتنی کثرت کے ساتھ ہے کہ اس کے حوالے نقل کرنا محض بات کو طول دینا ہوگا۔ البتہ انجیل سے کچھ حوالے

یہاں ہم پیش کرتے ہیں اس لیے کہ توحید کے معاملے میں سب سے زیادہ گمراہی نصاریٰ ہی کو پیش آئی ہے اور آیت میں درحقیقت، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، روئے سخن ہے بھی انھی کی طرف۔ لوقا ۴: ۸ میں ہے۔

انجیلوں میں توحید کے شواہد

"یسوع نے جواب میں اس سے کہا، لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور اسی کی بندگی کر۔" مرقس ۱۲: ۲۹-۳۰ میں ہے۔

"یسوع نے جواب دیا کہ اوّل (حکم) یہ ہے اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا ایک ہی خداوند ہے۔" یوحنا ۱۷: ۳ میں ہے:۔

"اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد و برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔" متی ۱۹: ۱۷ میں ہے:۔

"اس نے اس سے کہا کہ تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے؟ نیک تو ایک ہی ہے۔"

یہاں جس لفظ کا ترجمہ "نیکی" کیا گیا ہے، ہمارے نزدیک اس کا ترجمہ "پاکی" ہونا چاہیے۔ اس طرح "نیک تو ایک ہی ہے" بھی ٹھیک ترجمہ نہیں ہے۔ یہ دراصل "پاک تو ایک ہی ہے" ہوگا۔ انجیل کے اس ٹکڑے کا ترجمہ بعض دوسرے نسخوں میں مختلف ہے۔ اگرچہ غلط یہ بھی ہے لیکن اس میں نسبتہً وضاحت ہے۔ ملاحظہ ہو۔

"تو مجھے نیک کیوں ٹھہراتا ہے، نیک تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے۔"

یہ فقرہ بھی دراصل یوں ہے۔ "تو مجھے پاک کیوں ٹھہراتا ہے؟ پاک تو ایک ہی ہے اور وہ اللہ ہے۔"

توحید کی ان واضح تعلیمات کی موجودگی میں اہل کتاب سے قرآن کا یہ مطالبہ کتنا معقول ہے کہ وہ بھی ان نصوص کی روشنی میں اپنے عقائد کا جائزہ لیں اور جو باتیں ان کے بالکل خلاف، محض بدعات و متشابہات کی پیروی کر کے، انھوں نے اپنے عقاید میں شامل کر لی ہیں ان سے اپنے عقاید کو پاک کریں۔ پھر آخر میں مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ اگر یہ لوگ اپنے ہی نبیوں اور صحیفوں کی تعلیمات سے اعراض کرتے ہیں تو تم یہ واضح کر دو کہ ہم تو ان حقائق سے اعراض کرنے والے نہیں ہیں، ہم تو اپنے آپ کو اسی ربِ واحد کے حوالہ کرتے ہیں اور یہی درحقیقت اصل اسلام ہے۔

اس آیت میں یہ بات جو آئی ہے کہ "ہم میں سے کوئی ایک دوسرے کو رب نہ بنائے"۔ اس کی وضاحت دوسرے مقام میں ہوئی ہے کہ اہل کتاب نے اس ہدایت کے برخلاف اپنے احبار و رہبان کو رب بنا لیا۔ اس پر بعض اہل کتاب کی طرف سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال ہوا کہ "ہم احبار و رہبان کو رب تو نہیں مانتے"؛ حضورؐ نے جواب میں فرمایا کہ "کیا یہ بات نہیں ہے کہ جس چیز کو وہ حرام ٹھہرا دیں تم اس کو حرام ٹھہرا دیتے ہو اور جس چیز کو حلال ٹھہرا دیں اس کو حلال؟" سائل نے اقرار کیا کہ یہ بات تو ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہی ان کو رب بنا دینا ہے۔ اور جب اس طرح کسی کی اطاعت کی جائے کہ اس کے لیے تحریم و تحلیل کا حق تسلیم کر لیا جائے تو درحقیقت یہ چیز اس کی عبادت کرنے کے ہم معنی ہے اگرچہ بظاہر اس کو سجدہ کرنے

کیا جائے یا نہ کیا جائے۔

آیت کے آخر میں یہ بات بھی واضح فرما دی کہ اگر یہ اہل کتاب توحید کی اس مشترک حقیقت کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو تم ان کو صاف صاف سُنا دو کہ گواہ رہو کہ ہم تو مسلم ہیں۔ یہ "گواہ رہو" کے الفاظ بطور اظہار برأت ہیں۔ یعنی سن رکھو اور اس بات کے گواہ رہو کہ ہم نے تمھیں پوری وضاحت کے ساتھ سنا دیا تھا۔ اب کل کو خدا کے حضور ساری ذمہ داری تمھاری ہے۔ ہم اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔

'بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ' سے اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ یہی توحید اس سپردگی اور حوالگی کی روح ہے جس سے اسلام عبارت ہے اور جو اصل مطلوب و مقصود ہے۔ جس کو یہ توحید حاصل نہیں اس کو اسلام حاصل نہیں اور جس کو اسلام حاصل نہیں اس کو خدا حاصل نہیں۔

يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تُحَآجُّوْنَ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمَآ اُنْزِلَتِ التَّوْرٰىةُ وَالْاِنْجِيْلُ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ هٰٓؤُلَاۗءِ حٰجَجْتُمْ فِيْمَا لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ فَلِمَ تُحَاۗجُّوْنَ فِيْمَا لَيْسَ لَكُمْ بِهٖ عِلْمٌ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۝ مَا كَانَ اِبْرٰهِيْمُ يَهُوْدِيًّا وَّلَا نَصْرَانِيًّا وَّلٰكِنْ كَانَ حَنِيْفًا مُّسْلِمًا ۭ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوْلَى النَّاسِ بِاِبْرٰهِيْمَ لَلَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ وَهٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُؤْمِنِيْنَ (۶۵-۶۸)

حضرت ابراہیمؑ کا دین

ان آیات میں کوئی نحوی یا ادبی اشکال نہیں ہے۔ مضمون بھی ان کا پوری تفصیل کے ساتھ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام چونکہ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں ہی کے مسلّم خاندانی و روحانی پیشوا تھے اس وجہ سے یہود، نصاریٰ اور مشرکین تینوں ہی گروہ اپنی اپنی بدعات کی حمایت میں ان کے نام کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہود کہتے کہ حضرت ابراہیمؑ ہمارے طریقہ پر تھے۔ نصاریٰ ان کو اپنے طریقہ پر بتاتے اور مشرکینِ عرب اپنے طریقہ پر۔ یوں تو یہ اوعائے فخر ان میں سے ہر گروہ کو ایک دوسرے کے مقابل میں ہمیشہ رہا لیکن اسلام کی دعوت شروع ہونے کے بعد اس کی مخالفت میں خاص حربہ جو ان تینوں ہی گروہوں نے استعمال کیا وہ یہی تھا کہ نیا دین دینِ ابراہیمی کے خلاف ہے، اصل دینِ ابراہیمی کے حامل ہم ہیں اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) ہم کو ہمارے اصلی جدی دین سے ہٹا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔

قرآن نے یہاں ان کے اس پروپگنڈے کی تردید کی ہے کہ تورات اور انجیل کا نزول تو حضرت ابراہیمؑ کے صدیوں بعد ہوا ہے، پھر وہ یہودیت یا نصرانیت پر کس طرح ہوئے؟ بے وقوفی کی بات کے لیے بھی آخر کوئی نہ کوئی چھوٹی موٹی بنیاد ہوا کرتی ہے۔ تم نے بعض ایسے معاملات میں بھی حجتیں پیدا کی ہیں جن کے بارے میں تمھیں کچھ نہ کچھ علم تھا، ان کے لیے تم کسی جواز کا سہارا لے سکتے ہو اور اپنے آپ کو تسلی دے سکتے ہو لیکن تمھاری یہ بات تو بالکل ہی بادر ہوا ہے، آخر جس چیز کے باب میں تمھیں کچھ معلومات

ہی نہیں اس میں دخل در معقولات کے لیے جو انکی کیا گنجائش ہے، حق کی مخالفت و عداوت کا یہ کیسا جنون ہے کہ اتنی موٹی سی بات بھی تمھاری سمجھ میں نہیں آ رہی ہے!

اس کے بعد قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین بتایا کہ وہ نہ یہودی تھے نہ نصرانی بلکہ حنیف مسلم تھے۔ "حنیف" کے معنی، جیسا کہ سورہ بقرہ میں وضاحت ہو چکی ہے، یکسو کے ہیں، یعنی وہ توحید کی صراط مستقیم پر تھے۔ انھوں نے اس سے ہٹ کر کج پیچ کی مشرکانہ راہیں نہیں اختیار کی تھیں اور وہ مسلم یعنی اپنے رب کے فرمانبردار تھے۔ اس سے یہ بات نکلی کہ یہودیت اور نصرانیت توحید سے ہٹی ہوئی کج پیچ کی راہیں ہیں جو ہدایت کے بجائے ضلالت کی طرف لے جاتی ہیں۔

اس کے ساتھ ہی اس بات کی بھی وضاحت فرما دی کہ جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہودیت اور نصرانیت سے کوئی تعلق نہیں ہے اسی طرح ان کو مشرکین سے بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ بات جملے کے عام سیاق سے الگ کر کے اس لیے فرمائی کہ یہ مشرکین بنی اسماعیل کی تردید میں ہے جو اس سورہ میں براہ راست مخاطب نہیں ہیں۔ اس سورہ کا خطاب، جیسا کہ اوپر وضاحت ہو چکی ہے، اہل کتاب بالخصوص نصاریٰ سے ہے، مشرکین کی تردید میں اگر اس میں کوئی بات آئی ہے تو وہ ضمناً ہی آئی ہے۔ یہ بات بھی ضمنی باتوں ہی میں سے ہے، اور اس کے ذکر کی ضرورت، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا، اس لیے تھی کہ جس طرح یہود اور نصاریٰ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نام کو اپنی گمراہیوں کی تائید میں پیش کرتے تھے اسی طرح بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ زور و شور کے ساتھ قریش کے مشرکین ان کے نام کو اپنی حمایت میں پیش کرتے تھے بلکہ ان کا تو یہ دعویٰ تھا کہ جس دین پر وہ ہیں، یہ دین ان کو حضرت ابراہیمؑ ہی سے وراثت میں ملا ہے۔

اس کے بعد یہ بتایا کہ ابراہیمؑ سے نسبت کے اصل حقدار وہ لوگ ہیں جنھوں نے ان کی پیروی کی ہے۔ یعنی یہ نسبت صرف خاندان اور نسب سے حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق اتباع اور اطاعت سے ہے۔ اس اعتبار سے حضرت ابراہیمؑ سے سب سے زیادہ اولیٰ و اقرب یہ پیغمبر (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان پر ایمان لانے والے صحابہؓ ہیں، نہ کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین جنھوں نے دینِ ابراہیمی کو بالکل مسخ اور برباد کیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ یہی اہل ایمان ہیں جن کا ساتھی اللہ ہے، وہ ان کی مدد فرمائے گا اور ان کے مخالفوں پر ان کو غالب کرے گا اس لیے کہ یہی اس دینِ حق پر ہیں جو حضرت ابراہیمؑ لے کر آئے تھے۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ۭ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۝ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۶۹-۷۱)

اہلِ کتاب کو ملامت

ان میں سے پہلی آیت کا خطاب مسلمانوں سے بطور تنبیہ ہے کہ یہود اور نصاریٰ یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ کو یہودیت اور نصرانیت کی ان بدعات سے کوئی ادنیٰ تعلق بھی نہیں تھا لیکن اس کے باوجود وہ محض اس لیے پروپگنڈا کر رہے ہیں کہ تمھیں تمھارے دینِ حق سے برگشتہ کریں حالانکہ اس کوشش سے وہ صرف اپنی ہی محرومی اور گمراہی کا سامان کر رہے ہیں۔ جو شخص اپنی گمراہی کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ دوسرے کو راہِ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے وہ سب سے پہلے خود اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے۔ لیکن دوسرے کی مخالفت کے جوش میں اس کو اپنی اس حرکت کے اصلی نتیجہ کا احساس نہیں ہوتا۔

بعد کی دو آیتوں میں خطاب اہلِ کتاب سے ہے اور دونوں میں "یا اہل الکتاب" کی تکرار سے حسرت اور ملامت کا اظہار ہو رہا ہے کہ افسوس ہے کہ اہلِ کتاب ہو کر تم نے رہنمائی کے بجائے گمراہ کرنے اور اظہارِ حق کے بجائے کتمانِ حق کا پیشہ اپنے لیے پسند کیا۔

"وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ" کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ آج تم اللہ کی جن آیات کا انکار کر رہے ہو، تمھارے دل ان کے باب میں گواہی دے رہے ہیں کہ یہ اللہ کی آیات ہیں۔ دوسرا یہ کہ آج حسد اور عداوت کے جوش میں تم جس حق کو جھٹلانے کے لیے اپنا ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہو اس کی تائید و تصدیق اور خلق کے آگے اس کی شہادت دینے کا تم سے عہد لیا جا چکا ہے اور تم اس ذمہ داری کے اٹھانے کا اقرار کر چکے ہو۔ پہلا مضمون محتاجِ ثبوت نہیں ہے۔ اس دوسرے مطلب کے لیے نظیر اسی سورہ میں آگے موجود ہے۔ فرمایا ہے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ	اور یاد کرو جب کہ اللہ نے تم سے نبیوں کے بارے
لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ	میں میثاق لیا کہ چونکہ میں نے تم کو کتاب و حکمت عطا فرمائی
وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ	ہے تو جب آئے تمھارے پاس ایک رسول سچی ثابت
مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ	کرتا ہوا ان پیشین گوئیوں کو جو تمھارے اپنے پاس موجود
بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ	ہیں تو تم اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی مدد کرو گے،
وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ	پوچھا کیا تم نے اس کا اقرار کیا اور اس پر میری طرف سے
قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا قَالَ فَاشْهَدُوْا	تم نے ذمہ داری اٹھائی؟ بولے ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا تو
وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝	اس پر گواہ رہنا اور میں بھی تمھارے ساتھ اس کے گواہوں
(۸۱ - آل عمران)	میں سے ہوں۔

اس آیت کی پوری تشریح آگے آ رہی ہے۔

حق اور باطل کو ایک دوسرے کے ساتھ گڈمڈ کرنے کی وضاحت سورۂ بقرہ کی تفسیر میں اچھی طرح ہو چکی

ہے۔ یہود نے یوں تو پوری تورات کو اپنی تحریفات سے مسخ کر ڈالا تھا جس کے سبب سے حق و باطل کا امتیاز مشکل ہو گیا تھا لیکن یہاں خاص طور پر ان کی ان تحریفات کی طرف اشارہ ہے جو انھوں نے حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسماعیلؑ اور تعمیر بیت اللہ سے متعلق حالات و واقعات اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئیوں کے اندر کی تھیں۔ ان تحریفات کا مقصد یہ تھا کہ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق مکہ اور بیت اللہ سے اس طرح کاٹ دیا جائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق انبیا کے بیان کردہ حقائق پر پردہ ڈالا جا سکے۔ قرآن کے الفاظ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانہ نزول قرآن کے علمائے یہود بھی ان تحریفات سے واقف تھے اور فی الواقع ان تحریفات کی نوعیت ہے ہی ایسی کہ بادنیٰ تامل ان پر گرفت کی جا سکتی ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ یہاں زیر بحث یہود کے عوام کا کردار نہیں بلکہ ان کے علما کا کردار ہے۔ سیاق و سباق اور آیت کے الفاظ اس پر دلیل ہیں۔

۱۷۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۲-۷۶

یہود کی بعض شرارتیں

آگے اہل کتاب، بالخصوص یہود کی بعض سازشوں اور شرارتوں کا ذکر کیا ہے جن کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیریں۔ پھر اس گہرے بغض و حسد کا پتہ دیا ہے جو بنی اسرائیل کے اندر بنی اسماعیل کے خلاف تھا جس کے سبب سے وہ کسی طرح بھی اس بات کو گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں تھے کہ بنی اسماعیل بھی ان کی طرح کتاب و شریعت کے حامل سمجھے جائیں اور اللہ کے ہاں ان کے جرائم کے گواہ بنیں۔ گویا اس جوش عداوت میں خدا کے فضل کے اجارہ دار وہ خود بن بیٹھے تھے کہ جس کو چاہیں اس میں سے حصہ دیں اور جس کو چاہیں محروم کر دیں۔

اس عداوت و حسد نے بنی اسماعیل کے خلاف بنی اسرائیل کے مجموعی اخلاق و کردار کو ایک خاص سانچے میں ڈھال دیا تھا۔ وہ ان کے معاملے میں کسی اخلاقی و شرعی ضابطے کی پابندی کے قائل نہیں تھے۔ ان کی رکھی ہوئی امانتوں میں خیانت کرنا وہ ثواب سمجھتے تھے کہ یہ کافر کا مال ہے، اس کو دبا بیٹھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ قرآن نے ان باتوں کا حوالہ اس لیے دیا کہ مسلمانوں کو متنبہ کرے کہ جن کا حسد اور بغض تمھارے خلاف اس حد تک بڑھا ہوا ہے ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ ان کا کوئی مشورہ تمھارے لیے خیر خواہانہ ہو سکتا ہے اور تمھارے حق میں ان کی زبان سے کوئی سچی بات نکل سکتی ہے۔ یہ تو تمھارے ایک پیسے کی بھی چوری کر سکتے ہیں، پھر ان سے یہ توقع کیسے رکھتے ہو کہ یہ تمھاری ایک لاکھ کی امانت ادا کر دیں گے اور تمھارے نبی کے بارے میں اس حق کی شہادت دیں گے جس کے وہ امین بنائے گئے تھے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ — آیات ۷۲-۷۶

عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ
يَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾ وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ
الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ
يُحَاۗجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ۭ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ
يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ
مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۷۴﴾ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ
مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ
تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ
قَاۗىِٕمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ
سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾
بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

ترجمۂ آیات ۷۲-۷۶

اور اہل کتاب کا ایک گروہ کہتا ہے کہ مسلمانوں پر جو چیز نازل کی گئی ہے اس پر صبح کو ایمان لاؤ اور شام کو اس کا انکار کر دیا کرو تاکہ وہ بھی اس سے برگشتہ ہوں اور تم اپنے دین کی پیروی کرنے والے کے سوا اور کسی کی بات کا اعتبار نہ کیا کرو۔ ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے۔ کہ مبادا اس طرح کی چیز کسی اور کو بھی مل جائے جس طرح کی چیز تمھیں ملی ہے یا وہ تم سے تمھارے رب کے حضور حجت کر سکیں۔ ان سے کہو کہ فضل تو اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑی سمائی رکھنے والا اور علم والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے

لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ ۷۲ - ۷۴

اور اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مانگنے پر لوٹا دیں گے اور ان میں وہ بھی ہیں کہ اگر تم ان کی امانت میں ایک دینار بھی رکھو تو وہ اس وقت تک اس کو لوٹانے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں کہ ان امیوں کے معاملے میں ہمارے اوپر کوئی الزام نہیں ہے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اللہ پر جھوٹ باندھتے ہیں —— ہاں، جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بے شک اللہ اپنے سے ڈرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ۷۵ - ۷۶

۱۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِيْٓ اُنْزِلَ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ (۷۲)

اہل کتاب کی اس سازش کا ذکر کرتے ہوئے قرآن نے اس بات کی تصریح فرما دی ہے کہ یہ ان کے ایک مخصوص گروہ کی سازش ہے۔ یہ تصریح اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن اپنے مخالفین کے جرائم بیان کرتے ہوئے بھی حق و انصاف کے حدود سے سرِ مُو تجاوز نہیں کرتا۔ اگر ایک جرم مخالف گروہ کی کسی مخصوص پارٹی ہی کا جرم ہے تو وہ اس کی ذمہ داری اسی پارٹی پر ڈالتا ہے، یہ نہیں کرتا کہ چند کی شرارت کی ذمہ داری مخالفت کے جوش میں پوری قوم پر اڑھا دے۔ یہ انصاف پسندی صداقت کے عام نصب العین سے قطع نظر دعوتِ حق کے نقطۂ نظر سے بھی نہایت بابرکت اور نتیجہ خیز ثابت ہوتی ہے۔ آگے اس کی بعض نہایت مؤثر مثالیں آ رہی ہیں۔

منافقانہ شرارت کی ایک خاص قسم

یہاں جس شرارت کا ذکر ہے وہ منافقانہ شرارت کی ایک مخصوص قسم ہے۔ وہ یہ کہ اپنے حریف کے سامنے اپنے آپ کو اس کا دوست اور ساتھی ظاہر کر کے اندر سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ یہود نے اپنے اس منصوبے کے تحت جو مختلف قسم کی چالیں چلیں، ان میں سے ایک چال یہ بھی تھی کہ ان کے

لیڈروں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ پہلے اپنے ایمان و اسلام کا اظہار و اعلان کر کے مسلمانوں کے اندر شامل ہوں، پھر اسلام کی کچھ خرابیوں کا اظہار کر کے اس سے علیحدگی اختیار کر لیا کریں۔ اس کا فائدہ انھوں نے ایک تو یہ سوچا ہوگا کہ اس طرح بہت سے جدید العہد مسلمانوں کا اعتماد اسلام پر سے متزلزل ہو جائے گا، وہ یہ سوچنے لگیں گے کہ فی الواقع اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کے سبب سے یہ پڑھے لکھے لوگ اسلام کے قریب آ کر اس سے بدک جاتے ہیں۔ دوسرا یہ کہ اس تدبیر سے وہ خود اپنی قوم کے عوام کو اسلام کے اثر سے بچا لے جائیں گے، جب وہ یہ دیکھیں گے کہ ان کی اپنی قوم کے کچھ پڑھے لکھے لوگ اسلام کو آزما کر چھوڑ چکے ہیں تو ان کی وہ رغبت کمزور ہو جائے گی جو اسلام اور مسلمانوں کی کشش کے سبب سے ان کے اندر اسلام میں داخل ہونے کے لیے پیدا ہوتی تھی۔

اس سازش کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یہود نے جب بھی کسی ملت کو اپنا نشانہ بنایا ہے اس کے لیے تدبیر یہی اختیار کی ہے کہ اس کے اندر گھس کر اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دین مسیحی کو بگاڑنے کے لیے پال نے جو کامیاب کوشش کی وہ مذاہب کی تاریخ کی ایک نہایت دردانگیز داستان ہے۔ پھر مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو مسخ کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ دونوں نے جو فتنے خود ہمارے کتب خانوں میں بیٹھ کر ہمدردانہ بھیس میں اٹھائے ہیں، وہ بھی کوئی مخفی چیز نہیں ہے۔ اگر طوالت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہاں بعض حقائق کی طرف اشارہ کرتے۔

وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ يَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۷۳-۷۴)

اسلوب کی بعض مشکلات

اس آیت کی تشریح و تفسیر میں ہمارے ارباب تاویل کو بڑا اضطراب پیش آیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں اسلوب کی بعض مشکلیں ہیں۔ ہم پہلے ان اسلوبوں کی وضاحت کریں گے اس کے بعد آیت کی صحیح تاویل بیان کریں گے۔

اس میں پہلی سمجھنے کی چیز قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ (کہہ دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے) کے ٹکڑے کا جملہ کے اندر مقام ہے۔ یہ ٹکڑا دراصل سلسلۂ کلام کا جزو نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت ایک جملہ معترضہ کی ہے۔ یعنی سلسلۂ کلام کے بیچ میں مخاطب کی ایک غلط بات کی برسرموقع تردید فرما دی گئی ہے۔ اصل سلسلۂ کلام یوں ہے کہ وَلَا تُؤْمِنُوٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ الآیۃ یہود جن لوگوں کو سکھا پڑھا کر مذکورہ بالا سازش کے لیے مسلمانوں کے اندر بھیجتے تھے ان کو پورے اہتمام کے ساتھ یہ تاکید بھی کر دیتے تھے کہ مسلمانوں کو ان کے دین سے برگشتہ کرنے کے لیے اسلام کا اظہار تو کر دیں لیکن بات بہرحال ماننی اپنے ہی لوگوں کی ہے، اپنے دائرہ سے باہر کسی کی بات ماننا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ یہ بات چونکہ یہود کی

تمام گمراہیوں کی جڑ تھی اس وجہ سے قرآن نے بالکل برسرِ موقع اس پر ٹوک دیا کہ یہ کیا اندھا بہرا گروہی تعصب ہے جس میں یہ مبتلا ہیں، ان سے کہو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے جس کی ان کو پیروی کرنی چاہیئے، خواہ وہ کسی اسرائیلی پیغمبر کے ذریعہ سے ملے یا کسی اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے۔ نجات کے حصول کا ذریعہ تو خدا کی ہدایت کی پیروی ہے نہ کہ یہودیت و نصرانیت۔ یہ بات چونکہ سورۂ بقرہ کی تفسیر میں پوری وضاحت سے بیان ہو چکی ہے، نیز آگے کی سورتوں میں بھی اس کی طرف اشارات آئیں گے اس وجہ سے یہاں اس کے شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

دوسری چیز اس آیت میں یہ سمجھنے کی ہے کہ 'اَنْ' سے پہلے عربی زبان میں بعض اوقات لفظ مخافۃ یا اس کے کوئی ہم معنی لفظ محذوف ہو جاتا ہے۔ اس حذف کی مثالیں کلامِ عرب میں بھی موجود ہیں اور قرآن میں بھی۔ فراہی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کے نظائر اپنی کتاب اسالیب القرآن میں جمع کر دیے ہیں۔ ہم بھی اپنی اس تفسیر میں جگہ جگہ اس کو واضح کر رہے ہیں۔

یہود کے دل کا ایک چور

اس اسلوب کو ذہن میں رکھنے کے بعد آیت سے مذکورہ بالا جملہ معترضہ کو الگ کر کے اگر اَنْ يُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِيْتُمْ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ کو وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِيْنَكُمْ کے ٹکڑے سے ملایئے تو معلوم ہوگا کہ یہ درحقیقت ان کے اس باطنی محرک پر روشنی ڈالی جا رہی ہے جس کے تحت وہ اپنے آدمیوں کو بڑے شد و مد کے ساتھ یہ سبق پڑھاتے تھے کہ وہ کسی حال میں بھی کسی غیر اسرائیلی نبی کے دعوے کی صداقت تسلیم نہ کریں۔ یہ باطنی محرک یہ ہے کہ ان کے دل میں یہ چور تھا کہ کہیں اس طرح کی دینی سیادت و پیشوائی بنی اسماعیل کو بھی حاصل نہ ہو جائے جس طرح کی سیادت اب تک صرف ان کو حاصل رہی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی دل میں تھا کہ اگر ہماری طرف سے کوئی اعتراف اس دین اور اس نبی کے حق میں زبان سے نکل گیا تو مسلمان اس کو قیامت کے دن ہمارے خلاف حجت بنائیں گے کہ ہم نے حق واضح ہونے کے باوجود اس کی تکذیب کی۔ قرآن نے ان کے دل کے اس چور کو ایک دوسرے مقام میں بھی پکڑا ہے جہاں یہ واضح فرمایا ہے کہ یہود اپنے لوگوں کو اس بات کی سخت تاکید کرتے رہتے تھے کہ آخری نبی اور آخری دین کے باب میں تورات کے کسی اشارے کو مسلمانوں پر نہ کھولا جائے ورنہ وہ اس چیز کو قیامت کے روز ان کے خلاف دلیل بنائیں گے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں یہ مضمون گزر چکا ہے۔

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا	اور جب یہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم بھی
اٰمَنَّا وَاِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ	ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ایک دوسرے
اِلٰى بَعْضٍ قَالُوْٓا اَتُحَدِّثُوْنَهُمْ	سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ تم مسلمانوں کو وہ باتیں بتاتے
بِمَا فَتَحَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ	ہو جو اللہ نے تمہارے اوپر کھولی ہیں تاکہ مسلمان ان
لِيُحَآجُّوْكُمْ بِهٖ عِنْدَ	کی بنا پر تمہارے رب کے سامنے تمہیں قائل کریں، کیا

رَبِّكُمْ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝	تم لوگ یہ بات نہیں سمجھتے؟ کیا یہ لوگ یہ نہیں جانتے
اَوَلَا يَعْلَمُوْنَ اَنَّ اللّٰهَ	کہ اللہ ان کی اس بات کو بھی جانتا ہے جو آپس میں
يَعْلَمُ مَا يُسِرُّوْنَ وَمَا	رازدارانہ طور پر کہتے ہیں اور اس بات کو بھی جانتا
يُعْلِنُوْنَ ۝ (۷۶-۷۷ بقرہ)	ہے جو وہ مسلمانوں سے علانیہ کہتے ہیں۔

ان دونوں اسلوبوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب آیت کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ یہود کے علما اور لیڈروں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ تم اپنی قوم کے اندر اس تعصب کی آگ بھڑکا رہے ہو کہ کسی اسرائیلی کے لیے کسی غیر اسرائیلی کی نبوت کی تصدیق جائز نہیں۔ حالانکہ یہ بات محض حماقت اور تنگ نظری پر مبنی ہے۔ اصل شے تو خدا کی ہدایت ہے جس کا تمھیں طالب ہونا چاہیے۔ خواہ وہ بنی اسرائیل کے کسی شخص پر نازل ہو یا بنی اسماعیل کے۔ تمھارا یہ تعصب حق کی عصبیت و حمیت کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ محض خوف و حسد کا نتیجہ ہے۔ تم ڈرتے ہو کہ مبادا وہ سیادت و پیشوائی جو اب تک صرف تمھیں حاصل رہی ہے کسی دوسرے کو حاصل ہو جائے۔ آیت میں اَحَدٌ کا لفظ ہے لیکن قرینہ دلیل ہے کہ یہاں اس اَحَدٌ کا اشارہ بنی اسماعیل ہی کی طرف ہے جن کے اندر نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی تھی۔ چونکہ یہاں بنی اسرائیل کے دل کے ایک راز کی طرف اشارہ کیا جا رہا ہے اس وجہ سے قرآن نے اس کو مبہم ہی رکھا ہے۔ اَوْ يُحَآجُّوْكُمْ سے، جیسا کہ ہم نے اوپر ذکر کیا، ان کے اس اندیشے کی طرف اشارہ ہے کہ اگر آج اسلام اور پیغمبر اسلام کے حق میں ان کے کسی آدمی کی زبان سے کوئی بات نکل گئی تو اس کو قیامت کے دن مسلمان ان کے خلاف حجت بنائیں گے۔

قرآن نے اس پر فرمایا کہ اپنی جس سیادت و پیشوائی کو بچانے کے لیے تم یہ جتن کر رہے ہو، یہ تمھارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ عزت و فضیلت اللہ کے ہاتھ میں ہے، وہ جس کو چاہے بخشتا ہے اور جس سے چاہے چھینتا ہے۔ اسی نے تم کو یہ عزت بخشی تھی اور اب وہی اگر اس کے لیے کسی دوسرے کو منتخب کر رہا ہے تو تم اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے۔ اس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و رحمت کو تمھارے تنگ پیمانوں سے ناپ کر نہیں دیتا جن میں تمھارے سوا کسی اور کے لیے کوئی گنجائش ہی نہیں ہے بلکہ وہ بڑی سمائی رکھنے والی ہستی ہے اور اس کا ہر فیصلہ علم و خبر پر مبنی ہوتا ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کون کس چیز کا مستحق ہے اور کون مستحق نہیں ہے۔

يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ الآیہ میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف کہ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت ایک عظیم اور بے پایاں برکت و رحمت ہے۔ دوسری اس بات کی طرف کہ یہ بنی اسماعیل پر اللہ تعالیٰ کا عظیم انعام ہے کہ اس نے ان کے خاندان کو اس عظیم اور عالم گیر برکت کے ظہور کے لیے منتخب فرمایا۔ اس سے لازمی نتیجہ کے طور پر دو باتیں نکلتی ہیں۔ ایک یہ کہ بنی اسماعیل پر یہ حق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس عظیم انعام کی قدر کریں اور اس کے شکر گزار رہیں۔ دوسری یہ کہ بنی اسرائیل کے غصہ

اور حسد کے علی الرغم اللہ تعالیٰ نے اپنی اس عظیم برکت سے امیوں کو نوازا۔ وہ جس کو چاہے اپنی رحمت کے لیے خاص کرنے، اس کی مشیت میں خود اس کی حکمت کے سوا اور کسی کو بھی دخل نہیں ہے۔

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۵)

اُمّیّین سے مراد

سبیل کا مفہوم

'اُمّیّٖن' سے مراد بنی اسماعیل ہیں۔ اس لفظ پر مفصل بحث ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں کر چکے ہیں۔ سَبِیْل کے معنی یہاں الزام اور مواخذہ کے ہیں۔ لَیْسَ عَلَیْنَا فِی الْاُمِّیّٖنَ سَبِیْل یعنی امیوں کے معاملے میں ہم پر کوئی الزام اور مواخذہ نہیں۔

یہود کا ایک من گھڑت فتویٰ

یہ قرآن نے امیین سے متعلق بنی اسرائیل کے ذہن اور ان کے مجموعی کردار کو واضح کیا ہے کہ وہ ان کی امانتوں میں خیانت کرنے اور ان کے مال کو ہڑپ کر جانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے بلکہ اس کو اپنی دینداری کا حق سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ تورات میں غصب، خیانت اور سود خواری وغیرہ کی جو ممانعت وارد ہے اس کا تعلق غیر قوموں خصوصاً کافر قوموں سے نہیں ہے۔ اپنے اس من گھڑت شرعی فتوے کے تحت انھوں نے دوسری قوموں سے ہر قسم کی بدمعاملگی جائز کر لی تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ عرب بنی اسماعیل کو بھی اسی فہرست میں داخل کرتے تھے اس وجہ سے ان کے مال کو بھی خیانت، بدعہدی یا سود وغیرہ کی راہ سے ہڑپ کرنا ان کے نزدیک کوئی قابلِ اعتراض بات نہیں تھی۔ اہلِ عرب، یہودی سود خواروں اور مہاجنوں کے پاس اگر کوئی چیز بطور امانت یا رہن رکھتے تو بڑا ہی کوئی قسمت والا ہوتا جو ان کے حلق سے اپنا مال نکالنے میں کامیاب ہوتا۔ وہ اس کو دبا بیٹھتے اور اپنے اس فعل کو ثواب ثابت کرنے کے لیے انھوں نے اپنے مولویوں سے فتوے بھی حاصل کر رکھے تھے کہ کافروں کا مال ہڑپ کر جانے میں کوئی عیب نہیں ہے۔

قرآن نے ان کا یہ کردار بہ نمایاں کرنے کے لیے واضح کیا ہے کہ جو تمہاری چند ٹکوں کی امانت واپس کرنے میں یہ لیت و لعل کرتے ہیں اور اس کے لیے انھوں نے اس اہتمام سے شرعی حیلے ایجاد کر رکھے ہیں، ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے نبی اور تمہارے مذہب و شریعت کے بارے میں یہ پچھلے نبیوں کی جن پیش گوئیوں کے امین بنائے گئے تھے ان کو وہ آسانی سے ادا کریں گے اور خلق کے سامنے ان کی شہادت دینے کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ جو لوگ دنیا کی نہایت حقیر چیزوں میں خائن ہیں وہ اتنی بڑی امانت ادا کرنے کے لیے دل گردہ کہاں سے لائیں گے!

لیکن یہود جیسی ذلیل قوم کے اس کردار کو بیان کرتے ہوئے بھی قرآن نے انصاف کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا، بلکہ ان میں جو اچھے کردار کے لوگ تھے ان کے کردار کی اچھائی کی داد دی بلکہ پہلے انھی کا ذکر

کیا تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس میدان میں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں۔ یہی لوگ تھے جو بعد میں اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوئے۔

وَيَقُولُونَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ، یہ ان کے اس من گھڑت اور خانہ ساز فتوے کی تردید کی ہے جس کا ذکر اوپر ہوا، کہ امیوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں وہ اخلاق و شریعت کی پابندیوں سے بری ہیں۔ یہ اللہ اور شریعت پر ان کا بہتان تھا اور اس کے خلاف شریعت ہونے سے وہ خود بھی واقف تھے لیکن محض اپنی خواہشات کی پیروی اور حرص دنیا میں انھوں نے اس قسم کے حیلے ایجاد کر لیے تھے۔ بعد میں یہی فتوے تحریف کی وجہ سے تورات میں داخل ہو گئے۔ یہاں تک کہ اب اگر کوئی تورات کو پڑھے تو وہ عام اخلاقی و انسانی حقوق و معاملات میں بھی محسوس کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے شریعت کچھ اور ہے اور غیر بنی اسرائیل کے لیے، جن کو تورات میں اجنبیوں اور پردیسیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، کچھ اور۔

بَلٰى مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ (۷۶)

اس آیت میں اور اس اسلوب پر جتنی بھی آیات ہیں سب میں جواب شرط محذوف ہوتا ہے۔ اس کی بعض مثالیں سورۂ بقرہ میں ہم پیش کر چکے ہیں۔ یہاں اگر جواب شرط کو واضح کیا جائے تو پوری بات یوں ہو گی کہ ہاں جو لوگ اللہ کے عہد کو پورا کریں اور حدود الٰہی کی حفاظت کریں تو وہ لوگ متقی ہیں اور اللہ متقین ہی کو دوست رکھتا ہے۔

اوپر والی باتوں پر استدراک

یہ آیت یہود کی اوپر والی باتوں پر استدراک کی حیثیت رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہود کا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ ان کے لیے خدا کے ہاں کوئی خاص مرتبہ و مقام ہے جس کے سبب سے وہ دوسروں سے بالاتر اور امیوں کے معاملے میں ذمہ داریوں سے بری ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اللہ کے ہاں جو مرتبہ و مقام بھی ہے وہ ان لوگوں کے لیے ہے جو خدا سے باندھے ہوئے عہد کو پورا کریں اور ہر طرح کے حالات میں اس عہد کے تحت قائم کردہ حدود کی نگہداشت کریں۔ جن لوگوں کی روش یہ ہو گی وہ اللہ کے نزدیک متقی ہیں اور اللہ ایسے ہی متقی بندوں کو دوست رکھتا ہے۔ جو لوگ خدا کے عہد اور اس کے حدود کو توڑنے میں بے باک ہیں اور اس کے باوجود تقویٰ اور محبوب الٰہی ہونے کے مدعی ہیں وہ محض خیالی پلاؤ پکا رہے ہیں۔

عام طور پر مترجمین قرآن نے اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ کا ترجمہ "اپنے عہد کو پورا کرتے ہیں" کیا ہے۔ میرے نزدیک ضمیر کا مرجع اللہ ہے۔ قرآن کے نظائر سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ آگے والی آیت ملاحظہ ہو۔ ابن جریرؒ نے بھی یہی تاویل کی ہے۔

۱۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۷۷-۸۰

آگے کی آیات میں پہلے تو اہل کتاب کی اس عہد شکنی بلکہ عہد فروشی پر عتاب ہے جس کا ذکر اوپر

ہوا ہے۔ فرمایا کہ اللہ نے ان کو اپنے کلام و پیام سے نوازا، ان کے لیے تعلیم و تزکیہ کا اہتمام فرمایا اور ان کو اپنی نگاہِ لطف و کرم سے مشرف کیا لیکن انھوں نے دنیا کے حقیر مفادات کے بدلے میں اللہ کے عہد کو فروخت کیا اور اس کی بے پایاں عنایات کی نہایت بے دردی کے ساتھ ناقدری کی اس وجہ سے اب آخرت میں ان کے لیے کوئی حصّہ باقی نہیں رہا۔

پھر ان کی بعض تحریفی کوششوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ اللہ نے جو کتاب انھیں ہدایت اور رہنمائی کے لیے عطا فرمائی، انھوں نے اس میں توڑ موڑ اور لچک پچکا کر اس غرض کے لیے تصرفات کیے کہ جو چیز اللہ کی کتاب کی نہیں تھی وہ کتاب کی سمجھی جائے۔

پھر اہلِ کتاب بالخصوص نصاریٰ کو دعوت دی ہے کہ وہ عقلِ سلیم کی روشنی میں غور کریں کہ آج جن باتوں کو وہ مسیح کی طرف منسوب کرتے ہیں وہ باتیں وہ کتاب و حکمت اور نبوت کے حامل ہوتے ہوئے کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔ ارشاد ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا آیات ۷۷-۸۰
اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ
اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ ۠ وَلَهُمْ عَذَابٌ
اَلِيْمٌ ﴿۷۷﴾ وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ
لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ
عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۸﴾ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ
دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ
الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا
الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ

ع ۸ / ۱۶ أَنۡتُمۡ مُّسۡلِمُوۡنَ ﴿۸۰﴾

ترجمۂ آیات ۷۷-۸۰

جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کو ایک حقیر قیمت کے عوض بیچتے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور اللہ نہ ان سے بات کرے گا، نہ ان کی طرف قیامت کے دن دیکھے گا اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ ۷۷

اور ان میں ایک گروہ ان لوگوں کا بھی ہے جو اپنی زبان کو کتابِ الٰہی کے ساتھ توڑتا موڑتا ہے تاکہ تم اس کو کتابِ الٰہی کا ایک حصہ سمجھو حالانکہ وہ کتابِ الٰہی کا حصہ نہیں اور وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ اللہ کے پاس سے ہے حالانکہ وہ اللہ کے پاس سے نہیں ہے۔ وہ اللہ پر جانتے بوجھتے جھوٹ باندھتے ہیں۔ ۷۸

کسی بشر کی شان نہیں کہ اللہ اس کو کتاب، قوتِ فیصلہ اور منصبِ نبوت عطا فرمائے پھر وہ لوگوں کو یہ دعوت دے کہ لوگو! اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ بلکہ وہ تو لوگوں کو یہی دعوت دے گا کہ لوگو! اللہ والے بنو، بوجہ اس کے کہ تم کتابِ الٰہی کی دوسروں کو تعلیم دیتے ہو اور خود بھی اس کو پڑھتے ہو اور نہ یہ ممکن ہے کہ وہ تمھیں یہ حکم دے کہ فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تمھیں کفر کا حکم دے گا بعد اس کے کہ تم خدا کے فرمانبردار ہو ۷۹-۸۰

۲۰- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

إِنَّ الَّذِيْنَ يَشْتَرُوْنَ بِعَهْدِ اللّٰهِ وَاَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا يَنْظُرُ اِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَا يُزَكِّيْهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ (۷۷)

اشتراء کا مفہوم — اشتراء کے لفظ پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں بحث گزر چکی ہے۔ جب مبادلہ چیز کا چیز سے ہو، جس کا عموماً قدیم زمانہ میں رواج تھا تو ہر شے مبیع بھی ہو سکتی ہے اور ثمن بھی۔ اس وجہ سے کسی شے کا اشتراء درحقیقت اس مفہوم میں خریدنا نہیں ہوتا تھا جس مفہوم میں ہم خریدنا بولتے ہیں بلکہ اس کا مفہوم مبادلہ ہوتا

تھا۔ اس وجہ سے 'اشتراء' کا لفظ بدلنے کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے اور پھر اس مفہوم سے ترقی کر کے ترجیح دینے کے معنی میں بھی۔

'عَهْدَ اللّٰهِ' سے مراد کتاب و شریعت ہے اس لیے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے۔ یہاں اس عام مفہوم کے اندر ایک خاص اشارہ اس عہد کی طرف بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے آخری بعثت کے باب میں لیا تھا اور جس کو اہل کتاب نے نہ صرف نسیاً منسیا کر دیا تھا بلکہ اس کے آثار انھوں نے اپنی کتابوں سے بھی مٹا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ 'عہد اللہ' سے مراد

'اَیْمَان' سے مراد وہ عام عہد و پیمان ہیں جن پر اجتماعی و تمدنی زندگی کی بنیاد ہوتی ہے اور جن سے معاشرتی زندگی اور معاملات میں اعتماد اور حسن ظن کی فضا بنتی ہے۔ یہود کا اس معاملے میں جو حال تھا وہ اوپر واضح ہو چکا ہے کہ انھوں نے امانتوں میں خیانت کرنے اور اپنے کیے ہوئے عہد و پیمان کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے کیسے کیسے شرعی حیلے ایجاد کر لیے تھے۔ 'ایمان' سے مراد

'لَا یُکَلِّمُهُمُ اللّٰهُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْهِمْ' میں فعل کی نفی اس کے حقیقی معنی کے اعتبار سے ہے یعنی اللہ تعالیٰ ان سے اس معنی میں کلام نہیں کرے گا یا ان کی طرف نظر نہیں کرے گا جو کلام کرنے اور نظر کرنے کا اصلی مفہوم ہے۔ یہ اسلوب عربی زبان میں عام ہے بلکہ ہر زبان میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنے قول و قرار کو اس طرح خریدنی و فروختنی چیز بنائے ہوئے ہیں اور اپنے دنیوی مفادات پر (جن کی بڑی سے بڑی مقدار بھی اجر آخرت کے بالمقابل حقیر ہی ہے) ان کو اس بے دردی سے قربان کر رہے ہیں ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ وہ اپنے جواہرات کو کوڑیوں کے عوض فروخت کر چکے ہیں اور جو لوگ اللہ کی امانت کے معاملے میں ایسے نااہل ثابت ہوئے ان سے نہ تو اللہ اب بات کرے گا، نہ ان کی طرف نظر کرے گا، اور نہ ان کو پاک کرے گا۔ اب آخرت میں ایسے شامت زدوں کے لیے دردناک عذاب کے سوا کچھ بھی نہیں ہے۔

الفاظ کے تیور جو لوگ پہچانتے ہیں وہ اندازہ کر سکتے ہیں کہ یہاں ان کے اندر کتنی نفرت اور کیسی شدید بیزاری چھپی ہوئی ہے لیکن اہل کتاب بالخصوص یہود اپنی ان کارستانیوں کے باعث جن کا اوپر ذکر ہوا اسی کے سزاوار تھے۔ خاص طور پر اس وجہ سے بھی کہ یہ وہ قوم تھی جس کو اللہ تعالیٰ نے اس کے پیغمبر کے واسطہ سے اپنے خاص کلام و خطاب کے شرف سے نوازا۔ یہ فرعونیوں کے قدموں کے نیچے روندی جا رہی تھی تو خدا نے اس پر عنایت کی نظر کی اور اس کو اس ذلت سے نکال کر سیادت و امامت کے تخت پر بٹھایا۔ اس کے تزکیہ کے لیے کتاب نازل فرمائی اور اس کو سنوارنے اور سدھارنے کے لیے اس کے اندر اپنے نبی اور رسول بھیجے لیکن اس قوم نے نہ تو اس خطاب و کلام کی کچھ قدر کی اور نہ اس نظر شفقت و عنایت اور اس تزکیہ و تطہیر کی، جس کا خدا اور اس کے نبیوں نے یہ کچھ اہتمام کیا تو اب اس قوم کا کیا منہ ہے کہ اللہ اس سے بات یہود سے شدید نفرت کا اظہار

کرے، یا اس کی طرف نظر کرے یا اس کو پاک کرے۔ اس نے تو اپنے اوپر امید کے سارے دروازے خود بند کر لیے۔

اس آیت میں تزکیہ کی جو نفی ہے اس کے دو پہلو ہو سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ آخرت تزکیہ کا محل نہیں ہے، اس کا محل یہ دنیا ہے۔ جب انھوں نے یہاں اس کا موقع ضائع کر دیا تو آخرت میں وہ اس کو حاصل نہ کر سکیں گے۔ دوسرا یہ کہ ان کے جرائم ایسے نہیں ہیں کہ یہ آخرت میں تھوڑی بہت سزا پا کر ان سے پاک ہو جائیں بلکہ یہ جرائم ان کو ہمیشہ ہمیش کے لیے جہنم میں لے ڈوبنے والے ہیں۔

وَاِنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيْقًا يَّلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ لِتَحْسَبُوْهُ مِنَ الْكِتٰبِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتٰبِ وَيَقُوْلُوْنَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَمَا هُوَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ (۷۸)

'لوی یلوی' کا مفہوم

لوی، یلوی، لَیًّا کے معنی کسی چیز کو بٹنے، توڑنے مروڑنے اور اینٹھنے کے ہیں۔ یَلْوٗنَ اَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتٰبِ کے معنی یہ ہوئے کہ کتابِ الٰہی کے بعض الفاظ ادا کرتے ہوئے وہ اپنی زبان اس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ الفاظ کچھ سے کچھ ہو جاتے ہیں۔

عہد الٰہی سے فرار کی ایک تدبیر

یہ اہل کتاب کی ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر ہے جو انھوں نے عہد الٰہی کی ذمہ داریوں سے فرار کے لیے اختیار کی تھیں۔ تفسیر بقرہ میں جہاں ہم نے تحریف کے سوال پر بحث کی ہے وہاں بتایا ہے کہ تحریف کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ قرأت کی راہ سے لفظ یا جملہ کا تلفظ توڑ مروڑ کر اس طرح بگاڑ دیتے تھے کہ اصل حقیقت بالکل گم ہو کر رہ جاتی تھی۔ اس جرم کا ارتکاب یہود اور نصاریٰ دونوں ہی نے کیا ہے۔ اس کی مثال میں ہم نے لفظ "مروہ" کا ذکر کیا ہے۔ یہ لفظ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کی سرگزشت کے سلسلہ میں آیا ہے کہ اس مقام پر ان کو بیٹے کی قربانی کا حکم ہوا۔ یہود نے اس قربانی کے واقعے میں جہاں کمی اور بیشی کی نوعیت کی بہت سی تبدیلیاں کی ہیں وہیں لفظ مروہ کی قرأت کو بگاڑ کر مریا، موریا، موریاہ، مورہ اور نہ جانے کیا کیا بنا یا تاکہ مکہ کی مشہور پہاڑی مروہ کے بجائے اس سے بیت المقدس کے کسی مقام کو مراد لے سکیں اور اس طرح حضرت ابراہیمؑ اور ان کی ہجرت و قربانی کے واقعہ کا تعلق بیت اللہ سے بالکل کاٹ دیں۔ مقصد اس ساری کاوش سے ان کا یہ تھا کہ اس ایر پھیر سے ان پیشین گوئیوں اور اشارات کا رُخ موڑا جا سکے جو بنی اسماعیل اور ان کے اندر نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق تورات کے صحیفوں میں وارد تھیں۔ اسی طرح کی حرکت انھوں نے لفظ "بکہ" کی قرأت میں کی جس پر آگے چل کر ہم بحث کریں گے۔

اس سازش کے ذکر کے بعد ان کی جسارت اور ڈھٹائی کی طرف توجہ دلائی کہ یہ حرکت وہ اس مقصد سے کرتے ہیں کہ جو چیز کتابِ الٰہی کی نہیں ہے اس پر کتابِ الٰہی کا لیبل چسپاں کر دیں اور جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں ہے اس کو اللہ کے نام پر پیش کریں۔ فرمایا کہ یہ جانتے بوجھتے اللہ کے اوپر جھوٹ باندھنا ہے اور اللہ پر جھوٹ باندھنے سے بڑی جسارت اور کیا ہو سکتی ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَالنَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ۭ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۷۹-۸۰)

"حکم" کے معنی قضا اور فیصلہ کے ہیں۔ اپنے اسی مفہوم کی روح کو لیے ہوئے یہ قرآن میں تین مختلف پہلوؤں سے استعمال ہوا ہے۔ — 'حکم' کے مختلف مفہوم

بعض جگہ مجرد فیصلہ کے معنی میں مثلاً وَكُنَّا لِحُكْمِهِمْ شٰهِدِيْنَ (۷۸۔ انبیاء) اور ہم ان کے فیصلہ کے وقت موجود تھے) اَفَحُكْمَ الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ۭ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا (۵۰۔ مائدہ) (کیا وہ جاہلیت کے فیصلہ کے طالب ہیں اور اللہ سے بڑھ کر کون فیصلہ کرنے والا ہے)

بعض مقامات میں قوتِ فیصلہ اور بصیرت کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً وَنُوْحًا اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا (۷۴۔ انبیاء) (اور نوح کو ہم نے قوتِ فیصلہ عطا فرمائی اور علم) وَاٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ۙ وَّحَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَزَكٰوةً (۱۲۔ مریم) (اور ہم نے اس کو بچپن میں فیصلہ کی قوت دی اور خاص اپنے پاس سے سوز و گداز اور پاکیزگی)

بعض آیات میں امر و حکم کے معنی میں ہے مثلاً فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ (۱۲۔ غافر) (پس حکم خدائے بلند و بزرگ کے لیے ہے) وَلَهُ الْحُكْمُ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ (۷۰۔ قصص) (اور اسی کے لیے حکم ہے اور تم اسی کی طرف لوٹائے جاؤ گے)

یہاں موقع و محل پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ لفظ اپنے دوسرے اور تیسرے مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔[1]

'ربانی' کا مفہوم

رَبَّانِيٌّ کے معنی خدا پرست اور اللہ والے کے ہیں۔ یہ لفظ عربی میں عبرانی سے آیا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ رِبِّيٌّ کا لفظ تورات اور انجیل میں بہت آیا ہے۔ صورت ذرا دونوں کی مختلف ہے لیکن معنا کوئی فرق معلوم نہیں ہوتا۔

اس آیت کا رخ خاص طور پر نصاریٰ کی طرف ہے جو اس سورہ میں اصلاً مخاطب ہیں۔ اب تک کی بحث بیشتر نقل پر مبنی تھی۔ اس آیت میں عقلِ سلیم کو مخاطب کیا ہے اور فرمایا ہے کہ سوچنے کی بات ہے کہ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایک انسان جس کو اللہ تعالیٰ کتاب و حکمت اور نبوت سے سرفراز فرمائے، وہ لوگوں کو اللہ کے بجائے اپنا بندہ بننے کی دعوت دے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہاری بدعات نہ صرف مسیح کی تعلیمات، تمہاری مسلمہ تاریخ، اور انبیا کے متفق علیہ عقاید کے بالکل خلاف ہیں بلکہ عقلِ سلیم بھی مسیح کی طرف ان کی نسبت قبول نہیں کر سکتی۔ اللہ تعالیٰ جب کسی بندے کو نبوت و رسالت کے منصب پر سرفراز فرماتا ہے اور اس

---

[1] لفظ حکم کی یہ تحقیق استاذ امامؒ کا افادہ ہے۔

کو کتاب و حکمت عطا فرماتا ہے تو اس لیے کہ وہ لوگوں کو دوسروں کی بندگی اور غلامی سے چھڑا کر خدا کی بندگی و غلامی میں لائے نہ کہ ان کو خدا سے چھڑا کر اپنا بندہ بنانے کی کوشش کرے۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ جس کو خدا نے اپنے گلّے کی تلاش کے لیے بھیجا وہ خود ہی اس کے گلّے کو بھٹکانے والا بن گیا۔ بھلا اس سے بڑی تہمت خدا کے ایک رسول پر اور کیا ہو سکتی ہے؟

اس کے بعد بتایا کہ ایک حامل کتاب و حکمت نبی اگر تمھیں دعوت دے سکتا ہے تو اس بات کی دے سکتا ہے کہ لوگو! خدا پرست اور اللہ والے بنو اس لیے کہ تمھارے کتابِ الٰہی کے پڑھنے پڑھانے والے ہونے کا اگر کوئی صحیح تقاضا ہو سکتا ہے تو یہی ہو سکتا ہے۔

پھر فرمایا کہ جس طرح وہ لوگوں کو اپنا بندہ بننے کی دعوت نہیں دے سکتا اسی طرح وہ یہ دعوت بھی نہیں دے سکتا کہ فرشتوں اور نبیوں کو اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ بنا لو اس لیے کہ دعوتِ ایمان کے ساتھ یہ کفر کی دعوت کس طرح جمع ہو سکتی ہے؟ کیا جو شخص تمھارے لیے ایمان و اسلام کی دعوت لے کر آئے گا وہی تمھیں مسلم بنانے کے بعد کفر میں جھونکنے کی کوشش کرے گا۔

اس آخری ٹکڑے میں خطاب میں ذرا وسعت پیدا ہو گئی ہے یعنی نصاریٰ کے ساتھ ساتھ اس میں ایک اشارہ قریش کی طرف بھی ہو گیا ہے جو فرشتوں اور نبیوں کے بھی بت بنا کر پوجنے لگے تھے۔

۲۱۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۸۱-۹۱

اب آگے پہلے ایک جامع میثاق کا حوالہ دیا ہے جو اہل کتاب سے انبیا علیہم السلام خصوصاً آخری نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کے لیے لیا گیا تھا اور اہل کتاب نے من حیث الجماعت اس کا اقرار کیا تھا لیکن اب وہ، جیسا کہ اوپر تفصیلات گزریں، اس کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کر رہے ہیں۔

پھر اہل کتاب سے باندازِ تعجب سوال کیا ہے کہ اگر وہ آخری نبی پر ایمان لانے اور اپنے باندھے ہوئے عہد کی ذمہ داریوں سے گریز اختیار کر رہے ہیں تو کیا وہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں؟ اللہ کا دین تو اسلام ہے اور یہی دین اس تمام کائنات کا دین ہے اس لیے کہ اس کائنات کی ہر چیز اپنے دائرۂ تکوینی میں طوعاً و کرہاً بہر حال اللہ ہی کی اطاعت کرتی ہے۔

اس کے بعد امتِ مسلمہ کے کلۂ جامعہ کا حوالہ دیا ہے کہ اگر یہ اہل کتاب اپنے تعصبات کی جکڑبند سے آزاد نہیں ہونا چاہتے تو تم ان کو ان کے حال پر چھوڑو اور یہ اعلان کر دو کہ ہم تمام انبیا پر ایمان لاتے ہیں، ان کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم خدا ہی کے فرمانبردار ہیں۔

پھر آگے کی آیات میں ان اہل کتاب کے انجامِ بد کا ذکر فرمایا ہے کہ بھلا یہ لوگ جنھوں نے ایمان کے بعد کفر کی راہ اختیار کی ہے اور آخری رسول کو پہچاننے کے بعد اس کی تکذیب کی ہے، خدا کی ہدایت سے

کس طرح بہرہ مند ہو سکتے ہیں۔ یہ تو اس کے سزاوار ہیں کہ ان پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام خلق کی لعنت ہو ——— اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّ آیات ۸۱-۱
حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ
بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ
اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ
الشّٰهِدِيْنَ ﴿۸۱﴾ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۸۲﴾
اَفَغَيْرَ دِيْنِ اللّٰهِ يَبْغُوْنَ وَلَهٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَ
الْاَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّاِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ﴿۸۳﴾ قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ
وَمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَ
اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِىَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَ
النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۫ وَنَحْنُ لَهٗ
مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ
مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِى الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾ كَيْفَ يَهْدِى اللّٰهُ
قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ
حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۸۶﴾
اُولٰٓئِكَ جَزَآؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ
اَجْمَعِيْنَ ﴿۸۷﴾ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا
هُمْ يُنْظَرُوْنَ ﴿۸۸﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا

فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ
ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الضَّآلُّوْنَ ﴿۹۰﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ
يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰى بِهٖ ۗ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ﴿۹۱﴾ ع ۹ ۱۱ ۱۷

ترجمۂ آیات ۸۱-۹۱

اور یاد کرو جب کہ خدا نے تم سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا۔ ہر گاہ میں نے تمھیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی، پھر آئے گا تمھارے پاس ایک رسول مصداق بن کر ان پیشین گوئیوں کا جو تمھارے پاس موجود ہیں تو تم اس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔ پوچھا کیا تم نے اس امر کا اقرار کیا اور اس پر میری ڈالی ہوئی ذمہ داری تم نے اٹھائی، بولے کہ ہم نے اقرار کیا۔ فرمایا کہ تو گواہ رہو اور میں بھی تمھارے ساتھ گواہوں میں سے ہوں۔ تو جو لوگ اس عہد کے بعد پھر جائیں گے وہی لوگ نافرمان ٹھہریں گے۔ ۸۱-۸۲

کیا یہ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں حالانکہ جو آسمان و زمین میں ہیں طوعاً و کرہاً سب اسی کے فرمانبردار ہیں اور سب اسی کی طرف لوٹائے جائیں گے تم کہہ دو کہ ہم تو اللہ پر اور اس چیز پر ایمان لائے جو ہم پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو ابراہیم اسماعیل، اسحاق، یعقوبؑ اور ان کی اولاد پر اتاری گئی اور اس چیز پر جو موسیٰ، عیسیٰ اور دوسرے نبیوں کو ان کے رب کی جانب سے دی گئی، ہم ان میں سے کسی کے درمیان تفریق نہیں کرتے اور ہم اسی کے فرمانبردار ہیں۔ اور جو اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب بنے گا تو وہ اس سے قبول نہیں کیا جائے گا اور وہ آخرت میں نامرادوں میں سے ہوگا۔

اللہ ان لوگوں کو کس طرح بامراد کرے گا جنھوں نے ایمان کے بعد کفر کیا درآنحالیکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں اور ان کے پاس کھلی کھلی نشانیاں بھی آچکی ہیں اور اللہ ظالموں کو بامراد نہیں کرے گا۔ ان لوگوں کا بدلہ یہ ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے لوگوں کی لعنت ہوگی۔ وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے نہ ان کا عذاب ہلکا کیا جائے گا، نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۔ البتہ جن لوگوں نے اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لی تو بے شک اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ جن لوگوں نے کفر کیا اپنے ایمان کے بعد اور اپنے کفر میں بڑھتے گئے ان کی توبہ ہرگز قبول نہیں ہوگی اور یہی لوگ اصلی گمراہ ہیں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی کفر کی حالت میں مر گئے اگر وہ زمین بھر سونا بھی فدیہ میں دیں تو قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان کے لیے عذاب دردناک ہے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

۸۳-۹۱

۲۲-الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۸۱-۸۲)

انبیا کے باب میں بنی اسرائیل سے میثاق

'مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ' میں اضافت فاعل کی طرف نہیں بلکہ مفعول کی طرف ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ انبیا سے میثاق لیا گیا بلکہ یہ مطلب ہے کہ انبیا کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے میثاق لیا۔ یہ میثاق، جیسا کہ آیت میں ذکر ہے، اس بات کے لیے تھا کہ بنی اسرائیل چونکہ کتاب و حکمت کے حامل اور امین بنائے گئے ہیں اس وجہ سے ان کے اس منصب کا فطری تقاضا یہ ہے کہ جو انبیا آئیں خاص طور پر آخری نبیؐ جب آئیں تو سب سے آگے بڑھ کر ان پر ایمان لائیں اور ان کی مدد کریں۔ اس عہد کا ذکر قرآن میں مختلف اسلوبوں سے ہوا ہے۔ مثلاً سورۂ مائدہ میں ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَىْ عَشَرَ نَقِيْبًا ؕ وَقَالَ — اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا۔ اور اٹھائے ہم نے ان میں سے بارہ نقیب اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمھارے

اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ (۱۲-مائدہ)

ساتھ ہوں اگر تم نماز کا اہتمام کرتے اور زکوٰۃ دیتے رہے اور میرے رسولوں پر ایمان لائے اور ان کی عزت کی اور اللہ کو قرض حسن دیتے رہے۔ میں تمھارے گناہ تم سے جھاڑ دوں گا اور تم کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ جس نے اس کے بعد تم میں سے کفر کیا تو وہ وسط شاہراہ سے بھٹک گیا۔

نبی امی کے باب میں میثاق

اس آیت میں رُسل کا لفظ ہے جو عام ہے لیکن ایک دوسری آیت میں نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریح بھی ہے۔ ملاحظہ ہو۔

فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِیْنَ یَتَّقُوْنَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِیْنَ هُمْ بِاٰیٰتِنَا یُؤْمِنُوْنَ ۝ اَلَّذِیْنَ یَتَّبِعُوْنَ الرَّسُوْلَ النَّبِیَّ الْاُمِّیَّ الَّذِیْ یَجِدُوْنَهٗ مَكْتُوْبًا عِنْدَهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ وَالْاِنْجِیْلِ یَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِهٖ وَعَزَّرُوْهُ وَنَصَرُوْهُ وَاتَّبَعُوا النُّوْرَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ مَعَهٗٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ۔ (۱۵۶-۱۵۷ اعراف)

پس میں اپنی اس رحمت کو ان لوگوں کے لیے لکھ رکھوں گا جو تقویٰ اختیار کریں گے، زکوٰۃ دیتے رہیں گے اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لائیں گے یعنی ان لوگوں پر جو اس رسول اور نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو وہ اپنے ہاں تورات اور انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں، جو انھیں نیکی کا حکم دیتا ہے، ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال ٹھہراتا ہے، ان پر گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور ان پر سے اس بوجھ اور ان پابندیوں کو دور کرتا ہے جو ان پر اب تک رہی ہیں۔ تو جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس کی توقیر اور مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو اس پر اتاری گئی، وہی فلاح پانے والے ہیں۔

ان آیات سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہود اور نصاریٰ دونوں ہی سے نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی تائید و نصرت کا عہد لیا گیا تھا، لیکن انھوں نے اس عہد کی کوئی پروا نہیں کی۔ اس عہد کے کچھ آثار تورات اور انجیل میں بھی موجود ہیں لیکن اب وہ تحریف کے گرد و غبار سے بہت بڑی حد تک دھندلے ہو چکے ہیں، مناسب موقع پر وہ زیر بحث آئیں گے۔

رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ سے مراد نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ کی وضاحت ہم بقرہ میں کر چکے ہیں۔ اس کے دو پہلو ہیں۔ ایک خاص اہمیت رکھنے والا پہلو یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم

کے ظہور اور آپؐ کی صفات اور کارناموں سے ان پیشین گوئیوں کا مصداق سامنے آیا تھا جو تورات اور انجیل میں موجود تھیں اور جن کے مصداق کے ظہور کے لیے اہل کتاب منتظر بھی تھے اور ان کو منتظر ہونا چاہیے بھی تھا۔ اس لیے کہ ان پیشین گوئیوں کی تصدیق سے سب سے پہلے انھی کا سر اونچا ہوتا۔ لفظ تصدیق کے اس مفہوم کے لیے ایک حماسی شاعر کا یہ شعر پیش نظر رکھیے۔

فدت نفسی وما ملکت یمینی ۔۔۔ فوارس صدقوا فیھم ظنونی

"میری جان اور میرا مال ان شہسواروں پر قربان جنھوں نے اپنے بارے میں میرے سارے گمان سچے ثابت کر دیئے۔"

اس پہلو سے اگر یہود و نصاریٰ غور کرتے تو وہ دیکھتے کہ حضورؐ کی بعثت سے خود ان کی اور ان کی کتابوں کی تصدیق ہو رہی ہے لیکن یہ ان کی شامت تھی کہ جس نے ان کی تصدیق کی اس کو انھوں نے جھٹلایا اور جس کی حجت اور جس کی شہادت کا بارِ گراں وہ اتنی مدت تک اٹھائے پھرے جب وہ آیا تو انھوں نے اس کی تکذیب کر دی۔

بنی اسرائیل میں میثاق لینے کی صورت

قَالَ ءَاَقۡرَرۡتُمۡ وَاَخَذۡتُمۡ عَلٰی ذٰلِکُمۡ اِصۡرِیۡ، کا ایک خاص موقع و محل ہے جس کو نگاہ میں رکھنا چاہیے تب اس ٹکڑے کا وزن سمجھ میں آجائے گا۔ موسوی شریعت میں یہ قاعدہ تھا کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس طرح کی ہدایات اترتیں تو حضرت موسیٰؑ ان کو انفرادی طور پر اپنے صحابہ کو صرف سنا دینے ہی پر اکتفا نہ فرماتے بلکہ بنی اسرائیل کی پوری جماعت یا کم از کم ان کے تمام سرداروں کو خیمۂ عبادت میں جمع کرتے، تابوت سامنے ہوتا، حضرت موسیٰؑ وعظ و تذکیر کے بعد خداوند خدا کا حکم سناتے پھر سب سے اس کی اطاعت کا اقرار لیتے سب کے اقرار کے بعد لوگوں کو اس کا گواہ رہنے کی تاکید کرتے، اور خدا کو اس پر گواہ ٹھہراتے۔ آخر میں اس حکم کی نافرمانی کے دنیوی و اخروی عواقب و نتائج سے بھی آگاہ فرما دیتے۔ اس طرح گویا اللہ تعالیٰ کا ہر امر و نہی اللہ تعالیٰ اور بنی اسرائیل کے درمیان ایک عہد و میثاق کا درجہ حاصل کر لیتا۔ اب یہ کس قدر عبرت کا مقام ہے کہ جس شریعت کے تحفظ کے لیے یہ جتن کیے گئے اس کے حاملوں نے اس کے ایک ایک عہد کے پرزے اڑا کے رکھ دیئے۔ اس روشنی میں فَمَنۡ تَوَلّٰی بَعۡدَ ذٰلِکَ کے الفاظ پر غور کیجیے تو بَعۡدَ ذٰلِکَ کا حقیقی وزن محسوس ہوگا کہ اس کے بعد بھی جو لوگ اپنے عہد سے منہ موڑیں تو ان سے بڑھ کر عہد شکن کون ہوگا؟ فاسق کا لفظ یہاں عام معنوں میں نہیں ہے بلکہ جس طرح ابلیس کے بارے میں وارد ہے کہ فَفَسَقَ عَنۡ اَمۡرِ رَبِّہٖ کہ وہ اپنے رب کے حکم سے نکل بھاگا اسی مفہوم میں یہاں بنی اسرائیل کے لیے استعمال ہوا۔

اَفَغَیۡرَ دِیۡنِ اللّٰہِ یَبۡغُوۡنَ وَلَہٗۤ اَسۡلَمَ مَنۡ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ طَوۡعًا وَّکَرۡہًا وَّاِلَیۡہِ یُرۡجَعُوۡنَ (۸۳)

اسلام تمام کائنات کا دین ہے

اہل کتاب کے اس تمام گریز و فرار پر اب یہ باندازِ استعجاب سوال کیا ہے کہ آخر اسلام اور پیغمبر اسلام سے اس سعیِ فرار کا مقصد کیا ہے؟ کیا اللہ کے دین کے سوا یہ اہل کتاب کسی اور دین کے طلبگار ہیں؟ اللہ کا دین ازل سے اسلام ہے۔ یہی دین اس نے تمام نبیوں اور رسولوں کو دیا اور یہی دین اس پوری کائنات کا دین ہے۔ سورج، چاند، ابر، ہوا اور آسمان و زمین سب اسی دین کے پیرو ہیں۔ اسلام کی حقیقت اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دینا ہے۔ کس کی مجال ہے جو خدا کے حکم اور اس کے قانون سے سرتابی کر سکے۔ جو اپنے محدود دائرۂ اختیار میں (اور یہ دائرۂ اختیار بھی خدا ہی کا قائم کردہ اور اسی کی مشیت کے تحت ہے) کوئی سرتابی کرتے بھی ہیں تو وہ بھی دائرۂ تکوینی کے اندر خدا کے قوانین کے تحت عاجز و سرفگندہ ہیں، کس کی تاب ہے کہ وہ زندگی اور موت کے طبعی قوانین سے بھاگ سکے۔ پس فطرت اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے محدود دائرہ اختیار میں بھی اسی خالق و مالک کے قوانین کی طوعاً تابعداری کرے جس کے قوانین کی تابعداری اپنے دائرۂ تکوینی میں کرہاً کر رہا ہے۔ اس طرح اس کی زندگی اس پوری کائنات کے ذرہ ذرہ سے ہم آہنگ و ہم رنگ ہو جائے گی۔ اس کے دائرۂ اختیار اور دائرۂ تکوینی دونوں میں کامل موافقت پیدا ہو جائے گی اور انسان خدا کی بخشی ہوئی آزادی کو خدا ہی کی شریعت کے حوالہ کر کے اپنے آپ کو فرشتوں اور نبیوں کی طرح خدا کے رنگ میں رنگ لے گا۔ یہی اسلام ہے۔ یہی صبغۃ اللہ ہے۔ یہی خدا کا دین ہے۔ یہی مذہب آدمؑ، یہی دعوتِ نوحؑ اور یہی ملتِ ابراہیمؑ ہے اور اسی کی دعوت لے کر یہ آخری نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) آئے ہیں۔ پھر اس دینِ فطرت اور اس دینِ کائنات کو چھوڑ کر یہ اہل کتاب —— اہل کتاب ہو کر —— کس دین کے طلبگار ہیں۔

"وَاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح اس زندگی میں خدا کے قانون سے فرار کی کوئی راہ نہیں ہے اسی طرح آگے بھی راہ رُندھی ہوئی ہے۔ جو مر کے اس سے چھوٹتا ہے وہ بھی چھوٹتا نہیں بلکہ وہ بھی خدا ہی کے پاس جاتا ہے اور اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرتا ہے۔

قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ عَلٰٓی اِبْرٰھِیْمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَالنَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ۪ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ۫ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ (۸۴)

اسلام کا کلمۂ جامعہ

یہ آیت بعینہٖ سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے تمام الفاظ اور مطالب پر بحث ہو چکی ہے ملاحظہ ہو آیت ۱۳۶ بقرہ۔ یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے اسلام کے کلمہ جامعہ کا اعلان کرایا گیا ہے اور سیاقِ کلام یہ ہے کہ یہ اہل کتاب اگر اسلام کے سوا کسی اور دین کے طالب ہیں تو انھیں ان کی خواہش کے حوالہ کرو۔ شیطان جس وادی میں چاہے ان کو ٹھوکر کھلائے۔ تم ان کے پیچھے اپنی اوقات رائیگاں نہ کرو بلکہ اعلان کر دو کہ ہم تو اللہ اور اس کے اس دین پر ایمان لائے جو تمام انبیا کا دین ہے۔ ہم ان انبیا میں کوئی تفریق نہیں کرتے کہ کسی کو مانیں، کسی کو نہ مانیں۔ ہم سب پر ایمان رکھتے ہیں اور ہم خدا ہی کے فرمانبردار ہیں

اور اپنے آپ کو اسی کے حوالہ کرتے ہیں۔

وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ (۸۵)

اسلام کے حق میں دلائل واضح کر دینے کے بعد اب یہ صاف الفاظ میں اعلان فرما دیا کہ جو لوگ اسلام کے سوا کسی اور دین کے طالب بنیں گے یا اس پر جمے رہیں گے، عام اس سے کہ وہ یہودیت ہو یا نصرانیت یا کوئی اور دین، وہ اللہ کے ہاں قبول نہ ہوگا۔ ایسے لوگ آخرت میں محروم و نامراد ہوں گے۔

كَيْفَ يَهْدِي اللّٰهُ قَوْمًا كَفَرُوْا بَعْدَ اِيْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ اَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللّٰهِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ۝ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُوْنَ ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ وَاَصْلَحُوْا ۣ فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۸۶-۸۹)

لفظ 'ہدایت' کا خاص مفہوم

لفظ 'ہدایت' پر ہم بقرہ میں بحث کر چکے ہیں کہ اس کے تین مرحلے ہیں۔ آخری مرحلہ اس کا ہدایت آخرت کا ہے۔ اس مرحلہ میں غایت و مقصود کی طرف ہدایت ہوتی ہے اور بندہ اپنی مساعی کے ثمرہ سے بہرہ مند اور اپنی جد و جہد زندگی کے حاصل سے بامراد ہوتا ہے۔ ہدایت کا لفظ اس معنی میں بھی قرآن میں جگہ جگہ استعمال ہوا ہے۔ مجھے بار بار خیال ہوتا ہے کہ 'یھدی' اس آیت میں اسی معنی میں ہے۔ استاذ مرحوم اس سے ہدایت کا عام مفہوم ہی مراد لیتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہاں بنی اسرائیل کے لیے جس ہدایت کی نفی ہے وہ من حیث القوم ہے، من حیث الافراد نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو قوم ایسے شدید جرائم کی مرتکب ہوئی ہے اس کے لیے اسلام کی راہ کس طرح کھل سکتی ہے!

'شھدوا' میں شہادت سے مراد دل کی شہادت ہے کہ ان اہل کتاب کے دل مانتے ہیں کہ یہ رسول سچے ہیں۔ ان کی وہ نشانیاں جو ان پر ظاہر ہوئی ہیں وہ اس قدر واضح ہیں کہ ان کی صداقت پر ان کے دل گواہی دیتے ہیں لیکن محض ضد، تعصب اور حسد کے سبب سے اس کو جھٹلاتے ہیں۔

یہ اوپر والی آیت کی توجیہہ بیان ہوئی ہے کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو کس طرح بامراد کر سکتا ہے جنھوں نے ایمان کے بعد کفر اختیار کیا، جن کے پاس اس رسول کی صداقت کی کھلی ہوئی نشانیاں آ چکی ہیں لیکن وہ ان کی تکذیب کر رہے ہیں، جن کے دل گواہی دیتے ہیں کہ یہ رسول برحق ہیں لیکن پھر بھی ان کی زبانیں اس کو جھٹلاتی ہیں؟ ایسے لوگ اپنی فطرت، اپنی عقل اور اپنی روح پر بہت بڑا ظلم ڈھانے والے ہیں اور یہ سنت الٰہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو بامراد نہیں کرتا جو خود اپنے ہاتھوں اپنے نشاناتِ راہ گم کریں اور اپنے آپ کو خود ٹھوکر کھلائیں۔ ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور ساری خلقت کی لعنت ہو۔ 'الناس' کے ساتھ 'اجمعین' کی تاکید اس بات کو ظاہر کرتی ہے کہ قیامت کے دن ان پر نیک اور بد سب ہی لعنت کریں گے۔ نیکوں کی لعنت کی وجہ تو واضح ہے، بد اس لیے

لعنت کریں گے کہ وہ ان کے سبب سے گمراہ ہوئے ـــ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ قیامت کے دن گمراہ لیڈر اور ان کے گمراہ پیرو دونوں ایک دوسرے پر لعنت کریں گے۔ پیرو کہیں گے کہ تم نے ہمیں برباد کیا، اگر تم ہماری راہ نہ مارتے تو ہم ہدایت پر ہوتے۔ لیڈر کہیں گے ہم جیسے تھے ویسا ہی ہم نے تم کو بنایا، تم خود شامت زدہ تھے کہ تم نے ہدایت کی راہ اختیار نہ کی۔

خٰلِدِیْنَ فِیْهَا میں ضمیر کا مرجع دوزخ ہے۔ اگرچہ دوزخ کا ذکر الفاظ میں موجود نہیں ہے لیکن اوپر جس لعنت کا ذکر ہے اس نے اس کا ایسا واضح قرینہ بہم پہنچا دیا ہے کہ لفظوں میں اس کے ذکر کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ گویا لعنت خود عذاب کی قائم مقام بن گئی۔ زبان میں اس اسلوب کی مثالیں بہت ہیں۔ سورۂ حدید کی تفسیر میں ہم اس اسلوب پر بحث کریں گے۔ اس عذاب کی نسبت فرمایا کہ نہ اس میں کسی مرحلے میں کوئی تخفیف ہوگی اور نہ اس سے ان کو کبھی مہلت ملے گی۔ اس میں پڑ جانے کے بعد ان کے لیے امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے البتہ وہ لوگ اس عذاب سے بچ جائیں گے جو ان تنبیہات کے بعد توبہ کر کے اپنے حالات کی اصلاح کر لیں گے اور جن حق پوشیوں کے اب تک مجرم ہوئے ہیں ان کا برملا اظہار و اعلان کر دیں گے۔ اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّنْ تُقْبَلَ تَوْبَتُهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الضَّآلُّوْنَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا وَّلَوِ افْتَدٰی بِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ وَّمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ (۹۰-۹۱)

ان لوگوں کا بیان جن کی توبہ قبول نہیں ہوتی

یہ ان لوگوں کا بیان ہے جن کی توبہ قبول نہیں ہوگی۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان تمام جرائم کا ارتکاب کر کے، جن کا ذکر اوپر ہوا، ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے۔ پھر اس کفر پر ردّے کے بعد ردّے چڑھاتے چلے گئے۔ جب وقت آخر آیا تو زبان سے توبہ توبہ کر لی، نہ اپنے جرائم کی اصلاح کی، نہ اپنی حق پوشیوں کا پیغمبر اور اہل ایمان کے سامنے اظہار و اعتراف کیا، نہ اللہ کی راہ میں انفاق اور پیغمبر کی حمایت و نصرت سے اپنے گناہ دھونے کی کوشش کی۔ بلکہ جیسا کہ قرآن میں اشارہ ہے، اس غلط آرزو میں مر گئے کہ سَیُغْفَرُ لَنَا اللہ ہماری ساری غلطیوں کو معاف فرما دے گا۔ قرآن نے یہاں واضح فرما دیا کہ جو لوگ اس قسم کی طمع خام میں مبتلا ہیں، نہ ان کی یہ توبہ توبہ ہے، نہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی توبہ کو پذیرائی بخشے گا۔

اسی طرح کا معاملہ ان لوگوں کا ہے جو ایمان کے بعد کفر میں مبتلا ہوئے اور اسی حالتِ کفر میں مر گئے۔ فرمایا کہ اگر اس طرح کے لوگ زمین برابر سونا بھی اپنے آپ کو عذابِ الٰہی سے بچانے کے لیے فدیہ میں دیں تو بھی قبول نہیں ہوگا۔ یہ اسلوبِ بیان محض ان کی نجات کے عدم امکان کی تعبیر کے لیے اختیار کیا گیا ورنہ آخرت میں نہ کسی کے پاس فدیہ میں دینے کے لیے کچھ ہوگا، نہ آخرت اس قسم کے لین دین کی کوئی جگہ ہے۔ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ، میں ان لوگوں کی اس طمع خام کی نفی ہے جو یہ اپنے بزرگ اسلاف کی شفاعت

کی رکھتے تھے۔ فرمایا کہ آخرت میں ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔

یہ مضمون سورہ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ وہاں ہم نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے، آیت ہم یہاں بھی نقل کیے دیتے ہیں تاکہ زیر بحث آیت کے بعض مضمرات روشنی میں آجائیں۔ فرمایا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یَکْتُمُوْنَ مَآ اَنْزَلْنَا	بے شک جو لوگ ان واضح آیات اور اس ہدایت کو چھپاتے
مِنَ الْبَیِّنٰتِ وَالْهُدٰی مِنْ بَعْدِ مَا	ہیں جو ہم نے اتاری ہے، بعد اس کے کہ ہم نے اس کو
بَیَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِی الْكِتٰبِ اُولٰٓئِكَ	اپنی کتاب میں لوگوں کے لیے اچھی طرح واضح کر دیا ہے
یَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَیَلْعَنُهُمُ اللّٰعِنُوْنَ ۝	وہی لوگ ہیں جن پر اللہ بھی لعنت کرتا ہے اور ان پر لعنت
اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَبَیَّنُوْا	کرنے والے بھی لعنت کریں گے، البتہ وہ لوگ اس سے
فَاُولٰٓئِكَ اَتُوْبُ عَلَیْهِمْ وَاَنَا التَّوَّابُ	مستثنیٰ ہیں جو توبہ کر لیں اور اپنی اصلاح کریں اور کھول
الرَّحِیْمُ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا	دیں چھپائی ہوئی باتوں کو۔ یہی لوگ ہیں جن کی توبہ میں
وَمَاتُوْا وَهُمْ كُفَّارٌ اُولٰٓئِكَ عَلَیْهِمْ	قبول کروں گا اور میں توبہ قبول کرنے والا اور رحم کرنے والا
لَعْنَةُ اللّٰهِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالنَّاسِ	ہوں۔ بے شک جن لوگوں نے کفر کیا اور اسی حالت کفر
اَجْمَعِیْنَ ۝ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا لَا یُخَفَّفُ	میں مر گئے ان پر اللہ کی، اس کے فرشتوں کی اور سارے
عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ	لوگوں کی لعنت ہے، اس میں ہمیشہ رہیں گے، نہ ان کا
یُنْظَرُوْنَ ۝ (۱۵۹-۱۶۲ بقرہ)	عذاب ہلکا کیا جائے گا اور نہ ان کو مہلت ہی دی جائے گی۔

۲۳۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۹۲-۹۹

اوپر کا مضمون اگر ذہن میں موجود ہے تو آگے کا سلسلہ بیان سمجھنے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ اوپر آیت ۶۳ سے یہ بحث شروع ہوئی تھی کہ یہود اور نصاریٰ ملت ابراہیمؑ پر ہونے کا جو دعویٰ کرتے ہیں محض بے بنیاد دعویٰ ہے۔ ملت ابراہیمؑ پر یہ پیغمبرؐ اور ان کے ساتھی ہیں لیکن یہ یہود و نصاریٰ طرح طرح کی سازشوں اور تحریفوں سے اصل حقائق پر پردہ ڈالنا اور خلق کو گمراہ کرنا چاہتے ہیں کہ قربانی کوئی نہ دینی پڑے۔ بس دینداری کی چند جھوٹی سچی رسمیں ادا کر کے خدا کی وفاداری کے سب سے اونچے مقام کے حق دار سمجھے جاتے رہیں۔

یہاں سب سے پہلے تو یہ مغالطہ دور فرمایا کہ خدا کی وفاداری کا مقام محض جھوٹی رسم داری اور نمائشی دین داری سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ اصل شے یہ ہے کہ خدا کی راہ میں ان چیزوں میں سے خرچ کرو جو تمھیں محبوب ہیں۔ جب تک انسان خدا کے لیے اپنی محبوبات کی قربانی کا عادی نہیں ہوتا اس وقت تک اس میں خدا کے عہد و پیمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کا حوصلہ پیدا نہیں ہوتا۔

مسلمانوں پر ملتِ ابراہیم کی مخالفت کا الزام

اس کے بعد ضمنی طور پر یہود کے ایک اعتراض کا جواب دیا ہے جو انھوں نے مسلمانوں کو ملتِ ابراہیمؑ کے خلاف ثابت کرنے کے لیے اٹھایا تھا۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے ہاں کھانے پینے کی بعض ایسی چیزیں جائز ہیں جو یہود کے زعم کے مطابق ابراہیمی شریعت میں حرام تھیں۔ مثلاً اونٹ کی نسبت ان کا دعویٰ تھا کہ یہ حضرت ابراہیمؑ کی شریعت میں حرام ہے لیکن مسلمانوں کے ہاں نہ صرف یہ کہ حلال طیب ہے بلکہ ان کے ہاں یہ محبوب ترین مال ہے اور وہ اس کے نحر اور قربانی کو بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں۔ اس پروپیگنڈے سے ان کا مقصد، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، محض عوام کو یہ باور کرانا تھا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اور ان کے ساتھی ملتِ ابراہیمؑ سے برگشتہ ہیں۔ قرآن نے اس کا جواب دے دیا کہ یہ بات محض یہود کا افترا ہے۔ تورات خود اس بات پر شاہد ہے کہ اونٹ کی حرمت کا تعلق اگر ہے تو شریعتِ موسوی سے ہے نہ کہ شریعتِ ابراہیمی سے۔

اس ضمنی اعتراض کا جواب دینے کے بعد ان کو پھر ملتِ ابراہیمی کی پیروی کی دعوت دی ہے اور ان پیشین گوئیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے جو تورات میں خانہ کعبہ کی اولیت، اس کی مرکزیت اور اس کے سرچشمۂ برکت و ہدایت ہونے کے باب میں وارد تھیں لیکن ان پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی، نیز ان نشانیوں کی طرف توجہ دلائی ہے جو صاف شہادت دیتی ہیں کہ اسی سرزمین کو حضرت ابراہیمؑ نے اپنا مسکن بنایا، اسی کو دارالامن قرار دیا، اسی کو حج و عبادت کا مرکز ٹھہرایا اور ہزاروں سال سے ان کی ذریت اس سرزمین پر ان کے نام اور ان کی روایات کی حامل چلی آ رہی ہے۔

آخر کی دو آیتوں میں اہل کتاب کو ملامت کی ہے کہ جس راہ کی نشان دہی کے لیے تم خدا کی طرف سے مقرر کیے گئے تھے یہ کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ تم اس سے لوگوں کو روکنے اور اس کو گم کرنے کے لیے اپنی کوششیں صرف کر رہے ہو۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

آیات ۹۲-۹۹

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ
شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿۹۲﴾ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا
لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اِلَّا مَا حَرَّمَ اِسْرَآءِيْلُ عَلٰى نَفْسِهٖ مِنْ
قَبْلِ اَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرٰىةُ ۭ قُلْ فَاْتُوْا بِالتَّوْرٰىةِ فَاتْلُوْهَآ
اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۳﴾ فَمَنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ
مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۹۴﴾ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ

فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۹۵﴾
اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى
لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۶﴾ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ
كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ
سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۹۷﴾ قُلْ
يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ۖ وَاللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى
مَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۸﴾ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ تَبْغُوْنَهَا عِوَجًا وَّاَنْتُمْ شُهَدَآءُ ؕ وَمَا اللّٰهُ
بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۹﴾

ترجمۂ آیات ۹۲-۹۹

تم خدا کی وفاداری کا درجہ ہرگز نہیں حاصل کر سکتے جب تک ان چیزوں میں سے نہ خرچ کرو جن کو تم محبوب رکھتے ہو اور جو کوئی چیز بھی تم خرچ کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے۔ ۹۲

کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، مگر وہ جو اسرائیل نے تورات کے نازل کیے جانے سے پہلے اپنے اوپر حرام ٹھہرا لی تھیں۔ کہہ دو لاؤ تورات اور اس کو پڑھو اگر تم سچے ہو۔ جو لوگ اس کے بعد بھی اللہ پر جھوٹ باندھیں وہی لوگ ظالم ہیں۔ ۹۳-۹۴

کہہ دو اللہ نے سچ فرمایا تو ابراہیم کی ملت کی پیروی کرو جو حنیف تھا اور مشرکین میں سے نہ تھا۔ بے شک پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا وہی ہے جو مکہ میں ہے۔ عالم والوں

کے لیے برکت اور ہدایت کا مرکز۔ وہاں واضح نشانیاں ہیں، مسکن ابراہیم ہے۔ جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون ہے۔ اور جو لوگ وہاں تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہیں ان کے اوپر اللہ کے لیے اس گھر کا حج ہے اور جس نے کفر کیا تو اللہ عالم والوں سے بے پروا ہے۔ ۹۵-۹۷

پوچھو اے اہل کتاب تم اللہ کی آیتوں کا کیوں انکار کرتے ہو، درآنحالیکہ جو کچھ تم کر رہے ہو سب خدا کی نظر میں ہے؟ کہو، اے اہل کتاب تم ایمان لانے والوں کو اللہ کی راہ سے کیوں روک رہے ہو، تم اس میں کجی پیدا کرنی چاہتے ہو حالانکہ تم گواہ بنائے گئے ہو۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔ ۹۸-۹۹

۲۴۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ (۹۲)

خدا کے ساتھ وفاداری کی شرط محبوب مال کا انفاق

لفظ 'برّ' کی تحقیق تفسیر سورہ بقرہ میں گزر چکی ہے۔ اس لفظ کی اصل روح ایفائے عہد اور ادائے حقوق و فرائض ہے عام اس سے کہ یہ خدا کے حقوق و فرائض ہوں یا اس کے بندوں کے۔ بنی اسرائیل ایفائے عہد اور ادائے حقوق کے معاملے میں تو بالکل صفر تھے لیکن محض چند رسوم کی ظاہر دارانہ پیروی کر کے یہ سمجھتے تھے کہ خدا کی وفاداری میں جو مرتبہ و مقام ان کا ہے وہ کسی کا نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی زعم میں وہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیمؑ اور دوسرے تمام انبیا کی وراثت کا تنہا اجارہ دار سمجھتے تھے اور یہ سوچنے کے لیے بھی تیار نہ تھے کہ کوئی اس میدان میں ان کا حریف ہو سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں ان کے اسی زعم باطل پر ضرب لگائی ہے کہ خدا کی وفاداری کا مقام مجرد خالی خولی دعووں اور چند رسموں کے ادا کر دینے سے نہیں حاصل ہو جاتا بلکہ اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک تم خدا کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں میں سے خرچ نہ کرو اس وقت تک تمہارا یہ دعویٰ بالکل بے دلیل ہے۔

محبت اور وفاداری کی جانچ کے لیے یہ کسوٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو فی الحقیقت بنی اسرائیل کا سارا بھرم کھول دینے کے لیے کافی تھی اس لیے کہ دینداری کی بے خرچ ظاہر داریاں تو وہ کسی نہ کسی حد تک نباہتے

کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن جہاں معاملہ خرچ کرنے کا پیش آجائے اور وہ بھی محبوب مال کے خرچ کرنے کا تو پھر ان کا سارا دعوائے عشق و محبت ہرن ہو جاتا۔ حالانکہ جن حضرت ابراہیمؑ کی پیروی اور جن کی وراثت و نیابت کے وہ تنہا اجارہ دار بنے بیٹھے تھے ان کے متعلق جانتے تھے کہ ان کو خدا کی وفاداری کا جو مقام حاصل ہوا محض زبانی جمع خرچ سے نہیں حاصل ہوا بلکہ اپنے محبوب اکلوتے بیٹے کی قربانی سے حاصل ہوا۔

قرآن نے یہود کی اس رسمی دینداری پر جگہ جگہ تعریض کی ہے مثلاً فرمایا ہے۔

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُوَلُّوا وُجُوهَكُمْ قِبَلَ	خدا کی وفاداری کا حق اس سے ادا نہیں ہو جاتا کہ اپنا
الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ	رخ مشرق اور مغرب کی طرف کر دو بلکہ اصل وفاداری
آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ	تو ان کی ہے جو اللہ پر، یوم آخرت پر، فرشتوں پر،
وَالْكِتَابِ وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَىٰ حُبِّهِ	کتاب پر اور نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اپنے مال
ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينَ	اس کے محبوب ہونے کے باوجود دیتے ہیں قرابت مندوں
وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي	کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، مسافر کو، سائلوں کو نیز اس
الرِّقَابِ وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى	کو خرچ کرتے ہیں گردنوں کو آزاد کرانے میں۔ اور نماز کا
الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا	اہتمام کرتے ہیں، زکوٰۃ دیتے ہیں اور جب عہد کر بیٹھیں
عَاهَدُوا وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ	تو اپنے عہد کو پورا کرنے والے ہیں اور خاص کر وہ لوگ
وَحِينَ الْبَأْسِ ۗ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ صَدَقُوا	جو بھوک اور بیماری میں اور جنگ کے وقت ثابت قدم
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ (۱۷۷۔ بقرہ)	رہنے والے ہوں۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ شَيْءٍ الآیۃ (اور جو کوئی چیز بھی تم اللہ کی راہ میں خرچ کرو گے تو اللہ اس سے باخبر ہے) سے مقصود اس کا لازم ہے۔ یعنی خدا جب تمہارے خرچ کیے ہوئے پیسے پیسے سے باخبر ہے تو اطمینان رکھو کوئی جبہ ضائع جانے والا نہیں ہے۔ اگر ایک خرچ کرو گے تو دس گنے سے لے کر سات سو گنے تک پاؤ گے اور اللہ کا فضل مزید براں ہے جس کی کوئی حد و نہایت ہی نہیں۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِبَنِي إِسْرَائِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَائِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِ مِنْ قَبْلِ أَنْ تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا بِالتَّوْرَاةِ فَاتْلُوهَا إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ۝ فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ (۹۳-۹۴)

یہود کے ایک اعتراض کا جواب

یہ یہود کے اس اعتراض کا ضمنی جواب ہے جس کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے۔ یہود مدعی تھے کہ اصل ملت ابراہیمؑ پر وہ ہیں نہ کہ مسلمان۔ اپنے اس دعوے کے ثبوت میں جو باتیں وہ کہتے تھے ان میں سے ایک بات یہ بھی تھی کہ مسلمانوں نے جو چیزیں جائز کر رکھی ہیں ان میں سے بعض چیزیں ملت ابراہیمؑ میں حرام تھیں لیکن مسلمان نہ صرف یہ کہ ان کو جائز رکھتے ہیں بلکہ ان کے برو تقویٰ اور ان کے انفاق و قربانی کا انحصار

انھی چیزوں پر ہے۔ ان کا اشارہ اونٹ کے ذبیحہ اور اس کی قربانی کی طرف ہوگا اس لیے کہ اونٹ عرب کے محبوب ترین اموال میں سے تھا، اور یہود کی شریعت میں، جیسا کہ احبار میں وارد ہے، وہ حرام ہے۔

قرآن نے یہاں مناسب موقعہ پر ان کے اس غلط خیال کی تردید کر دی۔ فرمایا کہ جو چیزیں طیبات میں داخل اور کھانے پینے کی ہیں وہ سب ابتداءً بنی اسرائیل کے ہاں بھی حلال تھیں۔ ازاں جملہ اونٹ بھی ہے۔ البتہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے یعقوبؑ نے بعض چیزیں اپنے اوپر حرام ٹھہرالی تھیں۔ چنانچہ تورات میں دیکھ لو کہ اونٹ یا بعض دوسری چیزیں جن کو تم حرام قرار دیتے ہو ان کی حرمت کا کوئی ذکر عہد ابراہیمی میں نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو تورات میں ملتا ہے۔

یہود کی حرام کردہ طیبات کی تین قسمیں

تورات میں ملتِ ابراہیمی کے خلاف جن طیبات کو حرام ٹھہرایا گیا ہے وہ تین قسم کی ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو محض یہود کے فقہا کی تحلیل و تحریم اور ان کی موشگافیوں کی پیدا کردہ ہیں۔ انھوں نے اپنے فتوے کے تحت کسی چیز کو حرام ٹھہرایا اور بعد میں ان کا یہی فتویٰ تورات میں شامل ہو کر اس کا ایک جزو بن گیا اور اس طرح فقیہوں کے ایک فتوے نے کتابِ الٰہی کی حیثیت حاصل کر لی۔ تورات میں اس قسم کے جو گھپلے ہوئے ہیں ان پر یہاں بحث کا موقع نہیں ہے، ان کا تعلق تورات کی تاریخ سے ہے اور یہ ایک الگ موضوع ہے۔

دوسری وہ ہیں جو یہود کی سرکشی، ان کی کٹ حجتی اور ان کی سوال بازی کے سبب سے حرام ہوئیں۔ انھوں نے کسی چیز کے متعین کرانے میں اتنے سوالات اٹھائے کہ ان کے لیے جواز کی راہ تنگ سے تنگ ہوتی چلی گئی اور اچھی بھلی طیب و طاہر چیزیں بھی ان کے لیے حرام ہو کر رہ گئیں۔

تیسری وہ ہیں جن سے احتراز و اجتناب کا تصور ان کے ہاں بزرگوں سے چلا آ رہا تھا۔ مثلاً بعض چیزیں حضرت یعقوبؑ کسی احتیاط یا محض طبعی و ذوقی عدم مناسبت کی بنا پر نہیں استعمال کرتے تھے۔ یہود نے اس طرح کی چیزوں کا سرا حضرت ابراہیمؑ سے ملا دیا اور ان کی حرمت بھی تورات کی محرمات کی فہرست میں شامل ہو گئی۔

یہی وہ حرمتیں ہیں جن کو قرآن میں "اصر و اغلال" سے تعبیر کیا گیا ہے اور یہود کے صحیفوں میں ملتِ ابراہیمؑ پر مبعوث ہونے والے پیغمبرؐ کے بارے میں یہ پیشین گوئی موجود تھی کہ جب وہ آئیں گے تو یہود کے لیے تمام طیبات کو حلال کریں گے اور جو طوق و سلاسل انھوں نے اپنے اوپر لاد رکھے ہیں ان سے ان کو نجات دیں گے۔ اس مسئلہ پر ہم سورۂ انعام کی تفسیر میں تفصیل سے بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں ان مختصر اشارات پر کفایت کرتے ہیں۔

'فَمَنِ افْتَرٰی' الآیہ، یعنی جو لوگ اس وضاحت کے بعد بھی اس بات پر اڑے رہیں کہ جن چیزوں کو انھوں نے حرام ٹھہرا رکھا ہے وہ ملتِ ابراہیمؑ میں بھی حرام تھیں اور ان کو اللہ تعالیٰ نے حرام ٹھہرایا ہے تو یہ لوگ اللہ پر جھوٹ باندھ رہے ہیں اور جو لوگ اللہ پر جھوٹ باندھیں ان سے بڑھ کر ظالم کون ہو سکتا ہے!

قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ (۹۵)

فرمایا کہ ان لوگوں سے کہہ دو کہ جو کچھ تم کہہ رہے ہو یہ تو محض اللہ پر جھوٹا بہتان ہے البتہ اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے یہ سچ ہے۔ تو اپنی بدعات کو ملّتِ ابراہیمؑ ثابت کرنے کی کوشش نہ کرو بلکہ اس ملّتِ ابراہیمؑ کی پیروی کرو جس کی دعوت میں دے رہا ہوں۔ ابراہیم علیہ السلام اسلام کی راہ پر بالکل یکسو تھے، نہ انھوں نے اس راہ سے دوسری پگڈنڈیاں نکالیں اور نہ وہ مشرکین میں سے تھے۔

اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ ۚ فِیْهِ اٰیٰتٌۢ بَیِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِیْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَیْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنِ الْعٰلَمِیْنَ (۹۶-۹۷)

بکہ کی تحقیق

'بکّہ' سے مراد مکّہ[1] ہے۔ قدیم صحیفوں میں اس کا یہی نام آیا ہے۔ لغوی معنی اس کے شہر کے ہیں مثلاً بعلبک (بعل کا شہر) یہود نے آخری بعثت کے نشانات گم کرنے کے لیے قرأت کے توڑ مروڑ یا بالفاظِ قرآن 'لَیًّا بِلِسَانٍ' کے ذریعے سے جو تحریفیں کی ہیں، ان کی ایک مثال یہ لفظ بھی ہے۔ اس کو یہود نے بگاڑ کر 'بکہ' کے بجائے بکا بنایا اور اس کو مصدر قرار دے کر ترجمہ اس کا رونا کر دیا اور اس طرح 'وادیٔ بکہ' کو رونے کی وادی میں تبدیل کر کے اس سب سے بڑے نشان کو گم کر دیا جس سے خلق کو آخری نبیؐ کے بارے میں رہنمائی مل سکتی تھی۔ اس آیت میں قرآن نے مکہ کو بکہ کے نام سے ذکر کر کے مکّہ کے اس قدیم نام کی یاددہانی کی ہے جو تورات کے صحیفوں میں تھا۔ بلکہ بعض صحیفوں میں اب بھی ہے مثلاً[2] زبور میں۔

اس آیت میں ان چیزوں کی طرف اشارہ ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ خدا کی عبادت کا وہ گھر جو حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر فرمایا یہی مکّہ کا بیت اللہ ہے۔ اسی گھر کو حضرت ابراہیمؑ نے ملّتِ ابراہیمؑ کا مرکز بنایا اور اسی گھر سے ان کی مشہور دعا رَبَّنَا وَابْعَثْ فِیْهِمْ الآیہ کے بموجب اس پیغمبر کی دعوت بلند ہوئی، جو امیوں میں پیدا ہونے والے تھے اور جن کی دعوت سے ساری دنیا کو فیض پہنچنے والا تھا۔ 'مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِیْنَ' میں اس بات کا اشارہ موجود ہے۔

یہ بات محتاجِ ثبوت نہیں ہے کہ تورات میں حضرت ابراہیمؑ کے ہاتھوں جس بیت ایل (بیت اللہ) کی

---

[1] مولانا فراہیؒ نے اپنی کتاب مفردات القرآن میں لفظ مکّہ پر لکھا ہے "لوگوں نے اس لفظ کے اشتقاق کے بارے میں اختلاف کیا ہے لیکن اس امر میں شبہے کی گنجائش نہیں ہے کہ یہ بکّہ کی بدلی ہوئی صورت ہے چنانچہ یہ لفظ خود قرآن میں آیا ہے۔ جس وقت حضرت اسماعیلؑ اس وادی میں آباد کیے گئے ہیں اس وادی کا یہی نام تھا۔ اس کے معنی آبادی کے ہیں جیسا کہ لفظ بعلبک سے اس کی شہادت ملتی ہے۔ چونکہ حضرت ابراہیمؑ بابل سے تشریف لائے تھے اس وجہ سے انھوں نے مکّہ کے نام کے لیے اپنی زبان کا لفظ پسند فرمایا۔

[2] ملاحظہ ہو مزمور ۸۴۔

تعمیر کا ذکر ہے اس کا مصداق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو مکہ کا بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے نہ کہ بیت المقدس۔ اس لیے کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت ابراہیمؑ کے سینکڑوں سال بعد حضرت داؤدؑ اور حضرت سلیمانؑ کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ یہی گھر ملت ابراہیمؑ کی برکتوں کا مظہر ہو سکتا ہے نہ کہ بیت المقدس۔

کعبہ کے بیت اللہ ہونے کی نشانیاں

فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ، یعنی اس میں نہایت واضح نشانیاں اس بات کی موجود ہیں کہ یہی گھر حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا ہے۔ ان نشانیوں کو اگرچہ یہود نے مٹانے کی کوشش کی لیکن تورات میں آج بھی ایسے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں جو یہود کی تمام تحریفات کا پردہ چاک کر کے اصل حقیقت کو بالکل بے نقاب کر دیتے ہیں۔ ہم نے سورۂ بقرہ کی تفسیر میں قبلہ کی بحث میں اس مسئلے پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ جو لوگ تفصیل کے طالب ہوں، اس بحث کو پڑھیں۔ یہاں اس کے دہرانے میں طوالت ہو گی۔

نشانیوں کا بالاجمال ذکر کرنے کے بعد جس طرح عام کے بعد خاص کا ذکر ہوتا ہے تین چیزوں کی طرف خاص طور پر اشارہ فرمایا ہے۔ ایک یہ کہ یہ مقام ابراہیم ہے، دوسری یہ کہ جو اس حرم میں داخل ہو جائے وہ امن میں ہو جاتا ہے۔ تیسری یہ کہ تمام اہل استطاعت پر اس گھر کا حج فرض ہے۔

اگرچہ سورہ بقرہ کی تفسیر میں ان ساری چیزوں پر ہم بحث کر چکے ہیں لیکن بالاجمال ہم یہاں بھی ان تینوں چیزوں کے ان پہلوؤں کی طرف اشارہ کیے دیتے ہیں جن سے اس امر کا ثبوت بہم پہنچتا ہے کہ در حقیقت یہی گھر حضرت ابراہیمؑ کا تعمیر کردہ ہے اور یہی ملت ابراہیمؑ کا مرکز ہے۔

مقام ابراہیم سے مراد

مقام ابراہیمؑ سے مراد، جیسا کہ ہم نے تفسیر سورۂ بقرہ میں بدلائل واضح کیا ہے، یہ ہے کہ اسی مقام کو حضرت ابراہیمؑ نے ہجرت کے بعد اپنے قیام کے لیے منتخب فرمایا، یہیں مروہ کے پاس اپنے اکلوتے فرزند کی قربانی کی، یہیں ان کو بیت اللہ کی خدمت اور نماز کے اہتمام کے لیے بسایا اور یہیں ان سے نسبت رکھنے والی ایک پوری قوم صدیوں سے آباد ہے۔ یہ ساری باتیں خود تورات کے دلائل سے اس قدر قطعیت کے ساتھ ثابت ہیں کہ کوئی صاحبِ انصاف ان کا انکار نہیں کر سکتا۔

مکہ امن کا شہر ہے

’وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا‘ سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین میں اپنی اولاد کو بساتے ہوئے اس کے لیے امن کی جو دعا کی تھی یہ سرزمین اور یہ گھر اس دعا کی مقبولیت کا مظہر ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ کی دُعا قرآن میں یوں نقل ہوئی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ اٰمِنًا وَّاجْنُبْنِيْ وَبَنِيَّ اَنْ نَّعْبُدَ الْاَصْنَامَ (۳۵- ابراهیم)	اور جب کہ ابراہیمؑ نے دعا کی اے میرے پروردگار اس سرزمین کو امن کی سرزمین بنا اور مجھے اور میری اولاد کو بتوں کی پوجا سے محفوظ رکھ۔

یہ اسی دعا کی برکت ہے کہ شہر حرم کی سنت قائم ہوئی اور اس گھر کے جوار میں آدمی تو درکنار کسی جانور کو

بھی ایذا پہنچانا جرم ٹھہرا۔

وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ الآیہ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس سرزمین اور اس گھر کے لیے مرجعیت کی جو دعا کی تھی اس کی مقبولیت بھی اس کے چپے چپے سے نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کی اس دعا کا ذکر قرآن میں یوں ہے۔

رَبَّنَآ اِنِّيْٓ اَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِيْ بِوَادٍ
غَيْرِ ذِيْ زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ
رَبَّنَا لِيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ اَفْـِٕدَةً
مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيْٓ اِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ
مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُوْنَ۔
(۳۷ - ابراھیم)

اے ہمارے رب، میں نے اپنی اولاد میں سے بعض
کو اسماعیل کو، ایک بن کھیتی کی سرزمین میں تیرے
محترم گھر کے پاس بسایا، اے ہمارے رب تاکہ یہ
نماز قائم کریں تو تو لوگوں کے دل ان کی طرف مائل کر
دے اور ان کو پھلوں کی روزی کا دے کہ یہ تیری
شکر گزاری کریں۔

حج کی سنت

اسی طرح حضرت ابراہیمؑ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایت اس گھر کے لیے اعلان حج کی ملی تھی اس کی سنت بھی ان کے عہد سے لے کر آج تک چلی آرہی ہے۔

وَاِذْ بَوَّاْنَا لِاِبْرٰهِيْمَ مَكَانَ الْبَيْتِ اَنْ
لَّا تُشْرِكْ بِيْ شَيْـًٔـا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ
لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ
السُّجُوْدِ ۝ وَاَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَاْتُوْكَ
رِجَالًا وَّعَلٰي كُلِّ ضَامِرٍ يَّاْتِيْنَ مِنْ
كُلِّ فَجٍّ عَمِيْقٍ (۲۶-۲۷ - حج)

اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیمؑ کو بیت اللہ کے پاس
اس ہدایت کے ساتھ بسایا کہ میرا کسی کو شریک نہ
ٹھہرائیو اور میرے گھر کو طواف، قیام اور رکوع و
سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھیو اور لوگوں میں
حج کی منادی کر دو وہ لوگ تمہارے پاس پیادہ اور
لاغر اونٹنیوں پر تمام گہرے راستوں سے آئیں گے۔

ان تمام نشانیوں کے حوالے دینے سے مقصود، جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا اہل کتاب پر یہ ثابت کرنا ہے کہ دنیا میں اگر کوئی گھر حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا اور ان کی ملت اور ان کی دعوت کا مرکز ہو سکتا ہے تو یہی مکہ کا بیت اللہ ہو سکتا ہے۔ اہل کتاب کی تمام تحریفی کوششوں کے باوجود آج بھی یہود کے صحیفوں میں ایسے اشارات و قرائن موجود ہیں جو اصل حقیقت کو کھول دینے کے لیے کافی ہیں۔ ان اشارات کی تفصیل کے لیے ہماری سورہ بقرہ کی تفسیر پڑھیے۔

حج کے بارے میں ایک تنبیہ

وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ۔ یعنی ان تمام تفصیلات کے بعد بھی جو اہل کتاب اپنی ضد پر اڑے ہی رہ جائیں گے اور یہی دعویٰ کرتے رہیں گے کہ ملتِ ابراہیم وہی ہے جس پر وہ ہیں اور ملت ابراہیمؑ کا مرکز بیت المقدس ہے تو یہ لوگ اللہ کی آیات کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ حجت تمام کر دینے کے بعد اس بات سے بے پروا ہو جاتا ہے کہ کون کفر کی راہ اختیار کرتا ہے اور کون ایمان کی۔

آیت کے اسی آخری ٹکڑے پر وہ حدیث مبنی ہے جس میں حضورؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ جو شخص استطاعت کے باوجود حج سے بے پروا ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کو اس بات کی کوئی پروا نہیں رہ جاتی کہ وہ یہودی ہو کے مرے گا یا نصرانی ہو کر۔ ہمارے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے شخص کے رویے میں درحقیقت یہود و نصاریٰ کی اس بے پروائی کا ایک عکس ہے جو انھوں نے بیت اللہ کے معاملے میں اختیار کی اور جس کے نتیجے میں وہ اپنا ایمان ہی گنوا بیٹھے۔

قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَاللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ۝ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لِمَ تَصُدُّونَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ مَنْ آمَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنْتُمْ شُهَدَاءُ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ (۹۸-۹۹)

اب یہ اہل کتاب کو زجر اور ملامت ہے کہ اللہ کی جو نشانیاں ملت ابراہیمؑ، بیت اللہ اور آخری رسول سے متعلق خود تمھارے اپنے صحیفوں میں موجود ہیں ان کو اور ان کے مصداق کو جان بوجھ کر کیوں جھٹلاتے ہو؟ اور دوسروں کے ذہن میں کیوں شبہات بھر رہے ہو؟ یہ بات تمھیں معلوم رہنی چاہیے کہ اللہ اور اس کی آیات کے ساتھ یہ شرارت جو تم کر رہے ہو یہ گویا اللہ کی موجودگی میں کر رہے ہو اور وہ سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ جنھوں نے اللہ کی توفیق سے یہ راہ پالی ہے اب تم یہ چاہتے ہو کہ ان کے ذہن میں شبہات پیدا کر کے ان کو کسی ایسے رُخ پر موڑ دو کہ ان کی ملی ہوئی راہ پھر گم ہو کر رہ جائے حالانکہ تم کو اللہ نے پہلے سے اس راہ پر اس لیے کھڑا کیا تھا کہ تم لوگوں کو رستہ بتاؤ گے لیکن تم نے شہداء اللہ ہو کر رہزنوں اور بٹ ماروں کا پیشہ اختیار کر لیا، یاد رکھو کہ یہ جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اس سے بے خبر نہیں ہے۔

۲۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۰۰-۱۰۹

یہاں تک خطاب کا اصلی رخ اہل کتاب کی طرف تھا، ان پر حجت تمام کر دینے کے بعد اب آگے کی آیت سے خطاب مسلمانوں سے ہو گیا ہے اور ان کو آگاہ کیا جا رہا ہے کہ اگر تم نے اہل کتاب کی بات مانی تو یہ تم کو پھر اسی کفر و جاہلیت کے گڑھے میں گرا کے رہیں گے جس سے نکل کر تم ایمان و اسلام کی روشنی میں آئے ہو۔

پھر اس عظیم نعمت کی قدردانی اور شکرگزاری کا احساس دلاتے ہوئے جو انھیں پیغمبرؐ اور قرآن کی شکل میں حاصل ہوئی ہے، اس طریقے کی طرف رہنمائی فرمائی ہے جس کو اختیار کر کے وہ ان فتنوں سے اپنے آپ کو بچا سکتے ہیں جو اہل کتاب ان کو گمراہ کرنے کے لیے اٹھا رہے ہیں۔ ساتھ ہی اس اجتماعی نظام کی طرف بھی رہنمائی فرمائی ہے جو اس ملت کو صراط مستقیم پر قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ ورنہ اس ملت کا انجام بھی وہی ہوگا جو اہل کتاب کا ہوا ـــــ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا آیات
الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ ۱۰۰-۱۰۹
تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ؕ
وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع ۱۰ ۱
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا
وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا
تَفَرَّقُوْا ۪ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً
فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ
عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ
اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۰۳﴾ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ
يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ
الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ
تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ؕ وَاُولٰٓئِكَ
لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۰۵﴾ يَّوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ
فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۟ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ
فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۱۰۶﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ
ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ؕ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۱۰۷﴾
تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ

ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى
اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ﴿۱۰۹﴾ ع ۱۲

ترجمۂ آیات ۱۰۰-۱۰۹

اے ایمان والو! اگر تم اہل کتاب کے ایک گروہ کی بات مان لو گے تو یہ تم کو تمہارے ایمان کے بعد پھر کفر کی طرف پلٹا دیں گے، اور تمہارا کفر میں پڑنا کس طرح جائز ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جا رہی ہیں اور تمہارے اندر اس کا رسول موجود ہے۔ اور جو اللہ کو مضبوطی سے پکڑے گا تو وہی ہے جس کو صراط مستقیم کی ہدایت ملی۔ ۱۰۰-۱۰۱

اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے اور نہ مرو تم مگر اس حال میں کہ تم اسلام پر ہو اور اللہ کی رسی کو سب مل کر مضبوطی سے پکڑو اور پراگندہ نہ ہو اور اپنے اوپر اللہ کے اس فضل کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے تو اللہ نے تمہارے دلوں کو ایک دوسرے کے ساتھ جوڑ دیا اور تم اس کے فضل سے بھائی بھائی بن گئے اور تم آگ کے ایک گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے تو اللہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے اپنی ہدایات کو واضح کرتا ہے تاکہ تم راہ یاب ہو۔ اور چاہیئے کہ تم میں ایک گروہ ایسا ہو جو نیکی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے اور یہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔ ۱۰۲-۱۰۴

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو پراگندہ ہو گئے اور جنھوں نے اختلاف کیا بعد اس کے کہ ان کے پاس واضح ہدایات آ چکی تھیں اور وہی ہیں جن کے لیے بڑا عذاب ہے۔ اس دن جس دن کچھ چہرے روشن ہوں گے اور کچھ چہرے سیاہ ہوں گے تو جن کے چہرے سیاہ ہوں گے ان سے پوچھا جائے گا کہ کیا تم نے اپنے ایمان کے بعد کفر کیا ہے تو اب

چکھو عذاب اپنے کفر کی پاداش میں۔ رہے وہ جن کے چہرے روشن ہوں گے تو وہ اللہ کی رحمت کے سایہ میں ہوں گے وہ اسی میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمھیں حق کے ساتھ سنا رہے ہیں اور اللہ عالم والوں پر کوئی ظلم نہیں کرنا چاہتا، اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور سارے معاملات اللہ ہی کے حضور میں پیش کیے جاتے ہیں۔ (۱۰۵-۱۰۹)

۲۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوْا فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ يَرُدُّوْكُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ كٰفِرِيْنَ (۱۰۰)

مسلمانوں کو اہل کتاب کے اشرار سے بچتے رہنے کی تاکید

فَرِيْقًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ سے اہل کتاب کا وہی گروہ مراد ہے جس کی مخالفتوں اور وسوسہ اندازیوں کا اوپر تفصیل سے ذکر ہوا ہے۔ اہل کتاب میں ایک گروہ، جیسا کہ اوپر بھی ذکر گزر چکا ہے اور آگے بھی آ رہا ہے، اہل انصاف کا بھی تھا، اس وجہ سے قرآن نے جگہ جگہ اس امر کو ملحوظ رکھا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی ناانصافی نہ ہونے پائے۔ چنانچہ یہاں بھی مسلمانوں کو اہل کتاب کی وسوسہ اندازیوں اور خاکبازیوں سے بچتے رہنے کی جو تاکید فرمائی ہے تو تعیین کے ساتھ اس گروہ کی طرف انگلی اٹھا دی ہے جس سے بچانا پیش نظر ہے۔ یہ انصاف کا بھی تقاضا تھا اور دعوت و تبلیغ کے نقطۂ نظر سے بھی یہی بات مطابق حکمت و مصلحت تھی۔

اس آیت میں تنبیہ کا خاص پہلو یہ ہے کہ یہ ہیں تو اہل کتاب میں سے اس وجہ سے ایک نیک نیت آدمی کو یہ حسن ظن ہو سکتا ہے کہ بھلا یہ دیندار لوگ کوئی گمراہی کی بات کس طرح سوچ سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اسلام کے ایسے پکے دشمن ہیں کہ جو مسلمان ان کی باتوں میں آ جائے گا یہ اس کو پھر کافر بنا کے چھوڑیں گے۔

وَكَيْفَ تَكْفُرُوْنَ وَاَنْتُمْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ اٰيٰتُ اللّٰهِ وَفِيْكُمْ رَسُوْلُهٗ ۭ وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ فَقَدْ هُدِيَ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۱۰۱)

قلوب سے محفوظ رہنے کی تدبیریں

اعتصام کے معنی کسی شے کو مضبوطی سے پکڑنے اور تھامنے کے ہیں۔ اعتصام باللہ کے معنی اللہ کے احکام و ہدایات اور اس کی کتاب پر مضبوطی سے نرم و گرم ہر طرح کے حالات میں مخالفت و موافقت سے بے نیاز ہو کر قائم رہنا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یوں تو کفر و ارتداد ہر حالت میں انسان کی بدبختی اور اس کی شامت کی دلیل ہے لیکن آج تم نے اگر یہ راہ اختیار کی جب کہ اللہ کی آیات تمھیں سنائی جا رہی ہیں اور خدا کا رسول تمھارے اندر موجود ہے تو یہ محرومی و بدبختی کی انتہا ہو گی۔ اس کے معنی یہ ہوں گے کہ تم نے پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی اور اپنے لیے عذر کا کوئی شائبہ بھی باقی نہ چھوڑا۔ پھر اس قسم کی ٹھوکر سے بچنے کی تدبیر تبادی کہ اگر چاہتے ہو کہ تمھارے قدم جادۂ مستقیم پر استوار رہیں اور تمھارے مخالفین تمھیں ٹھوکر نہ کھلا سکیں تو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اللہ کو مضبوط پکڑو، یعنی اللہ کی جو آیات و ہدایات تمھیں سنائی جا رہی ہیں، انھیں حرزِ جان بناؤ اور تمام مخالفتوں اور تمام خاکبازیوں کے علی الرغم ان پر قائم و دائم رہو۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ حَقَّ تُقٰتِهٖ وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ (۱۰۲)

اعتصام باللہ کی حقیقت

یہ اعتصام باللہ کی حقیقت واضح فرما دی کہ اللہ کو مضبوط پکڑنے کے معنی یہ ہیں کہ اس سے اس طرح ڈرتے رہو جس طرح اس سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ یہ تقویٰ اگرچہ مطلوب تو اسی حد تک ہے جس حد تک بندے کی استطاعت میں ہے، اس کی وضاحت خود قرآن ہی نے فرما دی ہے کہ فَاتَّقُوا اللّٰهَ مَا اسْتَطَعْتُمْ (۱۶- تغابن) لیکن خدا سے ڈرنے اور دوسروں سے ڈرنے میں بڑا فرق ہے، اس وجہ سے ارشاد ہوا کہ خدا سے ڈرتے رہو جس طرح خدا سے ڈرتے رہنے کا حق ہے۔ اوّل تو بندے پر خدا کے جو حقوق ہیں وہ کسی اور کے نہیں، دوسری بات یہ ہے کہ خدا نے جو حدود و قیود قائم کیے ہیں اور ان کے توڑنے کی جو سزا مقرر کی ہے وہ تمام تر بندوں کی دنیوی و اخروی بہبود کے لیے کی ہے، ان کی پابندی سے خدا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ بندوں ہی کو پہنچتا ہے۔ تیسری یہ کہ خدا کی آنکھیں ہر جگہ نگراں ہیں یہاں تک کہ وہ دلوں کے وسوسوں سے بھی باخبر ہے۔ چوتھی یہ کہ خدا کی پکڑ سے کوئی دوسرا بچا نہیں سکتا اور وہ دنیا اور آخرت دونوں میں سزا دے سکتا ہے اور ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہے۔ خدا سے ڈرنے میں جب تک بندہ ان تمام پہلوؤں کو مدِ نظر نہ رکھے وہ خدا سے ڈرنے کا صحیح مفہوم سمجھ بھی نہیں سکتا چہ جائیکہ وہ اس کا صحیح حق ادا کر پائے۔ بہت سے لوگ جو انسانوں سے ڈر کر خدا اور اس کی شریعت کو چھوڑ بیٹھتے ہیں ان کی بنیادی گمراہی یہی ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی مخالفت اور خدا کے غضب میں فرق نہیں کر پاتے۔

وَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ میں یہ لطیف حقیقت واضح فرمائی ہے کہ خدا سے یہ ڈر نا صرف عارضی اور وقتی طور پر مطلوب نہیں ہے بلکہ یہ زندگی بھر کا معاملہ ہے۔ اسی پر جینا اور اسی پر مرنا ہے۔ ہوش سنبھالنے کے بعد سے یہ جد و جہد شروع ہوتی اور زندگی کی آخری سانس پر تمام ہوتی ہے۔ اگر آخری مرحلے میں بھی یہ تسلسل کہیں ٹوٹ گیا تو ساری عمر کی محنت برباد گئی۔ آیت کے اسلوب میں یہ بات بھی مخفی ہے کہ یہ راہ بہت ہموار نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سے نشیب و فراز اور ہر قدم پر اتار چڑھاؤ ہیں۔ اس میں آزمائشوں اور فتنوں سے دوچار ہونا ہو گا اور شیاطین کے شب خونوں اور معاندین کی دراندازیوں اور فساد انگیزیوں

سے سابقہ پیش آئے گا۔ کبھی طمع ورغلانے کے لیے عشوہ گری کرے گی، کبھی خوف دھمکانے کے لیے اپنے اسلحہ سنبھالے گا۔ جو ان سب مرحلوں سے اپنا ایمان و اسلام بچاتا ہوا منزل پر پہنچا اور اسی حال میں اس نے جان، جان آفرین کے سپرد کی درحقیقت وہ ہے جو خدا سے اس طرح ڈرا جس طرح خدا سے ڈرنے کا حق ہے اور یہی ہے جس کو اعتصام باللہ کا مقام حاصل ہوا۔

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۠ وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۗءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰي شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْھَا ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَھْتَدُوْنَ (۱۰۳)

'حبل اللہ' سے مراد

'حبل' کے معنی رسی کے ہیں، اپنے اسی معنی سے ترقی کر کے یہ لفظ تعلق اور ربط کے مفہوم میں استعمال ہوا ہے اس لیے کہ رسی دو چیزوں میں ربط و تعلق کا ذریعہ ہوتی ہے۔ ایک حماسی شاعر کا مشہور شعر ہے۔

وَلٰكِنِّي وصلتُ الحبلَ منه مواصلةً بحبلِ ابي بيان

"لیکن میں نے اس سے اپنا تعلق جوڑے رکھا، ابو بیان کے تعلق سے وابستگی کی بنا پر۔"

پھر مزید ترقی کر کے یہ لفظ معاہدہ کے مفہوم میں بھی استعمال ہونے لگا اس لیے کہ رسی جس طرح دو چیزوں کو ایک ساتھ باندھ دیتی ہے اسی طرح معاہدہ بھی دو قوموں کو ایک دوسرے سے باندھ دیتا ہے۔ معاہدہ کے مفہوم میں یہ لفظ خود قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ الا بحبل من اللہ وحبل من الناس (مگر اللہ کے اور لوگوں کے کسی معاہدے کے تحت) آیت زیر بحث میں حبل سے مراد قرآن ہے اس لیے کہ یہی ہمارے رب اور ہمارے درمیان ایک عہد و میثاق ہے۔ خدا کو مضبوطی سے پکڑنا ظاہر ہے کہ اپنے ظاہری مفہوم میں نہیں ہے اس لیے کہ خدا چھونے اور پکڑنے کی چیز نہیں، اس کو مضبوطی سے پکڑنے کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ہم اس کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں جو ہمارے اور اس کے درمیان واسطہ ہے۔ گویا اوپر والی آیت میں وَمَنْ يَّعْتَصِمْ بِاللّٰهِ جو فرمایا تھا وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ کے الفاظ سے اس کی وضاحت فرما دی۔

سلف میں سے قتادہ، سدی، عبداللہ بن عباسؓ، مجاہد اور ضحاک کی یہی رائے ہے۔ ابن جریر نے ابوسعید خدریؓ کے واسطے سے ایک روایت بھی نقل کی ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کتاب اللہ ھو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض "رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک خدا اور اس کے بندوں کے درمیان تنی ہوئی ہے۔"

'اعتصام بحبل اللہ' کی جامع حیثیت مطلوب ہے

گویا یہی چیز ہے جو بندوں کو خدا سے جوڑتی ہے، جس نے اس کو تھام لیا، گویا خدا کو تھام لیا۔ سلف میں سے جو لوگ حبل اللہ کی تعبیر عہد اللہ سے کرتے ہیں وہ بھی درحقیقت حبل اللہ سے قرآن ہی کو مراد لیتے ہیں، اس لیے کہ ہمارے اور ہمارے رب کے درمیان معاہدہ کی حیثیت قرآن ہی کو حاصل ہے۔ قرآن اور دوسرے

آسمانی صحیفوں کو میثاق اور عہد سے اسی بنا پر تعبیر کیا گیا ہے۔ اس پر مفصل بحث سورۂ مائدہ میں آئے گی۔

مضبوط پکڑنے کے ساتھ ساتھ جَمِیْعًا کی تاکید اور وَلَا تَفَرَّقُوْا کی نہی نے یہ بات واضح کر دی ہے کہ یہ چیز جماعتی حیثیت سے مطلوب ہے۔ سب مل کر اس کو مضبوطی سے تھامیں۔ اسی حبل اللہ سے مسلمانوں کی شیرازہ بندی ہوئی ہے، اس کو چھوڑ کر وہ اپنے شیرازے کو پراگندہ نہ کریں۔ اگر اس کے ساتھ تعلق میں ضعف پیدا ہو گیا، اس کی جگہ انھوں نے دوسری رسیوں کا سہارا لے لیا اور حق و باطل کے جانچنے کے اس سے الگ کچھ معیارات بنا لیے تو وہ بھی اسی طرح پراگندہ ہو جائیں گے جس طرح یہود و نصاریٰ پراگندہ ہو گئے۔

مسلمانوں کو ایک تنبیہ

اس کے بعد اس عظیم احسان کی یاد دہانی فرمائی ہے جو اس کتاب کے ذریعہ سے عرب قوم پر ہوا۔ اس کتاب کے نزول سے پہلے عرب کا ہر قبیلہ دوسرے قبیلے کا دشمن تھا۔ ان میں باہم خونریز جنگیں برپا رہتی تھیں۔ ان کے دیوتا الگ الگ اور ان کے اغراض و مفادات باہم متصادم تھے۔ لیکن اس حبل اللہ نے ان کو ایک رشتہ میں پرو کر ان کو موتیوں کی لڑی بنا دیا اور وہ جو ایک دوسرے کے جانی دشمن تھے ایک دوسرے کے جگری دوست اور غمخوار بھائی بن گئے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اس حالت کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس حبل اللہ کے ساتھ اپنی وابستگی کو سابر برقرار رکھو۔ اگر یہ رشتہ کمزور ہوا تو پھر وہی جاہلیت کی حالت لوٹ آئے گی، جس میں اس سے پہلے مبتلا تھے۔ تم تباہی کے گڑھے کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے۔ خدا نے تم کو اس سے بچایا ہے۔ اس کو چھوڑ کر پھر اسی گڑھے میں گرنے کا سامان نہ کر لینا۔

چونکہ یہ مقام بہت اہم ہے، جو ہدایات یہاں دی جا رہی ہیں وہ مسلمانوں کے مستقبل سے بڑا گہرا تعلق رکھنے والی ہیں، ان میں معمولی غلطی یا غلط فہمی بھی بڑے ہولناک فتنوں کے دروازے کھول سکتی تھی، اس وجہ سے یہاں، جیسا کہ اوپر کے سلسلہ کلام سے واضح ہے، اللہ تعالیٰ نے اپنی ہدایات بڑی وضاحت سے بیان فرمائی ہیں تاکہ کسی گمراہی کے لیے کوئی وجہ باقی نہ رہے۔ اسی چیز کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ (الایہ)

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَاۗءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ (۱۰۴-۱۰۵)

خلافت کے قیام کا بنیادی مقصد

یہ، امت کو اس اہتمام و انتظام کی ہدایت فرمائی گئی ہے جو اعتصام بحبل اللہ پر قائم رہنے اور لوگوں کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ اس مقصد کے لیے یہ ہدایت ہوئی کہ مسلمان اپنے اندر سے ایک گروہ کو اس کام پر مقرر کریں کہ وہ لوگوں کو نیکی اور بھلائی کی دعوت دے، معروف کا حکم کرے اور منکر سے روکے۔ معروف و منکر سے مراد شریعت اور سوسائٹی دونوں کے معروفات و منکرات ہیں اور ان کے لیے امر و نہی کے جو

الفاظ استعمال ہوئے ان کا غالب قرینہ یہی ہے کہ یہ کام مجرد وعظ و تلقین ہی سے نہیں انجام دینا ہے۔ بلکہ اختیار اور قوت سے اس کو نافذ کرنا ہے جو بغیر اس کے ممکن نہیں کہ یہ گروہ امت کی طرف سے سیاسی اقتدار و اختیار کا حامل ہو۔ اگر تنہا دعوت و تبلیغ ہی سے یہ کام لینا مدنظر ہوتا تو اس مطلب کو ادا کرنے کے لیے یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ کے الفاظ کافی تھے یَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (الآیہ) کی ضرورت نہیں تھی۔ ہمارے نزدیک اس آیت سے اس امت کے اندر خلافت کے قیام کا واجب ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد پہلا کام جو کیا وہ خلافت علیٰ منہاج النبوت کا قیام تھا۔ اس ادارے کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ وہ اس امر کی نگرانی کرے کہ مسلمان اعتصام باللہ کے نصب العین سے ہٹنے نہ پائیں۔ اس کے لیے جو طریقے اس کو اختیار کرنے تھے وہ اصولی طور پر تین تھے۔ دعوت الی الخیر، امر بالمعروف نہی عن المنکر۔ انہی تین سے خلافت راشدہ کے دور میں وہ تمام شعبے وجود میں آئے جو ملت کی تمام داخلی و خارجی ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا ذریعہ بنے۔

وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کا تعلق صرف اس مخصوص گروہ ہی سے نہیں ہے بلکہ یہ اشارہ پوری امت کی طرف ہے کہ جو امت اعتصام باللہ کے لیے یہ اہتمام کرے گی وہی دنیا اور آخرت میں فلاح حاصل کرنے والی بنے گی۔

اس کے بعد یہود و نصاریٰ کے انجام سے مسلمانوں کو عبرت دلائی ہے کہ وہ خدا کی واضح تنبیہات کے باوجود خدا کی رسی چھوڑ بیٹھے اور پھر جس کے ہاتھ میں جو رسی آگئی وہ اسی کو حبل اللہ سمجھ بیٹھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے درمیان ایسے اختلافات پھوٹ پڑے جن کی اصلاح ناممکن ہو گئی۔ فرمایا کہ تم بھی انہی یہود و نصاریٰ کی طرح اپنی دنیا و عاقبت نہ برباد کر لینا۔ یہ فلاح کی راہ نہیں بلکہ عذاب الیم کی مستوجب ہے۔

يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوْهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوْهٌ ۚ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اسْوَدَّتْ وُجُوْهُهُمْ ۫ اَكَفَرْتُمْ بَعْدَ اِيْمَانِكُمْ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ۝ وَاَمَّا الَّذِيْنَ ابْيَضَّتْ وُجُوْهُهُمْ فَفِيْ رَحْمَةِ اللّٰهِ ۭ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (۱۰۶-۱۰۹)

مسلمانوں کو چند تنبیہات

نظم کلام کی روشنی میں ان آیات پر غور کیجیے تو مندرجہ ذیل حقائق سامنے آئیں گے۔

اوّل یہ کہ اعتصام بحبل اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار میں مبتلا ہوئے اور یہ انتشار و اختلاف درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنی ہے۔

دوم یہ کہ جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ یہ سرفرازی و سرخروئی بخشتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں خود اپنی رسی پکڑاتا ہے اگر وہ اپنی شامتِ اعمال سے اس رسی کو چھوڑ کر دوسرے پھندے اپنی گردنوں میں ڈال لیتے ہیں تو قیامت کے دن ان کو اسی درجے کی روسیاہی بھی حاصل ہو گی جس درجے کی ان کو سرخ روئی بخشی گئی تھی۔ چہرے روشن ان کے ہوں گے جو ہر طرح کے حالات میں اس رسی کو تھامے رہیں گے۔ یہ لوگ بے شک اللہ کے فضل و رحمت

کے حق دار ہوں گے۔

سوم یہ کہ یہ ساری تنبیہات بالحق ہیں یعنی ہر بات شدنی ہے۔ ان کو محض خالی خولی دھمکی سمجھ کر جو لوگ نظر انداز کریں گے وہ اپنی روسیاہی کا سامان خود کریں گے اور اس کی تمام تر ذمہ داری انھی پر ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آگاہی پہلے سے اسی لیے سنادی ہے کہ اللہ تعالیٰ یہ نہیں چاہتا کہ کسی کو سزا اس پر حجت تمام کیے بغیر دے۔

چہارم یہ کہ آسمان و زمین میں سارا اختیار صرف اللہ تعالیٰ ہی کا ہے۔ سارے امور اسی کے حضور پیش ہوں گے اور اسی کا فیصلہ ناطق و نافذ ہوگا۔ اگر کسی نے کسی اور سے امید باندھ رکھی ہو تو اس کی یہ امید محض ایک واہمہ ہے جو حقیقت کے ظہور کے بعد بالکل سراب ثابت ہوگی۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ ساری تنبیہات مسلمانوں کو سنائی جارہی ہیں کہ ان تمام خطرات سے بچ کے رہنا۔

۲۷- آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۱۰-۱۲۰

اوپر کی تنبیہات کے اندر یہ حقیقت خود بول رہی تھی کہ اہل کتاب جس منصب امامت پر اب تک سرفراز رہے ہیں ہر پہلو سے وہ اس کے لیے نااہل ثابت ہو چکے ہیں۔ اس وجہ سے وہ اس منصب سے معزول ہوئے اور خدا نے یہ امانت اس امت کے سپرد فرمائی جو اس کی اہل ہے۔ ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ بشارت دی ہے کہ اب یہ اہل کتاب تمھاری مخالفت میں جتنا زور چاہیں لگالیں وہ تمھارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے بلکہ ہر جگہ منہ کی کھائیں گے اور ان کے لیے ذلت مقدر ہو چکی ہے۔

اثنائے کلام میں اہل کتاب کے اس گروہ کی تحسین بھی فرمائی ہے جو حق پر قائم تھا اور جو بالآخر دولت اسلام سے سرفراز ہوا۔

پھر اہل کتاب کی اصل بیماری کی طرف اشارہ ہے جو فی الحقیقت قبول حق میں ان کے لیے حجاب بنی اور یہ واضح فرمایا کہ اس حق سے محروم رہنے کے بعد اب وہ اپنی دینداری کا بھرم رکھنے کے لیے جو ظاہر داری بھی کریں گے سب اکارت جائے گی، اس کا کچھ حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد مسلمانوں کو متنبہ کیا ہے کہ اب تم ان سے تمام تعلقات دوستی و محبت ختم کرو اس لیے کہ اب تمھارے لیے ان کے دلوں میں دشمنی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور ان کے اندر خیر کی کوئی رمق باقی نہیں رہی ہے ـــ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۱۰-۱۲۰ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ
تَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ؕ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ

لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُونَ ﴿١١٠﴾
لَنْ يَّضُرُّوكُمْ إِلَّآ أَذًى ۖ وَإِنْ يُّقَاتِلُوكُمْ يُوَلُّوكُمُ الْأَدْبَارَ ثُمَّ
لَا يُنْصَرُونَ ﴿١١١﴾ ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ أَيْنَ مَا ثُقِفُوٓا إِلَّا بِحَبْلٍ
مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ
عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۚ ذٰلِكَ بِأَنَّهُمْ كَانُوا يَكْفُرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَ
يَقْتُلُونَ الْأَنۢبِيَآءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۚ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوا وَّكَانُوا يَعْتَدُونَ ﴿١١٢﴾
لَيْسُوا سَوَآءً ۚ مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ أُمَّةٌ قَآئِمَةٌ يَّتْلُونَ اٰيٰتِ
اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُونَ ﴿١١٣﴾ يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَيَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُونَ
فِي الْخَيْرَاتِ ۚ وَأُولٰٓئِكَ مِنَ الصّٰلِحِينَ ﴿١١٤﴾ وَمَا يَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ
فَلَنْ يُّكْفَرُوهُ ۗ وَاللّٰهُ عَلِيمٌۢ بِالْمُتَّقِينَ ﴿١١٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا
لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَآ أَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۖ وَأُولٰٓئِكَ
أَصْحٰبُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿١١٦﴾ مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي
هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوٓا
أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ
يَظْلِمُونَ ﴿١١٧﴾ يٰٓأَيُّهَا الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّنْ
دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ خَبَالًا ۚ وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ
الْبَغْضَآءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۖ وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ

بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۱۸﴾ هٰٓاَنْتُمْ اُولَآءِ تُحِبُّوْنَهُمْ
وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا
اٰمَنَّا ۚ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ
مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۱۱۹﴾ اِنْ
تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ
وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا
يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ ﴿۱۲۰﴾ ع

ترجمۂ آیات ۱۱۰-۱۲۰

تم بہترین امت ہو، لوگوں کی رہنمائی کے لیے مبعوث کیے گئے ہو، معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ اور اگر اہل کتاب بھی ایمان لاتے تو ان کے لیے یہ بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ تو مومن ہیں اور اکثر نافرمان ہیں، وہ تمھیں تھوڑی سی زبان درازی کے سوا کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے اور اگر وہ تم سے جنگ کریں گے تو پیٹھ دکھائیں گے۔ پھر ان کی کوئی مدد بھی نہیں ہوگی۔ وہ جہاں کہیں بھی ہیں ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے۔ بس اگر کچھ سہارا ہے تو اللہ اور لوگوں کے کسی عہد کے تحت۔ وہ اللہ کا غضب لے کر لوٹے ہیں اور ان پر پست ہمتی تھوپ دی گئی ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیتوں کا انکار اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں کیونکہ یہ نافرمان اور حد سے آگے بڑھنے والے رہے ہیں۔ ۱۱۰-۱۱۲

سب اہل کتاب یکساں نہیں ہیں۔ ان میں ایک گروہ عہد پر قائم ہے۔ یہ رات کے وقتوں میں اللہ کی آیات کی تلاوت اور سجدہ کرتے ہیں۔ اللہ اور روز آخرت پر ایمان

رکھتے ہیں، معروف کا حکم دیتے ہیں، منکر سے روکتے ہیں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرتے ہیں اور یہ لوگ نیکوکاروں میں سے ہیں۔ جو نیکی بھی یہ کریں گے تو اس سے محروم نہیں کیے جائیں گے اور اللہ خدا ترسوں سے باخبر ہے۔ ۱۱۳-۱۱۵

بے شک جن لوگوں نے کفر کیا ان کے مال اور ان کی اولاد خدا کے مقابل میں کام آنے والے نہیں۔ یہ لوگ دوزخی ہوں گے اور وہ اسی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ جو کچھ اس دنیا میں خرچ کرتے ہیں اس کی تمثیل ایسی ہے کہ کسی ایسی قوم کی کھیتی پر جس نے اپنے اوپر ظلم کیا ہو، پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو تباہ کر کے رکھ دے۔ اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا۔ بلکہ یہ خود اپنی جانوں پر ظلم ڈھاتے رہے ہیں۔ ۱۱۶-۱۱۷

اے ایمان والو! اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ، یہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ تمھارے لیے زحمتوں کے خواہاں ہیں۔ ان کی عداوت ان کے مونہوں سے ظاہر ہو چکی ہے اور جو کچھ ان کے سینے چھپائے ہوئے ہیں وہ اس سے بھی سخت تر ہے۔ ہم نے تمھارے لیے اپنی تنبیہات واضح کر دی ہیں اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ یہ تمھی ہو کہ تم ان سے دوستی رکھتے ہو، وہ تو تم سے دوستی نہیں رکھتے حالانکہ تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو۔ اور جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں اور جب آپس میں ملتے ہیں تو تم پر غصہ سے انگلیاں کاٹتے ہیں، کہہ دو تم اپنے غصے میں مر جاؤ۔ اللہ سینوں کے بھید سے خوب واقف ہے۔ اگر تمھیں کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو ان کو اس سے تکلیف پہنچتی ہے اور اگر تم کو کوئی گزند پہنچ جاتا ہے تو اس سے خوش ہوتے ہیں اور اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ان کی چال تمھیں کوئی نقصان نہ

پہنچا سکے گی۔ وہ جو کچھ کر رہے ہیں، اللہ اس کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ۱۱۸-۱۲۰

۲۸۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۭ وَلَوْ اٰمَنَ اَهْلُ الْكِتٰبِ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ وَاَكْثَرُهُمُ الْفٰسِقُوْنَ (۱۱۰)

'کان' یہاں تامہ ہے جس طرح کَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا میں ہے۔ خَيْرَ اُمَّةٍ میں اشارہ اس حقیقت کی طرف ہے کہ اب دین کی صحیح شاہراہ پر تمہی ہو۔ اللہ نے جو دین نازل فرمایا تھا، اہل کتاب نے اس میں کج پیچ کی راہیں نکال کر اصلی دین کو گم کر دیا۔ اب خلق کی رہنمائی کے لیے خدا نے تم کو کھڑا کیا ہے۔ اسی حقیقت کو سورۂ بقرہ میں كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ (الآیہ) کے الفاظ سے واضح فرمایا ہے۔ وہاں ہم لکھ چکے ہیں کہ یہ امت چونکہ ٹھیک نقطۂ اعتدال اور وسط شاہراہ پر ہے اس وجہ سے یہ خیر امت ہے۔ لِلنَّاسِ میں ایک مضاف محذوف ہے یعنی لوگوں کی اصلاح، رہنمائی اور ان پر اللہ کے دین کی گواہی دینے کے لیے، جیسا کہ فرمایا ہے لِتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ۔

خیر امت کا منصب صفات کے ساتھ مشروط ہے

تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ یہ اس امت کے خیر امت ہونے کی دلیل بیان ہوئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اس لیے خیر امت ہو کہ تم معروف کا حکم دیتے ہو، منکر سے روکتے ہو، اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس منصب پر تم نسل و نسب کی بنا پر نہیں سرفراز ہوئے ہو، جیسا کہ اہل کتاب نے اپنی بابت گمان کیا، بلکہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری نے تمھیں اس کا استحقاق بخشا ہے۔ اس سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ یہ منصب صفات اور ذمہ داریوں کے ساتھ مشروط ہے۔ کسی مخصوص گروہ کے ساتھ اللہ نے اس کو باندھ نہیں چھوڑا ہے کہ لازماً یہ اس کے ساتھ بندھا ہی رہے، اگرچہ وہ یہود و نصاریٰ کی طرح معروف کو منکر اور منکر کو معروف بنا کے رکھ دے۔

ایمان ہر نیکی کی جڑ ہے

تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اصل بنیاد اللہ پر ایمان ہے۔ کسی کو جو کچھ بھی عزت و فضیلت اللہ کی نگاہوں میں حاصل ہوتی ہے وہ اسی کی بنا پر حاصل ہوتی ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی معتبر وہی ہے جو ایمان باللہ کے ساتھ ہو۔ منبروں اور ایسٹیجوں سے خدا پرستی اور دینداری کے جو وعظ کھوکھلے سینوں سے نکلتے ہیں ان کی حیثیت وہی ہے جس کا ذکر قرآن نے علمائے یہود سے متعلق فرمایا ہے کہ اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ (کیا تم دوسروں کو نیکی اور تقویٰ کے وعظ سناتے ہو لیکن اپنے آپ کو بھول جاتے ہو)

فسق کا لفظ یہاں ایمان و اطاعت سے نکل جانے کے معنی میں ہے۔ اس کی تشریح ہم دوسرے مقام میں کر چکے ہیں۔

اس امت کے منصب امامت کا اعلان

نظم کے اعتبار سے یہ آیت جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں، اس امت کے منصب امامت کا اعلان ہے۔ اس سورہ کی تمہید میں اَللّٰھُمَّ مَالِکَ الْمُلْکِ والی دعا کے ضمن میں ہم یہ لکھ آئے ہیں کہ اس کے اندر اہل کتاب کی معزولی اور امت مسلمہ کی تقرری کا فیصلہ مضمر ہے۔ چنانچہ پوری تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ دونوں کی بدعہدیاں واضح کر چکنے کے بعد یہ اعلان کر دیا گیا کہ اب خیر امت کے منصب کے حق دار یہ اہل ایمان ہیں نہ کہ یہود و نصاریٰ۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق فرمایا کہ اگر یہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لاتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ بہتر ہوتا کے الفاظ کے اندر جو ابہام و اجمال ہے یہ متکلم کے اس غضب کا غماز ہے جس کے متحمل الفاظ نہیں ہو سکتے تھے۔ اس کے بعد باندازِ حسرت فرمایا کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود ان میں ایمان لانے والے تھوڑے نکلے۔ اکثریت بدعہدوں اور نافرمانوں ہی کی نکلی۔

لَنْ یَّضُرُّوْکُمْ اِلَّآ اَذًی ؕ وَاِنْ یُّقَاتِلُوْکُمْ یُوَلُّوْکُمُ الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا یُنْصَرُوْنَ (۱۱۱)

'اذًی' کا مفہوم

'اذًی' کے معنی دکھ اور تکلیف کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کی جڑ کٹ چکی ہے۔ ان کے اندر اب اتنا دم خم نہیں ہے کہ تمہیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکیں۔ بس زیادہ سے زیادہ جو یہ کر سکتے ہیں وہ یہ کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کچھ طعن و تشنیع، کچھ زبان درازی اور کچھ افترا پردازی و تہمت تراشی کر لیں۔ اس سے زیادہ کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے۔ اور اگر یہ تم سے لڑنے کے لیے نکلے تو پیٹھ دکھائیں گے اور پھر ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ کسی طرف سے بھی ان کی کوئی مدد نہیں ہو گی۔ بعد کے واقعات نے قرآن کی اس پیشین گوئی کی حرف بہ حرف تصدیق کر دی۔ یہی مضمون آگے اس طرح بیان ہوا ہے وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِیْنَ اُوْتُوا الْکِتٰبَ مِنْ قَبْلِکُمْ وَمِنَ الَّذِیْنَ اَشْرَکُوْٓا اَذًی کَثِیْرًا (۱۸۶) اور تم ان لوگوں کی طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی اور مشرکین کی طرف سے بہت سی تکلیف دہ باتیں سنو گے۔

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ اَیْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الْمَسْکَنَۃُ ؕ ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَانُوْا یَکْفُرُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰہِ وَیَقْتُلُوْنَ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ ؕ ذٰلِکَ بِمَا عَصَوْا وَّکَانُوْا یَعْتَدُوْنَ (۱۱۲)

ذلت کی مار

ضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ یعنی جس طرح دیوار پر گیلی مٹی تھوپ دی جاتی ہے اسی طرح ان پر ذلت تھوپ دی گئی ہے۔ اس میں اشارہ اس بات کی طرف بھی ہے کہ انھوں نے عزت کی جگہ ذلت کی راہ اختیار کی تو ان پر پوری طرح ذلت مسلط کر دی گئی۔ اَیْنَمَا ثُقِفُوْا سے اس ذلت کے احاطہ اور اس کی ہمہ گیری کی طرف اشارہ ہے کہ جہاں کہیں بھی یہ ہیں ذلت ان پر مسلط ہے، یہاں تک کہ اپنے مرکز میں بھی یہ ذلیل و خوار ہیں۔ دنیا کا کوئی خطہ ایسا نہیں ہے جہاں ان کو عزت حاصل ہو اور یہ اپنی کمر کے بل بوتے پر

کھڑے ہوں۔

'اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰہِ وَحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ' میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہ کہیں قائم ہیں تو اپنی سطوت و عزت کے اعتماد پر نہیں بلکہ یا تو اللہ والوں کے کسی معاہدے نے ان کو امان دے رکھی ہے یا اپنے پاس پڑوس کے قبائل سے انھوں نے کوئی اسی قسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے۔ یہ سہارے وقتی اور عارضی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتدا ان کے مختلف قبائل سے جو معاہدے کیے تھے ان کی عہد شکنیوں اور شرارتوں کی وجہ سے بعد میں وہ ختم کر دیے گئے اور یہ یا تو اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کر دیے گئے یا جلاوطن کر دیے گئے۔ دوسرے قبائل سے انھوں نے جو معاہدے کر رکھے تھے وہ قبائل بھی آہستہ آہستہ اسلام کے زیر اثر آ گئے تو وہ معاہدے بھی عملاً بے اثر ہو کر رہ گئے۔ جس درخت کی اپنی جڑیں کھوکھلی ہوں وہ ٹہنیوں کے سہارے آخر کب تک کھڑا رہ سکتا تھا۔ اس زمانے میں یہود کی نام نہاد سلطنت اسرائیل بھی، جیسا کہ ہم اس کتاب میں کہیں اشارہ کر چکے ہیں، اسی حکم میں داخل ہے۔ وہ بھی درحقیقت اپنے بل بوتے پر نہیں بلکہ بِحَبْلٍ مِّنَ النَّاسِ امریکہ اور انگلستان کے سہارے پر کھڑی ہے اور جو چیز دوسرے کے سہارے کھڑی ہو اس کا کھڑا ہونا اور نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

'وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ' کا مفہوم

وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ کا مفہوم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ یہ یہود کی شامتِ اعمال اور ان کی بدبختی کا بیان ہے کہ جہاں سے ان کو عزت و سرفرازی کی دولتِ دو جہاں لے کے لوٹنا تھا یہ اپنی دوں ہمتی کی وجہ سے وہاں سے خدا کا غضب لے کر لوٹے جس کے نتیجے میں ان پر ذلت مسلط کر دی گئی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو منصب امامت و شہادت پر مامور فرمایا تھا۔ اگر یہ اس کی ذمہ داریاں ادا کرتے اور اپنے عہد پر استوار رہتے تو دنیا اور آخرت دونوں میں ان کا مقام بہت اونچا تھا لیکن یہ اپنی دنیا پرستی اور پست ہمتی کی وجہ سے اس کی ذمہ داریاں نہ سنبھال سکے اور خدا کے غضب کے مستحق ٹھہرے۔ یہ حقیقت یہاں پیش نظر رہے کہ جو مقام جتنا ہی اونچا ہوتا ہے اس کی چڑھائی اتنی ہی سخت ہوتی ہے اور پھر اسی اعتبار سے اس سے گرنے کا انجام بھی نہایت خطرناک ہوتا ہے۔

'مسکنت کا مفہوم'

وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ مسکنت سے مراد بے حوصلگی اور پست ہمتی ہے۔ قرآن نے اہل کتاب کی پست ہمتی کو نہایت حقیقت افروز تمثیلوں سے جگہ جگہ واضح فرمایا ہے۔ ان تمثیلوں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہود پر دنیا پرستی کا اتنا غلبہ تھا کہ آخرت کی طلب اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا کوئی حوصلہ ان کے اندر باقی رہ ہی نہیں گیا تھا۔ وہ آخرت کے بڑے سے بڑے نسیہ کے لیے اپنی دنیا کے چھوٹے سے چھوٹے نقد کو قربان کرنے کی بھی ہمت اپنے اندر نہیں پاتے تھے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی ان کی اس بزدلی اور پست ہمتی پر بار بار ملامت کی ہے۔ بعد کے انبیا نے بھی اس کا نوحہ کیا ہے۔ قرآن نے بھی جگہ جگہ اس کا ذکر کیا ہے۔ کتے والی تمثیل ان کی پست ہمتی ہی کی تمثیل ہے اور غور کیجیے تو معلوم

ہوگا کہ ان کی یہ پست ہمتی ہی تھی جس کے سبب سے وہ اس بات کے مستحق ہوئے کہ ان پر ذلت مسلط کر دی جائے۔

ذلت و مسکنت کے عذاب کا سبب

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ الآیہ۔ یہ علت بیان ہوئی ہے اس بات کی کہ کیوں یہ ذلت، غضب اور مسکنت کے عذاب کے مستحق قرار پائے؟ فرمایا کہ اس کا سبب یہ ہے کہ یہ اللہ کی آیات کا انکار اور انبیا کو ناحق قتل کرتے رہے ہیں۔ بلندی اور رفعت کا ذریعہ اللہ کی آیات ہیں۔ جو لوگ ان کا انکار کریں اور اس انکار کو اپنا شیوہ بنا لیں وہ اگر ذلت کے سزاوار نہ ہوں گے تو کس چیز کے ہوں گے۔ اسی حقیقت کو قرآن نے اس تمثیل میں پیش کیا ہے جس میں فرمایا ہے کہ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ اگر ہم چاہتے تو ان آیات کے ذریعے سے اس کو بلند کرتے لیکن یہ تو برابر زمین ہی کی طرف جھکا رہا۔ ایسا ہی معاملہ انبیا اور آمرین بالقسط کے قتل کا ہے۔ یہ انسانیت کے گل سرسبد ہوتے ہیں۔ انھی کے سہارے انسانیت سعادت اور کمال کے مدارج طے کرتی ہے۔ اگر کوئی گروہ ان کا قاتل رہا ہو تو وہ خدا کی طرف سے غضب اور ذلت کے سوا اور کس چیز کا حقدار ہو سکتا ہے؟

ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ یہ سبب بیان ہوا ہے ان کے کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء کا یعنی نافرمانی اور حدود الٰہی سے تجاوز ان کی عادت رہی ہے۔ اسی چیز نے ان کو کفر اور قتل انبیا پر اکسایا بالآخر یہ جرائم ان کے لیے خدا کے غضب کا باعث ہوئے اور ان پر ذلت و مسکنت تھوپ دی گئی۔

اجزا کی وضاحت کے بعد نظم کے پہلو پر غور کیجیے تو معلوم ہوگا کہ اوپر کی آیت میں جو بات فرمائی گئی تھی، اس آیت میں اس کی دلیل بیان ہو گئی کہ بھلا وہ لوگ تمھارا کیا بگاڑ سکیں گے جن پر ہر جگہ خدا کی مار ہے اور جو اب تمھارے سہاروں ہی پر جی رہے ہیں۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ (۱۱۳-۱۱۵)

'اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ' یعنی وہ گروہ جو اللہ کے عہد و میثاق اور اس کی شریعت پر قائم ہے۔ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ یعنی وہ شب کے اوقات میں کتاب الٰہی کی تلاوت کرتے ہیں اور نمازیں پڑھتے ہیں۔ شب کی نماز و تلاوت ان کے عہد الٰہی پر قائم رہنے کا ثبوت ہے اس لیے کہ اس بے ریا نماز و تلاوت کی بے قراری انھی لوگوں کے اندر پیدا ہو سکتی ہے جو اپنی عظیم ذمہ داری کا نہایت گہرا احساس رکھتے ہوں۔ نماز کی تعبیر سجدہ سے ایک تو اس پہلو سے ہے کہ سجدہ نماز کے اہم ترین ارکان میں سے ہے، دوسرے یہ خشیت اور تذلل کا سب سے بڑا مظہر ہے، تیسرے اس پہلو سے بھی ہے کہ یہود نے، جیسا کہ ہم اس کتاب میں کہیں ذکر کر چکے ہیں، سجدہ کو اپنی نماز سے خارج کر دیا تھا۔

اہل کتاب کا باایمان گروہ

یہ اہل کتاب کے اس گروہ قلیل کا ذکر ہے جو اس اکثریت سے مستثنیٰ ہے جس کا حال اوپر والی آیت

میں بیان ہوا ہے۔ فرمایا کہ سب اہل کتاب اسی طرح کے نہیں ہیں جن کا ذکر اوپر ہوا ہے بلکہ ان میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی ہے جو اپنے عہد پر قائم، شب بیدار و تہجد گزار، اللہ اور آخرت پر ایمان رکھنے والے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ انجام دینے والے اور نیکی اور بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں۔ اس گروہ میں وہ لوگ بھی تھے جو علی الاعلان آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے تھے اور ایسے لوگ بھی تھے جو اگرچہ ان آیات کے نزول کے وقت تک اپنے اسلام کا اعلان نہیں کر سکے تھے لیکن اندر سے وہ بالکل مومن صادق تھے اور بالآخر وہ اسلام لائے۔ ان لوگوں کو قرآن نے صالحین و متقین میں شمار کیا ہے۔ یہ لوگ جو نیکی بھی کریں گے اس کے اجر سے محروم نہیں رہیں گے۔ یہ اسلام میں آجانے کے بعد اپنی ان نیکیوں کا بھی پورا پورا اجر پائیں گے جو اسلام میں آنے سے پہلے انھوں نے کی ہیں۔ اسی گروہ کا ذکر اس سورہ کے آخر میں فرمایا ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ۔ (۱۹۹- آل عمران)

اور بے شک اہل کتاب میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور جو ان کی طرف اتاری گئی ہے خدا سے ڈرتے ہوئے۔ یہ اللہ کی آیات کے عوض میں حقیر قیمت قبول نہیں کرتے یہی لوگ ہیں جن کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا صلہ ہے۔ بے شک اللہ جلد حساب چکا دینے والا ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا ۭ وَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُوْنَ فِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيْحٍ فِيْهَا صِرٌّ اَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَاَهْلَكَتْهُ ۭ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ وَلٰكِنْ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ۝۱۱۷

کفر و شرک سے تمام نیکیاں برباد ہو جاتی ہیں

یہ ان اہل کتاب کا ذکر ہے جو اوپر والے گروہ کے برعکس اپنے کفر پر اڑے رہ گئے۔ ان کے بابت فرمایا کہ جس مال و اولاد کی محبت نے انہیں خدا سے بے پروا کیا وہ ان کو خدا کی پکڑ اور دوزخ سے نہ بچا سکیں گے۔ یہ لوگ دوزخ میں پڑیں گے اور اس سے کبھی نہ نکل سکیں گے۔ اس دنیا کی زندگی میں اپنی رسمی دینداری کی نمائش کے لیے جو کچھ یہ خرچ کرتے ہیں، یہ خرچ کرنا بھی آخرت میں ان کے لیے کچھ سود مند نہیں۔ ان کے اس خرچ کی تمثیل اس کھیتی کی ہے جس پر پالے والی ہوا چل جائے اور وہ اس کو برباد کر کے رکھ دے۔ کفر و شرک کے ساتھ جو کام نیکی اور دینداری کی نوعیت کے کیے جاتے ہیں وہ سب اکارت جاتے ہیں۔ کفر و شرک ٹھنڈی آگ ہے جو ساری محنت کو راکھ کا ڈھیر بنا کے رکھ دیتی ہے۔ اوپر والی آیت میں بیان ہوا تھا کہ جو اہل کتاب اپنے ایمان پر قائم رہے اور قرآن کے نزول کے بعد قرآن پر بھی ایمان لائے ان کی پچھلی

نیکیاں بھی سب شرف قبولیت پائیں گی۔ اس آیت میں واضح فرمایا ہے کہ جو لوگ نہ اپنے عہد پر قائم رہے نہ اسلام میں داخل ہوئے ان کا سارا کیا دھرا برباد ہو جائے گا۔

وَمَا ظَلَمَهُمُ اللّٰهُ الآیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہے بلکہ یہ ظلم انھوں نے خود اپنے اوپر کیا ہے۔ درخت اپنی جڑ کے سلامت رہنے سے سلامت رہتا ہے۔ اگر درخت کی جڑ اکھاڑ دی جائے تو اس کی شاخوں اور اس کے پتوں پر پانی دینے میں خواہ کوئی کتنی ہی محنت اٹھائے اور کتنی ہی زحمت جھیلے سب بے سود ہے۔ اس کی محنت کی بربادی پر اگر قابل ملامت ہے تو وہ خود ہے نہ کہ قدرت اور قدرت کا قانون۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا ۭ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ ښ وَمَا تُخْفِيْ صُدُوْرُھُمْ اَكْبَرُ ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ هٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ تُحِبُّوْنَھُمْ وَلَا يُحِبُّوْنَكُمْ وَتُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ ۚ وَاِذَا لَقُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا ښ وَاِذَا خَلَوْا عَضُّوْا عَلَيْكُمُ الْاَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۭ قُلْ مُوْتُوْا بِغَيْظِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝ اِنْ تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْھُمْ ۡ وَاِنْ تُصِبْكُمْ سَيِّئَةٌ يَّفْرَحُوْا بِھَا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُھُمْ شَـيْـــًٔـا ۭ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ مُحِيْطٌ (۱۱۸ - ۱۲۰)

'لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً' بِطَانَة لحاف وغیرہ کے استر کو کہتے ہیں۔ بطانۃ الرجل سے آدمی کے اہل و عیال اور اس کے خواص و محرمان راز مراد ہوتے ہیں[1]۔ 'خبال' کے معنی فساد اور بگاڑ کے ہیں لَا يَاْلُوْنَكُمْ خَبَالًا یعنی تمھارے اندر فساد پیدا کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ 'عنت' کے معنی مشقت، زحمت اور تکلیف کے ہیں۔ وَدُّوْا مَا عَنِتُّمْ یعنی تمھارے لیے وہ اس بات کے متمنی ہیں کہ تمھیں اس راہ میں ٹھوکریں پیش آئیں اور تم زحمتوں میں پھنسو۔ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاۗءُ مِنْ اَفْوَاهِھِمْ سے مراد اسلام دشمنی کی وہ باتیں ہیں جن سے صاف پتہ چلتا تھا کہ اہل کتاب سب کچھ گوارا کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اسلام اور مسلمانوں کو کسی قیمت پر بھی گوارا کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں چنانچہ قرآن نے ان کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ یہ کھلم کھلا مشرکین تک کو بھی مسلمانوں پر ترجیح دیتے ہیں، کہتے ہیں کہ مسلمانوں سے تو کہیں زیادہ ہدایت پر یہ ہیں۔ (هٰٓؤُلَاۗءِ اَهْدٰى مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا سَبِيْلًا)

هٰٓاَنْتُمْ اُولَاۗءِ میں ضمیر خطاب ھا اور اولاء کے بیچ میں آگئی ہے۔ ھا درحقیقت تنبیہ کا کلمہ ہے اس وجہ سے جب اس پر زور دینا ہوتا ہے تو اہل عرب یہ طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ اسی طرح ھا انا ذا بھی کہتے ہیں۔

---

[1] بطانة الرجل وليجته الذي يكاشفه باسراره ثقة بمودته ۔ اقرب الموارد

اللہ کی پوری کتاب صرف قرآن ہے

تُؤْمِنُوْنَ بِالْكِتٰبِ كُلِّهٖ پر تفصیل کے ساتھ ہم سورۂ بقرہ میں بحث کر چکے ہیں۔ اصل میں پچھلے صحیفوں اور قرآن میں نسبت جزو اور کل کی ہے۔ اہل کتاب کو کتاب الٰہی کا صرف ایک حصّہ دیا گیا تھا۔ پوری کتاب کا دیا جانا آخری بعثت پر اٹھا رکھا گیا تھا۔ چنانچہ اہل کتاب کے متعلق بار بار یہ الفاظ آتے ہیں اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ اُوْتُوْا نَصِيْبًا مِّنَ الْكِتٰبِ۔ (کیا تم نے ان کو تو دیکھو جنھیں کتاب الٰہی کا ایک حصّہ دیا گیا) اللہ تعالیٰ کی پوری کتاب قرآن ہے، جس طرح اس کا پورا دین اسلام ہے۔ اس وجہ سے جب مسلمان قرآن پر ایمان لاتا ہے تو خدا کی پوری کتاب پر ایمان لاتا ہے، اس پر بھی جو پہلے اتری اور اس پر بھی جو بعد میں اتری۔ قرآن سب کا جامع ہے۔

وَاِذَا خَلَوْا یعنی جب وہ اپنی مجلسوں میں ہوتے ہیں جیسا کہ سورۂ بقرہ میں بالکل اسی قسم کے سیاق میں فرمایا ہے وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ (اور جب یہ اپنے لیڈروں کے پاس ہوتے ہیں تو کہتے ہیں ہم تو آپ کے ساتھ ہیں)

مسلمانوں کو اہل کتاب سے ہوشیار رہنے کی ہدایت

ان آیات میں مسلمانوں کو اسی طرح کی تنبیہ ہے جس طرح کی تنبیہ آیت ۲۸ میں گزر چکی ہے: خطاب اگرچہ عام ہے لیکن پیش نظر، جیسا کہ ہم نے آیت ۲۸ کے تحت اشارہ کیا ہے، وہ مسلمان ہیں جو یا تو اپنی سادگی کی وجہ سے اہل کتاب کی چالوں کو اچھی طرح سمجھتے نہیں تھے یا اپنی کمزوری کے سبب سے ان سے اپنے پچھلے روابط توڑنا نہیں چاہتے تھے درآنحالیکہ اس مرحلے میں اہل کتاب کے تعلقات کسی مسلمان کے ساتھ مخلصانہ نہیں رہ گئے تھے بلکہ جس حد تک بھی تھے محض سازشانہ اغراض و مقاصد کے لیے تھے۔ اس وجہ سے قرآن نے نہایت واضح الفاظ اور بالکل قطعی لب و لہجہ میں متنبّہ کیا کہ اے ایمان والو! اپنے سے باہر والوں کو اپنا محرم راز نہ بناؤ۔ یہ تمھیں نقصان پہنچانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھیں گے۔ یہ اس بات کے خواہشمند نہیں ہیں کہ تمھیں تمھارے مقاصد میں کامیابی حاصل ہو بلکہ یہ تمھارے لیے زحمتوں اور پریشانیوں کے آرزومند ہیں۔ ان کی دشمنی ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہو چکی ہے لیکن دلوں میں جو کچھ ہے وہ اس سے بھی کہیں زیادہ سخت و شدید ہے۔ فرمایا کہ ہم نے یہ بات اچھی طرح کھول کر سمجھا دی ہے۔ اب بھی اگر تم نہ سمجھے تو اس کا خمیازہ بھگتو گے۔

اس کے بعد غیرت دلائی ہے کہ تم تو ان سے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہو لیکن وہ تم سے ذرا محبت نہیں کرتے حالانکہ تم پوری کتاب پر ایمان رکھتے ہو اور تمام نبیوں پر ایمان لائے ہو اور وہ تمھاری کتاب پر ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ جب تم سے ملتے ہیں تو تمھیں دھوکا دینے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایمان لائے ہوئے ہیں[1]، اور جب اپنوں کے اندر ہوتے ہیں تو تم پر غصّے سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں چباتے ہیں۔

اسی بیچ میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان دانت پیسنے والوں کو مخاطب کر کے کہلا دیا کہ تم اسی غیظ و غضب کی بھٹی میں چاہو تو جل کر مر جاؤ لیکن تم اسلام کا بال بیکا نہیں کر سکتے۔

۱؎ اس کی وضاحت ہم سورۂ بقرہ میں کر چکے ہیں، وہاں دیکھیے۔

صبر اور تقویٰ کلید کامیابی ہے

اس جملہ معترضہ کے بعد اوپر والا سلسلۂ کلام پھر لے لیا اور فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تم کو کوئی کامیابی حاصل ہوتی ہے تو انھیں بڑا رنج ہوتا ہے اور اگر تمھیں کوئی نقصان پہنچ جائے تو یہ اس سے بہت خوش ہوتے ہیں۔ لیکن اگر تم نے ثابت قدمی دکھائی اور ان باتوں سے بچتے رہے جن سے بچتے رہنے کی تمھیں نہایت واضح ہدایات دے دی گئی ہیں تو ان کی چالیں تمھیں کچھ بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ اللہ تعالیٰ ان کی ساری سرگرمیوں اور ساری چالوں کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ اس آخری ٹکڑے کی مزید وضاحت کے لیے اسی سورہ کی آیات ۱۲۵ اور ۱۸۶ پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ لَنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا کے تحت ابن جریرؒ کا ایک نکتہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہاں جس تقویٰ کا حکم دیا گیا ہے اس میں سب سے مقدم لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً مِّنْ دُوْنِكُمْ کی ہدایات پر عمل ہے یعنی کفار کو اپنا محرم راز بنانے سے احتراز۔

۲۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۲۱-۱۲۹

اب آگے ان واقعات و حالات پر تبصرہ ہے جو غزوۂ احد کے موقع پر پیش آئے اور یہ سلسلۂ بیان سورہ کے آخر تک چلا جائے گا۔ ہم اس سورہ کے تمہیدی مباحث میں واضح کر چکے ہیں کہ غزوۂ احد میں مسلمانوں کی اپنی ہی ایک جماعت کی بے تدبیری سے جو شکست پیش آئی اس نے اسلام اور کفر کی اس کشمکش سے تعلق رکھنے والے ہر گروہ پر کسی نہ کسی پہلو سے اثر ڈالا۔ مسلمانوں میں جو لوگ کمزور تھے وہ اس حادثہ سے بددل ہو گئے اور ان کی اس بددلی سے منافقین نے فائدہ اٹھا کر ان کے دلوں میں اسلام، اسلام کے مستقبل اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف مختلف قسم کے وسوسے بھرنے شروع کر دیے۔ یہود کو بھی اس حادثے سے بڑی شہ ملی، وہ ازسرنو اسلام کے خلاف پروپیگنڈا اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں سرگرم ہو گئے۔ قریش کو بدر کی شکست سے جو ضرب پہنچی تھی اس کا زخم بھی گویا اس واقعہ سے مندمل ہو گیا اور وہ پھر یہ حوصلہ کرنے لگے کہ اسلام کو زک پہنچائی جا سکتی ہے۔

یہ صورت حال متقضی ہوئی کہ اُحد کے واقعات پر تبصرہ کر کے ان تمام غلط فہمیوں کو دور کیا جائے جو اس موقع پر مخالفین، ذہنوں میں پیدا کر رہے تھے۔ ساتھ ہی یہ بہترین موقع تھا اس بات کے لیے کہ مسلمانوں کی کمزوریوں اور غلطیوں پر گرفت کی جائے اور آئندہ ان کو ان سے احتراز کرنے کی ہدایت کی جائے تاکہ یہ امت کمزوریوں سے پاک ہو کر اس منصب کی ان ذمہ داریوں کی صحیح طور پر اہل ہو سکے جس پر كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ والی آیت میں اس کو سرفراز کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب اس سورہ میں بات یہاں تک پہنچی کہ تمھی غالب اور فتحمند ہو گے اور تمھارے مخالفوں کی کوئی چال بھی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گی بشرطیکہ تم صبر اور تقویٰ پر قائم رہو تو بہترین موقع گویا احد کے واقعات پر تبصرہ کر کے یہ دکھانے کا آ گیا کہ صبر اور تقویٰ کے پہلو سے وہ کیا خامیاں ابھی جماعتی زندگی میں موجود تھیں جو اس افتاد کا باعث ہوئیں اور اس سے انفرادی اور اجتماعی اصلاح و تزکیہ کے کیا کیا سبق ملتے ہیں۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ
۱۲۱-۱۲۹ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۲۱﴾ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ
وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ
اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲۳﴾
اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ
اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ﴿۱۲۴﴾ بَلٰٓى ۙ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا
وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ
الربع اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى
لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ؕ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ
الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ﴿۱۲۶﴾ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اَوْ
يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَآئِبِيْنَ ﴿۱۲۷﴾ لَيْسَ لَكَ مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ اَوْ
يَتُوْبَ عَلَيْهِمْ اَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَاِنَّهُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۱۲۸﴾ وَلِلّٰهِ مَا
فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ
ع ۹/۴ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۲۹﴾ ع

ترجمۂ آیات اور یاد کرو جب کہ تم اپنے گھر سے نکلے مسلمانوں کو جنگ کے مورچوں میں مامور کرنے
۱۲۱-۱۲۹ کے لیے اور اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ ۱۲۱

جب کہ تم میں سے دو جماعتوں نے حوصلہ چھوڑ دینے کا ارادہ کیا حالانکہ اللہ ان کا

مددگار تھا۔ اور اللہ ہی پر چاہیئے کہ اہلِ ایمان بھروسہ کریں۔ اور اللہ نے تو تمھاری مدد بدر میں بھی کی جب کہ تم نہایت کمزور تھے۔ پس اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ اس کے شکرگزار رہ سکو۔ ۱۲۲-۱۲۳

یاد کرو کہ جب تم مسلمانوں سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمھارے لیے کافی نہیں ہے کہ تمھارا رب تین ہزار تازہ دم فرشتوں سے تمھاری مدد فرمائے؟ ہاں اگر تم ثابت قدم رہو گے اور بچتے رہو گے اور وہ تمھارے اوپر بھی آدھمکے، تو تمھارا رب پانچ ہزار فرشتوں سے تمھاری مدد فرمائے گا، جو اپنے خاص نشان لگائے ہوئے ہوں گے۔ ۱۲۴-۱۲۵

اور اللہ نے اس کو نہیں بنایا مگر تمھارے لیے بشارت اور تاکہ تمھارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں، اور مدد نہیں آتی مگر خدائے غالب و حکیم ہی کے پاس سے، تاکہ اللہ کافروں کے ایک حصے کو کاٹ دے یا انھیں ذلیل کر دے کہ وہ خوار ہو کر لوٹیں۔ ۱۲۶-۱۲۷

تمھیں اس معاملے میں کوئی اختیار نہیں، خدا ان کی توبہ قبول کرے یا انھیں عذاب دے۔ کیونکہ وہ ظالم ہیں اور اللہ ہی کے اختیار میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔ وہ جس کو چاہے گا بخشے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا اور اللہ غفور رحیم ہے۔ ۱۲۹-۱۳۰

۳۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۱۲۱)

'بَوّا، یُبَوِّئُ' کے معنی ٹھہرانا، ٹکانا، مقیم کرنا، مامور کرنا۔ مقاعد، مقعد کی جمع ہے جس کے معنی بیٹھنے کی جگہ کے ہیں لیکن وسیع استعمال میں اس کے معنی گھات لگانے کی جگہ کے بھی ہو سکتے ہیں اور قرینہ موجود ہو جیسا کہ یہاں ہے تو اس سے جنگ کا مورچہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

یہ آیت تمہید ہے اس تبصرے کی جو جنگ اُحد کے واقعات اور ان سے پیدا شدہ اثرات پر آگے آرہا

غزوۂ احد کے واقعات پر تبصرہ

ہے۔ یہ جنگ چونکہ ابھی تازہ تازہ ہوئی تھی، اس وجہ سے ہر شخص کے سامنے تھی۔ نام لیے بغیر بھی اس کے واقعات کی طرف اشارہ کر دینا کافی تھا۔ لیکن یہ تبصرہ چونکہ بعض ایسے حالات و اثرات پر بھی تھا جن کے بعض گوشے بعض پارٹیوں کی در پردہ سازشوں سے تعلق رکھنے والے تھے یا ان کا تعلق ذہنی و قلبی تصورات و تاثرات سے تھا اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اپنی صفات ۔سمیع و علیم۔ کا حوالہ دے کر تمہید ہی میں سب کو متنبہ کر دیا کہ اس تبصرے پر کسی کے لیے چون و چرا، رد و قدح اور بحث و تردید کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ یہ تبصرہ اس کی طرف سے ہے جو سب کچھ جانتا سنتا ہے۔ اس نے جو کچھ بھی کہا ہے سب کچھ بے خطا سمع و علم پر مبنی ہے۔

إِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتَانِ مِنكُمْ أَن تَفْشَلَا ۙ وَاللَّهُ وَلِيُّهُمَا ۗ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ وَلَقَدْ نَصَرَكُمُ اللَّهُ بِبَدْرٍ وَأَنتُمْ أَذِلَّةٌ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ (۱۲۲-۱۲۳)

'فشل' کا مفہوم

'فشل' کے معنی ہمت ہار دینے اور حوصلہ چھوڑ دینے کے ہیں۔ جنگ میں اصل اہمیت حوصلہ و ہمت کو حاصل ہے، اسلحہ اور دوسری چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ اس وجہ سے سب سے پہلے بعض حماقتوں کی اس کمزوری پر گرفت فرمائی۔

'اذلّۃ' کا مفہوم

'اذلّۃ' ذلیل کی جمع ہے۔ ذلیل عزیز کا متقابل لفظ ہے۔ عزیز کے معنی ہیں غالب، زور آور اور دوسروں کی دسترس سے باہر۔ ذلیل کے معنی کمزور، ناتوان اور دوسروں کے لیے لقمۂ تر کے ہیں۔ اخلاقی رذالت اس لفظ کے بنیادی اجزا میں سے نہیں ہے بلکہ اس کے لوازم بعیدہ میں سے ہے۔ چنانچہ یہ لفظ اچھے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے مثلاً۔ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ (۵۴۔ مائدہ) (وہ مسلمانوں کے لیے نہایت نرم اور کافروں کے لیے نہایت سخت ہیں) یعنی اگر کفار ان کے اندر انگلی دھنسانا اور ان کو اپنے اغراض کے لیے نرم کرنا چاہیں تو وہ پتھر کی چٹان ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے نہایت نرم خو ہیں۔ وہ ان سے جس طرح چاہیں فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ آیت زیر بحث میں بھی یہ لفظ مسلمانوں کی صرف اس وقت کی عددی و مادی کمزوری کو ظاہر کرتا ہے۔ اس میں اخلاقی ضعف و ذلت کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔

منافقین کی ایک شرارت

آیت میں جن دو گروہوں کی طرف اشارہ ہے، مفسرین کے بیان کے مطابق، وہ قبیلہ خزرج کے بنو سلمہ اور قبیلہ اوس کے بنو حارثہ ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے اندر منافقین کی شرارت کی وجہ سے کچھ بزدلی پیدا ہوئی لیکن پھر وہ سنبھل گئے۔ منافقین درحقیقت اس جنگ کے لیے نکلنا نہیں چاہتے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی اس کمزوری کا اندازہ تھا۔ چنانچہ آپ نے یہ چاہا کہ نکلنے سے پہلے صحیح صورتِ حال سامنے آجائے۔ اس کے لیے امتحاناً آپ نے مسلمانوں کے سامنے یہ سوال رکھا کہ قریش کا مقابلہ مدینہ کے اندر سے کیا جائے یا باہر نکل کر؟ اس کا جواب سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے تو ظاہر ہے کہ یہی ہو سکتا ہے کہ باہر نکل کر، چنانچہ انھوں نے پورے جوش و جذبے کے ساتھ یہی جواب دیا۔ لیکن منافقین نے مدینہ میں محصور ہو کر

مقابلے کی مصلحتیں سمجھانے کی کوشش کی۔ آنحضرتؐ نے جب صورتِ حال کا اندازہ کر لیا، منافقین کی کمزوری آپ پر واضح ہو گئی تو آپ نے وہی کیا جو آپ کے دل میں تھا اور جس کا اظہار آپ کے جاں نثار ساتھیوں نے کیا تھا۔ منافقین نے جب دیکھا کہ ان کی یہ سازش ناکام ہو گئی تو وہ نکلنے کو تو مسلمانوں کے ساتھ نکلے، لیکن نکلنے کے بعد ان کے لیڈر ابن اُبَیّ نے ان کو ورغلایا اور اس چیز کو بہانہ بنا کر کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، راستے میں تین سو آدمیوں کے لشکر کے ساتھ الگ ہو گیا۔ اس واقعہ سے قدرتی طور پر مسلمانوں کی بعض جماعتوں کے حوصلے پر اثر پڑا اس لیے کہ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار کفار کے مقابلے میں کل ایک ہزار تھی، ایک ہزار آدمیوں میں سے تین سو آدمیوں کا عین موقع پر فرار، ظاہر ہے کہ ایک اہم حادثہ تھا جس سے کمزور طبائع کا اثر لینا قدرتی امر تھا۔

خدا اہل ایمان کا کارساز ہے

قرآن نے اس کمزوری پر گرفت کی اور فرمایا کہ جو مسلمان اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلتے ہیں اللہ ان کا مددگار اور کارساز ہوتا ہے اور ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمان خدا کی مدد اور اس کی کارسازی پر پورا پورا بھروسہ رکھیں۔ جب خدا ساتھ ہے تو منافقوں اور بزدلوں کی کوئی جماعت ساتھ چھوڑ بھی دے تو اس سے کیا بنتا بگڑتا ہے۔

واقعۂ بدر کی یاددہانی

ایمان اور توکل کا تقاضا واضح کرنے کے بعد بدر کے واقعہ کی بھی یاددہانی فرما دی کہ جب تمھاری عددی قلت اور مادی بے سروسامانی کے باوجود بھی کل خدا نے تمھاری مدد فرمائی اور تمھیں شاندار فتح دی تو اس خدا سے کیوں مایوس ہوتے ہو۔ وہ آج بھی تمھارا حامی و ناصر اور ولی و کارساز ہے۔

تقویٰ کا لفظ وسیع معنوں میں

'فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ' میں تقویٰ کا لفظ جیسا کہ ہم آیت ۱۰۲ کے تحت اشارہ کر چکے ہیں، اپنے وسیع معنی میں ہے۔ یعنی ایمان اور توکل اور خدا کو ولی اور کارساز ماننے کے تقاضے کے خلاف بزدلی اور بے ہمتی کی راہ اختیار کرنے سے بچو۔ خدا کی شکرگزاری کا صحیح حق ادا کرنے کے لیے یہ تقویٰ ضروری ہے۔ جو لوگ عزم و ہمت سے خالی ہوں گے وہ شیطان سے ہر قدم پر مار کھائیں گے اور حق کے بجائے باطل کی راہ اختیار کر لیں گے۔ ایسے لوگ خدا کی شکرگزاری کا حق ادا نہ کر سکیں گے۔

اِذْ تَقُوْلُ لِلْمُؤْمِنِيْنَ اَلَنْ يَّكْفِيَكُمْ اَنْ يُّمِدَّكُمْ رَبُّكُمْ بِثَلٰثَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُنْزَلِيْنَ ۝ بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا وَيَاْتُوْكُمْ مِّنْ فَوْرِهِمْ هٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُمْ بِخَمْسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الْمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيْنَ (۱۲۴-۱۲۵)

مُسَوِّمِين کا مفہوم

'مُسَوِّمِيْنَ'، 'سومة' 'سيمة'، سے ہے جس کے معنی علامت اور نشان کے ہیں الخيل المسومة، ان گھوڑوں کو کہتے ہیں جن پر نشان لگے ہوئے ہوں۔ فرشتوں کے لیے مسومین کی صفت سے اس امر کا اظہار مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو خاص اہتمام کے ساتھ اس مہم کے لیے بھیجے گا اور وہ خاص اس جنگ کے لیے اپنے امتیازی نشان اور بیج لگائے ہوئے ہوں گے۔

یہ اس بات کا حوالہ ہے جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کا حوصلہ بحال کرنے کے لیے اس وقت فرمائی

جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس ہو گیا اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں میں، جیسا کہ اوپر والی آیت میں ذکر ہے، اس سے بد دلی پھیلی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تین سو آدمی الگ ہو گئے تو کیا ہوا؟ کیا تمھارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تین سو کمزور اور پست ہمت آدمیوں کی جگہ تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں کے ذریعے سے تمھاری مدد فرمائے؟ 'اتارے ہوئے' سے مقصود اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اسی کارِ خاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ دم کمک کے طور پر آسمان سے اتارے جائیں گے۔

بَلٰٓى اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی بات کی تائید ہے۔ آپ نے جو امید مسلمانوں کو دلائی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت و نصرت کے بھروسے پر دلائی تھی کہ یہ تین سو آدمیوں کی کمی تین ہزار فرشتوں سے پوری ہو گی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی اس بات کی تائید فرما دی اور اپنے فضل سے اس پر دو ہزار فرشتوں کا اور اضافہ فرما دیا لیکن اس شرط کے ساتھ کہ اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا، اگر تم ثابت قدم رہے اور خدا اور رسول کے احکام کی نافرمانی سے بچتے رہے۔ جنگِ اُحد کے واقعات شاہد ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے اس وعدے کو پورا فرمایا۔ چنانچہ مسلمانوں نے اپنے ابتدائی حملے میں کفار کو اچھی طرح تہ تیغ کیا اور ان کو شکست دے دی۔ لیکن شکست دے چکنے کے بعد ان کی ایک جماعت نے کمزوری دکھائی اور رسول کی صریح ہدایت کے خلاف مالِ غنیمت کی طمع میں ایک نہایت اہم مورچہ خالی چھوڑ دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ حاصل کی ہوئی فتح صبر و تقویٰ کی کمزوری کے سبب سے شکست میں تبدیل ہو گئی۔ آگے اسی سورہ میں اس بات کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ	اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب کہ
اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى	تم خدا کے حکم سے ان کافروں کو تہ تیغ کر رہے تھے
اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى	یہاں تک کہ تم نے کمزوری دکھائی اور تعمیلِ حکم میں
الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ	اختلاف کیا۔ اور اس وقت نافرمانی کی جب کہ خدا
اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ	نے تمھیں تمھاری محبوب چیز — فتح — دکھا دی۔
يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ	تم میں کچھ دنیا کے طالب ہوئے اور کچھ آخرت کے،
يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ	تو خدا نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھیں آزمائش
عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ (۱۵۲)	میں ڈالے۔

وَمَا جَعَلَهُ اللّٰهُ اِلَّا بُشْرٰى لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُكُمْ بِهٖ ۭ وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ۙ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنْقَلِبُوْا خَاۗىِٕبِيْنَ (۱۲۶ - ۱۲۷)

'جعلہ' میں ضمیر کا مرجع وہ وعدۂ نصرت ہے جو اوپر والی آیت میں مذکور ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے ذریعہ سے جو تمھاری مدد کا خاص طور پر وعدہ فرمایا تو یہ اس لیے کہ یہ

تمہارے لیے بشارت کا باعث ہوا اور تمہیں مخالفین و منافقین کے رویے سے جو بد دلی ہوئی ہے وہ دور ہو جائے۔ اگر یہ بشارت نہ بھی اترتی جب بھی اہل ایمان کو یہ عقیدہ رکھنا چاہیئے کہ فتح و نصرت ہمیشہ اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور وہ عزیز و غالب ہے جس کو چاہے فتح و غلبہ عطا فرمائے اور حکیم بھی ہے اس وجہ سے اس کا کوئی فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس آیت پر مزید بحث ہم سورۂ انفال میں کریں گے۔

لِيَقْطَعَ طَرَفًا الآیہ۔ یہ مقصد بیان ہوا ہے اس موقع پر خاص اہتمام کے ساتھ حوصلہ افزائی کا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ چاہا کہ اس جنگ میں یا تو قریش کی قوت بالکل پامال ہو جائے اور وہ ذلیل و خوار ہو کر واپس ہوں یا کم از کم ان کی طاقت کا ایک حصہ ٹوٹ جائے۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ ظَالِمُونَ ۝ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ (۱۲۸-۱۲۹)

آنحضرت کو تسلی

یہ آیت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات کی نوعیت کی ہے۔ اس جنگ کے سلسلے میں منافقین نے جو روش اختیار کی اور اپنی روش سے جو اثر دوسرے مسلمانوں پر انھوں نے ڈالا اس کی طرف اشارہ اوپر گزرا۔ قدرتی طور پر اس بات سے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچا ہوگا۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی دی کہ اس معاملے میں نہ تم کو کوئی دخل ہے اور نہ اس کی تم پر کوئی ذمہ داری ہے۔ تم نے اپنا فرض کما حقہٗ انجام دے دیا۔ اب اگر کوئی گروہ خود اپنی جان پر ظلم ڈھاتا ہے تو اس کا غم تم کیوں کرو۔ اس کا معاملہ اللہ کے حوالہ کرو۔ وہ چاہے گا تو ان کو توبہ کی توفیق دے گا یہ توبہ کریں گے اور وہ ان کو معاف کرے گا۔ اور اگر وہ اس کے اہل نہ ہوں گے تو ان کو سزا دے گا۔ آسمان و زمین کا سارا اختیار اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے وہ جس کو چاہے گا بخش دے گا اور جس کو چاہے گا عذاب دے گا۔ آخر میں اپنی صفاتِ غفور رحیم کا حوالہ دے کر یہ ظاہر فرما دیا کہ خدا غفور رحیم ہے۔ اس وجہ سے اگر وہ کسی کو سزا دے گا تو اسی وقت دے گا جب وہ اس کو سزا کا مستحق پائے گا۔

۱۳۱۔ آگے کا مضمون —— آیات ۱۳۰-۱۴۳

آگے کی آیات میں پہلے اسی جہاد کے تعلق سے جس کا ذکر ہوا انفاق پر ابھارا ہے، پھر اُحد کی شکست سے جو بد دلی پیدا ہوئی تھی اس کو دور کرنے کے لیے اس کی بعض حکمتیں اور مصلحتیں واضح فرمائی ہیں تاکہ جن مسلمانوں کے اندر کچھ افسردگی پیدا ہو گئی ہے ان کے اندر از سرِ نو انفاق و جہاد کی حرارت پیدا ہو جائے۔ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن سیاق و سباق دلیل ہے کہ روئے سخن خاص طور پر انھی مسلمانوں کی طرف ہے جن سے اس جنگ کے دوران میں کوئی کمزوری صادر ہوئی تھی، یا جنگ کے نتیجہ نے ان کے ذہن پر کوئی بڑا اثر ڈالا تھا۔ گویا اس جنگ نے بہت سی طبیعتوں کے اس میل کچیل کو اوپر ابھار دیا تھا جو اب تک اندر دبا ہوا تھا اور اب وقت آگیا تھا کہ اس کو دھو کر صاف کیا جائے۔ چنانچہ اب آگے کا سلسلۂ بیان زیادہ تر اسی نوعیت کا ہے۔ یہ گویا

تزکیہ و تطہیر کے باب کا ایک حصّہ ہے۔

انفاق کے مضمون کا آغاز سود کی ممانعت کے ذکر سے کیا ہے اس لیے کہ سود خوری اور انفاق میں نسبت ضدین کی ہے۔ قرآن میں یہ اسلوب بہت استعمال ہوا ہے کہ جب ایک چیز بیان ہوتی ہے تو بالعموم اس کے ضد کا بھی اس کے ساتھ ذکر ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں بھی انفاق کے ذکر کے ساتھ سود کی حرمت کا ذکر ہوا ہے۔ بس فرق یہ ہے کہ بقرہ میں سود کی حرمت کا ذکر انفاق کے بعد ہے، اور اس سورہ میں انفاق سے پہلے۔ ان دونوں اسلوبوں کے الگ الگ فوائد ہیں، لیکن اس مسئلے پر بحث کے لیے یہ مقام موزوں نہیں۔ یہاں نظمِ کلام کی وضاحت کے لیے بس اتنی بات یاد رکھیے کہ انفاق کے حکم سے پہلے سود سے روکنے کی بات بالکل ایسی ہی ہے جس طرح سچ بولنے کی ہدایت سے پہلے جھوٹ سے باز رہنے کی تاکید کی جائے۔ سود اور انفاق کے تعلق پر سورہ بقرہ کی تفسیر میں ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس موقع پر ایک نظر اس پر بھی ڈال لیجیے۔ اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمائیے۔

آیات ۱۳۰-۱۳۶

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۱۳۰﴾ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْٓ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۱۳۲﴾ وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۱۳۳﴾ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۳۴﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۡ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۡ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۳۵﴾ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُهُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ﴿۱۳۶﴾

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ﴿۱۳۷﴾ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَ
هُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ﴿۱۳۸﴾ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ
الْأَعْلَوْنَ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۱۳۹﴾ إِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ
مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهٗ ؕ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ
النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ﴿۱۴۰﴾ وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ اٰمَنُوا
وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ﴿۱۴۱﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا
يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جٰهَدُوا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ ﴿۱۴۲﴾
وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ
رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ﴿۱۴۳﴾ ع ۱۴ / ۵

ترجمہ آیات ۱۳۰-۱۳۲

اے ایمان والو! سود نہ کھاؤ دگنا چوگنا بڑھتا ہؤا۔ اللہ سے ڈرو تاکہ تم فلاح پاؤ اور اس آگ سے ڈرو جو کافروں کے لیے تیار ہے۔ اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ ۱۳۰-۱۳۲

اور اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کے لیے مسابقت کرو جس کا عرض آسمانوں اور زمین کے عرض کی طرح ہے یہ پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے۔ ان لوگوں کے لیے جو کشادگی اور تنگی ہر حال میں خرچ کرتے رہتے ہیں، غصہ کو ضبط کرنے والے اور لوگوں سے درگزر کرنے والے ہیں اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ یہ لوگ جب کسی کھلی برائی

کا ارتکاب یا اپنی جان پر کوئی ظلم کر بیٹھتے ہیں تو اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور اللہ کے سوا کون ہے جو گناہوں کو بخشے۔ اور یہ جانتے بوجھتے اپنے کیے پر اصرار نہیں کرتے۔ یہ لوگ ہیں کہ ان کا بدلہ ان کے رب کی طرف سے مغفرت اور ایسے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور کیا ہی خوب صلہ ہے کارگزاروں کے لیے! تم سے پہلے بہت سی مثالیں گزر چکی ہیں تو زمین میں چلو پھرو اور دیکھو کہ جھٹلانے والوں کا کیا انجام ہوا ہے۔ یہ تنبیہ ہے لوگوں کے لیے اور ہدایت و نصیحت ہے ڈرنے والوں کے لیے۔ ۱۳۳-۱۳۸

اور پست ہمت نہ ہو اور غم نہ کرو، اگر تم مومن ہو تو تمھی غالب رہو گے۔ اگر تمھیں کوئی چوٹ پہنچے تو اس سے پست ہمت نہ ہو آخر دشمن کو بھی تو اسی طرح کی چوٹ پہنچی ہے۔ یہ ایام اسی طرح ہم لوگوں کے اندر الٹ پھیر کرتے رہتے ہیں، تاکہ اللہ تمھارا امتحان کرے اور ممیز کر دے ایمان والوں کو، اور تم میں سے کچھ لوگوں کو شہید بنائے اور اللہ ظالموں کو دوست نہیں رکھتا۔ اور تاکہ اللہ مومنوں کو چھانٹ کر الگ کر دے اور کافروں کو مٹا دے۔ کیا تم نے گمان کر رکھا ہے کہ تم جنّت میں جا داخل ہو گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممیّز نہیں کیا جنھوں نے جہاد کیا اور تاکہ ممیز کرے ثابت قدم رہنے والوں کو۔ اور تم موت کی تمنّا کر رہے تھے اس سے ملنے سے پہلے سو اب تم نے اس کو دیکھ لیا، آنکھیں چار کر کے۔ ۱۳۹-۱۴۳

۳۲۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَ

اتَّقُوا النَّارَ الَّتِیٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ ۝ وَاَطِیْعُوا اللّٰہَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّکُمْ تُرْحَمُوْنَ (۱۳۰-۱۳۲)

لفظ رِبٰوا کی تحقیق اور اس سے متعلق دوسرے بعض اہم سوالات پر سورۂ بقرہ میں بحث گزر چکی ہے۔

اضعافاً مضاعفۃ کی قید کا مقصد

یہاں اس کے ساتھ اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی جو قید لگی ہوئی ہے اس سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اسلام میں ممنوع صرف سود در سود ہے، بلکہ یہ قید، جیسا کہ ہم سورۂ بقرہ میں لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا کے تحت متعدد مثالوں سے واضح کر چکے ہیں، محض صورتِ حال کی تصویر اور اس کے گھنونے پن کے اظہار کے لیے ہے، جس طرح لَا تُکْرِھُوْا فَتَیٰتِکُمْ عَلَی الْبِغَآءِ اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا (اپنی لونڈیوں کو زنا پر مجبور نہ کرو اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہیں) میں اِنْ اَرَدْنَ تَحَصُّنًا کی شرط سے مقصود یہ نہیں ہے کہ اگر وہ قیدِ نکاح میں نہ آنا چاہیں تو ان کو پیشہ کرنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے، بلکہ مقصود اس سے صرف حال کی تصویر اور اس کے نفرت انگیز ہونے کا اظہار ہے۔ اسی طرح آیت زیر بحث میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی قید ہے۔

سودخوری کے میدان میں مسابقت کے بجائے انفاق میں مسابقت کی دعوت

یہاں اس قید کے نمایاں کرنے میں بلاغت کا ایک نکتہ بھی ہے۔ اوپر ہم ظاہر کر چکے ہیں کہ یہاں اصل مضمون جو بیان ہو رہا ہے وہ جہاد کے سلسلہ سے انفاق کا ہے۔ اس کی تمہید کے طور پر یہ سود خواری کی ممانعت کا ذکر ہوا ہے اس لیے کہ یہ انفاق کا ضد ہے۔ انفاق کا ذکر یہاں جس نوعیت سے ہوا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس راہ میں مسابقت یعنی ایک دوسرے کے مقابل میں بڑھنے، بازی لے جانے اور میدان مارنے کی دعوت دی گئی ہے۔ گویا اہلِ ایمان کے لیے مقابلہ و مسابقت کا میدان اگر ہے تو یہ ہے۔ چنانچہ اس مضمون کی تمہید سَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ الایہ (اور مسابقت کرو اپنے رب کی رحمت اور ایسی جنت ...) ہے۔ یہ مضمون اس بات کا مقتضی ہوا کہ اس میدانِ مسابقت کی دعوت دینے سے پہلے لوگوں کو اس میدان سے موڑا جائے جس میں یہودی ساہوکار اور مہاجن اب تک ایک دوسرے پر سبقت کرنے کے لیے سود کی بازی لگائے ہوئے تھے اور ان کی دیکھا دیکھی عربوں کو بھی اس کا چسکا لگ رہا تھا۔ عربی زبان کا جن لوگوں کو کچھ ذوق ہے وہ اندازہ کر سکیں گے کہ سود خوری کے میدان میں اس مسابقت کا اظہار اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ اگر یہ الفاظ نہ ہوتے تو یہ حقیقت پوری طرح سامنے نہ آتی۔ قرآن نے یہ چاہا ہے کہ لوگ اس ناپاک میدان میں اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً کی غلاظت کا انبار جمع کرنے کے بجائے اس جنت کے لیے بازیاں لگائیں جس کی پہنائی آسمان و زمین کے برابر ہے۔

وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِیٓ اُعِدَّتْ لِلْکٰفِرِیْنَ کا ٹکڑا اس سیاق میں اس بات کی نہایت واضح دلیل ہے کہ اس تنبیہ کے بعد بھی جو لوگ سود خوری پر مصر رہیں گے وہ کافر ہیں اور ان کے لیے دوزخ کی آگ تیار ہے۔ اس نکتہ پر ہم سورہ بقرہ میں بحث کر چکے ہیں۔ درحقیقت ایسے لوگ اپنی آگ کے لیے اَضْعَافًا مُّضٰعَفَۃً ایندھن خود فراہم کر چھوڑتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ ایک حقیقت ہے کہ ان کی آگ بالکل تیار ہے۔

وَسَارِعُوْٓا اِلٰی مَغْفِرَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَجَنَّۃٍ عَرْضُھَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِیْنَ ۝

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ (۱۳۴)

جنت کی وسعت کی ایک تمثیل

یعنی سود کے ذریعہ سے اگر بہت تیر مارو گے تو ایک کا دس یا بیس یا سو یا ہزار بنا لو گے اور اس کا نفع بہرحال اسی زندگی تک محدود رہے گا۔ آخرت میں یہ سارا اندوختہ تمہارے جلانے کے لیے ایندھن بنے گا۔ برعکس اس کے اگر اپنا مال خدا کی راہ میں خرچ کرو گے تو اس کے بدلے میں خدا کی مغفرت کے حق دار اور اس کے نتیجے میں ایسی وسیع جنت کے وارث ٹھہرو گے جس کی وسعت کے آگے تمام آسمانوں اور پوری زمین کی وسعت گرد ہو کے رہ جائے گی۔ پھر ایک بند گلی کی ایک محدود تنگ نائے کے لیے دوڑ دھوپ کرنے کے بجائے ابدی زندگی کی یہ ناپیدا کنار بادشاہی حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کیوں نہ کرو۔ یہی مضمون سورہ حدید میں اس طرح آیا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ (۲۰-۲۱)

جان رکھو کہ یہ دنیا کی زندگی ـــــ لہو و لعب، زینت، باہمی تفاخر، مال و اولاد کی کثرت میں ایک دوسرے کا مقابلہ ـــــ اس کی تمثیل اس بارش کی ہے جس کی اگائی ہوئی نباتات کسانوں کے دل موہ لیں۔ پھر وہ خشک ہو کر رہ جائیں پھر تو دیکھے ان کو زرد، پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور آخرت میں سخت عذاب بھی ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور خوشنودی بھی ہے اور یہ دنیا کی زندگی محض دھوکے کی ٹٹی ہے۔ مسابقت کرو اپنے رب کی مغفرت اور ایک ایسی جنت کی طرف جس کا عرض آسمان و زمین کی طرح ہے یہ ان لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر پختہ ایمان رکھتے ہیں۔ یہ اللہ کا فضل ہے، وہ دے گا جس کو چاہے گا اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

جنت کی وسعت کی یہ تمثیل بھی بہرحال ایک تمثیل ہی ہے جس سے انسان اس کی وسعت کا بس ایک دھندلا سا تصور کر سکتا ہے۔ اصل حقیقت اس کی وسعت کی کیا ہے یہ صرف اللہ ہی کو معلوم ہے لیکن اس وسعت کے باوجود انسان اگر چاہے تو خدا کی راہ میں انفاق کر کے اس کو خرید سکتا ہے۔

الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ (الآیہ) میں اس انفاق کی بعض وہ خصوصیات بیان کر دی گئی ہیں جن کے اہتمام کے بغیر نہ تو انفاق کا حق ادا ہوتا ہے اور نہ اس انفاق کو احسان کا درجہ حاصل ہوتا ہے ـــــ ان خصوصیات پر ہم سورۂ بقرہ کی تفسیر میں تفصیل کے ساتھ بحث کر چکے ہیں۔ اس سلسلے میں غصہ کو دبانے اور لوگوں سے درگزر کرنے کی جو تاکید ہے اس کا خاص پہلو ہے۔ اس کی توجیہ آیات ۲۶۲ - ۲۶۵ بقرہ کے تحت ملاحظہ فرمائیے۔

وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۠ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ (۱۳۵-۱۳۶)

انفاق کی راہ کی ایک مزاحمت

یہ راہ انفاق کی ایک نہایت اہم مزاحمت کا بیان ہے جس طرح سود خوری کی علت روپے کی ایسی تونس پیدا کر دیتی ہے کہ آدمی کے لیے کسی اچھے کام میں خرچ کرنا پہاڑ ہو جاتا ہے اسی طرح بدکاری اور عیاشی کی چاٹ بھی کسی نیکی کے کام میں خرچ کرنے کی راہ بند کر دیتی ہے۔ جو لوگ اس راہ پر چل پڑتے ہیں وہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں اس طرح بے بس ہو جاتے ہیں کہ ان کو کسی اور طرف نگاہ کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ اس وجہ سے قرآن نے انفاق کی تعلیم کے سلسلے میں جہاں سود خوری سے روکا ہے وہیں بدکاری بے حیائی اور اس کے لازمی نتیجہ اسراف و تبذیر سے بھی روکا ہے۔ بقرہ کی آیت ۲۶۸ کے تحت ہم اس پر بحث کر آئے ہیں۔ مزید بحث اس پر بنی اسرائیل کی آیات ۲۶-۲۷ کے تحت آئے گی۔

فرمایا کہ اس انفاق کی راہ میں وہی لوگ بڑھ سکیں گے جو بدکاری و عیاشی کی لت سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ سکیں گے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے اپنے گناہوں پر اصرار کیے چلے جائیں گے وہ اپنے اوپر اس سعادت کے دروازے بند کر لیں گے۔ سعادت کی راہ یہ ہے کہ آدمی اگر غلبۂ جذبات سے کسی بڑے یا چھوٹے گناہ کا ارتکاب کر بیٹھے تو خدا کی یاد اس کو چوکنا کر دے اور وہ فوراً اس سے معافی مانگے۔ خدا کے سوا کوئی نہیں ہے جو معافی دے سکے۔ جو لوگ دوسروں کی سفارش کی امید پر گناہوں کو اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے ہیں، وہ صرف اپنی شامتِ اعمال سے دوچار ہوں گے۔

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ ۙ فَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ۝ ھٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَھُدًى وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِيْنَ (۱۳۷-۱۳۸)

سنن کا مفہوم

'سنن' سے مراد اللہ تعالیٰ کے وہ ضابطے اور قاعدے ہیں جن کے تحت وہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ تعالیٰ کے احکام و ہدایات کی تعمیل اور اس کے بھیجے ہوئے رسولوں کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو برومند اور کامیاب کرتا ہے۔ برعکس اس کے اگر کوئی قوم خدا کے احکام و قوانین کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دیتا ہے۔ اس سنت کے مظاہر خدا کی زمین میں بے شمار ہیں۔ سرزمینِ عرب میں بھی، جس کے بسنے والے اس آیت میں مخاطب ہیں، اللہ تعالیٰ کی اس سنت کے مظاہر عاد، ثمود، اہلِ مدین، قوم لوط وغیرہ کے آثار کی شکل میں موجود تھے۔ عدلِ الٰہی کے انھی مظاہر کو یہاں "سنن" کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ اس مفہوم میں بار بار استعمال ہوا ہے۔ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِيْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلُ (۳۸-احزاب) (یہ اللہ کی سنت رہی ہے گزشتہ قوموں میں) فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا سُنَّتَ الْاَوَّلِيْنَ (۴۳-فاطر) (یہ لوگ نہیں منتظر ہیں مگر اس بات کے کہ ان کے لیے بھی اللہ کی وہی

سنت ظاہر ہو جائے جو اگلوں کے لیے ظاہر ہوئی)

سود خوری کی ممانعت اور اللہ کی راہ میں انفاق کی دعوت کے بعد یہ دو آیتیں تنبیہ و تہدید کی نوعیت کی ہیں۔ ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں کہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن پیشِ نظر خاص طور پر وہ لوگ ہیں جو یا تو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوئے تھے یا صریح نفاق میں مبتلا تھے۔ فرمایا کہ جو لوگ اللہ کے رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں ان کے انجام کا اندازہ کرنے کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمھارے اپنے ہی ملک میں کافی سامانِ عبرت موجود ہے۔ یہ واضح تنبیہ ہم نے نازل کر دی ہے اس میں ان لوگوں کے لیے ہدایت و نصیحت کا پورا سامان موجود ہے جن کے اندر خدا کا خوف ہے۔

وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ إِن يَمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِينَ ۝ وَلِيُمَحِّصَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكَافِرِينَ (۱۳۹-۱۴۱)

'وہن' کا مفہوم

'وہن' کے معنی ضعف کے ہیں۔ عام اس سے کہ یہ ضعفِ عمل کا ہو یا ارادے کا، جسم کا ہو یا کردار و اخلاق کا۔ ایک حدیث میں ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ صحابہؓ سے فرمایا کہ ایک زمانہ آئے گا کہ تم سیلاب کے خس و خاشاک کے مانند ہو جاؤ گے۔ صحابہؓ نے پوچھا، یا رسول اللہ! اس کا کیا سبب ہوگا؟ آپ نے فرمایا تمھارے اندر 'وہن' پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے پوچھا، یا رسول اللہ! 'وہن' کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا۔ حب الدنیا وکراھۃ الموت 'دنیا کی محبت اور موت کا ڈر'۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عزم و حوصلہ اور عمل و ارادہ کی وہ پستی جو دنیا اور دنیا کی زندگی کی محبت اور موت کے خوف سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو راہِ حق میں جہاد سے روکتی ہے وہ 'وہن' ہے۔ یہ حدیث اس لفظ کی بہترین تشریح ہے۔ یہاں بھی 'لَا تَهِنُوا' سے یہی مراد ہے کہ احد میں جو افتاد تمھیں پیش آئی ہے اس سے مرعوب اور خوفزدہ ہو کر ہمت نہ ہار بیٹھو۔ گویا پوری بات یوں ہے لَا تَهِنُوا مِمَّا أَصَابَكُمْ وَلَا تَحْزَنُوا عَلَى مَا فَاتَكُمْ 'نہ اس شکست کے سبب سے جو تمھیں پیش آئی ہے حوصلہ ہارو اور نہ اس نقصان کا جو تمھیں پہنچا غم کرو۔

'القوم' سے مراد

'القوم' کا لفظ اس سیاق و سباق میں جب آتا ہے تو اس سے مراد حریف مقابل اور دشمن ہوتا ہے۔ یہاں اشارہ کفارِ قریش کی طرف ہے۔

'الایام' سے مراد

'الایام' جب اس طرح جمع کی شکل میں آتا ہے تو اس سے مراد تاریخ کے وہ دن ہوتے ہیں جن میں بڑے بڑے واقعات و حوادث پیش آئے ہوں۔ ایام العرب سے مراد اہل عرب کی جنگیں ہیں۔ قرآن میں ہے وَذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ یعنی دنیا میں قوموں پر اللہ کی رحمت اور اس کے عذاب کے جو بڑے بڑے واقعات پیش آئے ہیں ان کے ذریعہ سے لوگوں کو یاد دہانی کرو۔ آیت زیرِ بحث میں بھی اس

حقیقت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس طرح کے فتح و شکست کے جو واقعات پیش آتے ہیں، یہ ہر قوم کو پیش آتے ہیں اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت اور اس کے قانونِ آزمائش کے تحت پیش آتے ہیں۔

معطوف علیہ

وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ الآیہ کا معطوف علیہ یہاں مذکور نہیں ہے۔ ہم اس کتاب میں ایک سے زیادہ مقامات میں ذکر کر چکے ہیں کہ جب اس طرح حرف عطف آئے تو اس کا معطوف علیہ محذوف ہوتا ہے اور وہ قرینہ سے معین ہوتا ہے۔ ہمارے نزدیک اس سے پہلے لِيُبَتَلِيَكُمْ محذوف ہے۔ ہم نے ترجمہ میں اس کو کھول دیا ہے۔

معطوف علیہ کے

'شہداء' سے مراد

وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ میں شہدا سے مراد اللہ کی راہ میں شہادت کا درجہ حاصل کرنے والے ہیں۔ ان لوگوں کو شہید کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس امت پر شہادت علی الناس کی جو ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈالی گئی ہے اس کا حق یہ جان دے کر کرتے ہیں۔ اس وجہ سے یہ مستحق ٹھہرے کہ ان کو شہید کے لقب سے ملقب کیا جائے۔ یہ گویا لفظ کا استعمال اس کے حقیقی مصداق کے لیے ہے۔ اس ٹکڑے سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں شہادت کا مرتبہ ایسا عالی مرتبہ ہے اور اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمانوں کے اندر اس کی طلب اتنی شدید تھی کہ اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں گوئے مسابقت لے جانے والوں کے شوق و جذبہ کی تسکین کے لیے مواقع فراہم فرمائے۔ چنانچہ اُحد میں جو افتاد پیش آئی اس میں جہاں دوسری حکمتیں اور مصلحتیں تھیں وہاں ایک حکمت یہ بھی تھی کہ جن کے لیے یہ منصبِ عالی مقدر ہے وہ اس موقع پر اس سے سرفراز ہو جائیں۔

'تمحیص' کا مفہوم

وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا الآیہ میں تمحیص کے معنی کسی چیز کو میل کچیل اور کھوٹ سے بالکل پاک صاف کر دینا ہے۔ مَحَّصَ الذَّهَبَ بِالنَّارِ کے معنی ہوں گے سونے کو غل و غش اور کھوٹ سے پاک صاف کر دیا۔

الفاظ کی تحقیق کے بعد اب ان آیات کے مطالب ترتیب کے ساتھ ہم پیش کرتے ہیں:

احد کی شکست سے کمزور قسم کے لوگوں پر جو دل شکستگی طاری ہوئی اس نے بہت سے ذہنوں میں یہ خیال بھی پیدا کر دیا کہ اسلام کے لیے فتح و غلبہ کی جو بشارتیں سنائی جاتی رہی ہیں وہ سب بس یوں ہی پادر ہوا باتیں تھیں۔ مقصود ان سے محض اپنی ہوا باندھنا اور لوگوں کو اپنے مقصد کے لیے استعمال کرنا تھا۔ اب ساری حقیقت کھل گئی۔ منافقین اور مخالفین نے موقع غنیمت پا کر اس خیال کو خوب ہوا دی تاکہ مسلمانوں کو اسلام کے مستقبل کی طرف سے بالکل مایوس کر دیں۔ قرآن نے یہاں اس پروپیگنڈے کا رد کیا اور مسلمانوں کو اطمینان دلایا کہ اُحد کے حادثہ سے دل شکستہ اور پست ہمت نہ ہو۔ حق و باطل کی اس کشمکش میں غالب اور سربلند، جیسا کہ اللہ نے فرمایا ہے، تمھی رہو گے بشرطیکہ تم سچے اور پکے مومن بن جاؤ۔

اس کے بعد فرمایا کہ اگر تمھیں کوئی نقصان پہنچ جائے جیسا کہ جنگ احد میں پہنچ گیا تو یہ کوئی مایوس ہو جانے کی بات نہیں ہے۔ تمھارے دشمنوں کو بھی خود اسی جنگ میں اور اس سے پہلے بدر میں کافی چوٹ

پہنچ چکی ہے۔ فتح و شکست کے یہ ردوبدل جو ہوتے ہیں خدا کی حکمت کے تحت اور اس کے حکم سے ہوتے ہیں، ان سے یہ نتیجہ نکال لینا جائز نہیں ہے کہ خدا کی سنت میں کوئی تبدیلی ہو گئی ہے اور اب وہ نیکوں کے بجائے بدوں کو ہی پیار کرنے لگا ہے بلکہ اس سے مقصود لوگوں کو جانچنا پرکھنا اور ان کی صلاحیتوں کو ابھارنا ہوتا ہے۔ اسی سے سچے اور کچے، مخلص اور منافق میں امتیاز ہوتا ہے اور حق کے لیے جان کی بازی کھیلنے والے شہدا کو اپنے جوہر دکھانے کا موقع نصیب ہوتا ہے۔

توحید سے مقصود کفر کو مٹانا ہے

پھر فرمایا کہ یہ نہ خیال کرو کہ احد میں اگر قریش کو فتح ہو گئی تو اللہ تعالیٰ اب اہلِ ایمان کے بجائے ان ظالموں ہی سے محبت کرنے لگا ہے بلکہ درحقیقت یہ بھی اہلِ کفر کو مٹانے ہی کی ایک تدبیر ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو امتحان کی بھٹی سے گزار کر یہ چاہتا ہے کہ ان کے اندر سے ہر قسم کا کھوٹ نکال کر ان کو بالکل زرِ خالص بنا دے اور کفر و اہلِ کفر سے ان کو چھانٹ کر بالکل الگ کر دے۔ اس علیحدگی کے بعد اہلِ ایمان اس زنجیر سے بالکل آزاد ہو جائیں گے جو ان کی ترقی میں مزاحم ہے اور ساتھ ہی پھر اہلِ کفر کا مٹ جانا بھی قطعی ہے، کیونکہ اس دنیا میں باطل صرف اسی وقت تک باقی رہ سکتا ہے جب تک اس کو کچھ حق کا سہارا حاصل رہے۔ اگر حق کا سہارا اس سے بالکل ہی چھن جائے تو اس کا نابود ہو جانا یقینی ہو جاتا ہے۔ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے بالحق پیدا کیا ہے، اس وجہ سے کسی باطل مجرد کی پرورش اس کے مزاج کے بالکل خلاف ہے۔ تمحیص کے ذکر کے بعد یَمْحَقَ الْکٰفِرِیْنَ سے اسی فلسفہ کی طرف اشارہ مقصود ہے۔ نبی اور اس کے ساتھیوں کی ہجرت کے بعد اہلِ کفر پر جو عذاب آتا ہے اس میں بھی یہی رمز ہے۔ تفصیل اس کی سورۂ برأت میں آئے گی۔

اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ مِنْ قَبْلِ اَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَاَيْتُمُوْهُ وَاَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ (۱۴۲-۱۴۳)

'علم یعلم' کے مختلف معانی پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بحث کر چکے ہیں۔ یہاں قرینہ دلیل ہے کہ یہ ممیز کرنے اور چھانٹ کر الگ کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ کے بعد اس کا مقابل جملہ اَلَّذِيْنَ لَمْ يُجَاهِدُوْا! عربیت کے معروف اسلوب کے مطابق حذف کر دیا گیا ہے وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ میں يَعْلَمَ کے فتحہ کے بارے میں لوگوں نے مختلف توجیہیں پیش کی ہیں لیکن ہمارے نزدیک اس کا عطف اوپر وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا پر ہے۔ وہاں چونکہ کلام قانون ابتلا کی دوسری حکمتوں کے بیان کی طرف مڑ گیا تھا اس وجہ سے صبر کے ذکر کو مضمونِ جہاد سے وابستہ کر دیا لیکن اس کے فتحہ سے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ آزمائش کر کے اللہ تعالیٰ جن لوگوں کو چھانٹنا چاہتا ہے ان میں صابرین بھی ہیں۔

راہِ حق میں آزمائشیں ناگزیر ہیں

احد کی شکست سے جو لوگ بددل ہوئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمھارا یہ گمان تھا کہ حق کی راہ خطرات اور آزمائشوں سے خالی ہے اور تم اسلام کا دعویٰ کر کے ایک ٹھنڈی سڑک سے سیدھے سیدھے جنت میں جا براجو گے تو تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ خدا کی جنت میں کوئی شخص اس وقت تک داخل

نہیں ہو سکتا جب تک امتحان سے یہ تعین نہ ہو جائے کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کا ولولہ رکھتا ہے یا نہیں اور حق کے لیے آزمائشوں کی تاب لا سکتا ہے یا نہیں۔ چنانچہ اسی چیز کی جانچ کے لیے تمھیں یہ احد کی آزمائش پیش آئی۔ اب تک تمھاری طرف سے جہاد کے لیے بڑے جوش و خروش کا اظہار ہوتا رہا ہے۔ لیکن اس کی نوعیت صرف زبانی جمع خرچ کی تھی۔ ضرورت تھی کہ سچے اور جھوٹے، عاشق صادق اور بوالہوس کے درمیان امتیاز کے لیے کوئی ایسا موقع پیش آئے جب موت سے روبرو ہو کر تمھیں لڑنا پڑے۔ چنانچہ یہ موقع اللہ نے تمھیں دکھا دیا اور تمھارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کی ایک کسوٹی سامنے آگئی۔ یہ بات یہاں یاد رکھنے کی ہے کہ جو لوگ دل کے کمزور تھے بالعموم وہ زبان سے شوقِ جہاد کا اظہار زیادہ کرتے تھے تاکہ ان کی کمزوری پر پردہ پڑا رہے۔ سورۂ نساء میں انھی لوگوں کی طرف اشارہ ہے۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ قِيْلَ لَهُمْ كُفُّوْٓا اَيْدِيَكُمْ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ اِذَا فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ اَوْ اَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوْا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَآ اَخَّرْتَنَآ اِلٰٓى اَجَلٍ قَرِيْبٍ (۷۷) کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جن سے کہا جاتا تھا کہ ابھی اپنے ہاتھ روکے رکھو اور نماز کا اہتمام کرو اور زکوٰۃ دیتے رہو۔ پھر جب ان پر جنگ فرض کر دی گئی تو ان میں سے ایک گروہ لوگوں سے اس طرح ڈرتا ہے جس طرح خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہتا ہے کہ اے رب تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی، کچھ دن اور مہلت کیوں نہ دی؟

۳۳۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۴۴-۱۴۸

آگے کی آیات میں پہلے یہ غلط فہمی دور فرمائی کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کوئی مافوق البشر ہستی نہیں ہیں، وہ اللہ کے رسولوں میں سے ایک رسول ہیں جس طرح بہت سے رسول گزر چکے ہیں اس طرح ایک دن ان کو بھی بہرحال وفات پانا ہے اور اس کا بھی امکان ہے کہ وہ شہید کر دیے جائیں لیکن اللہ کے دین کو ہمیشہ باقی رہنا ہے تو اس دین کے ساتھ آدمی کی وابستگی اس مفروضہ پر مبنی نہیں ہونی چاہیے کہ آپ اس دنیا میں ہمیشہ رہنے کے لیے آئے ہیں۔ اس غلط فہمی کی اصلاح اس لیے ضروری تھی کہ اگر اس قسم کا کوئی وہم دلوں میں چھپا ہوا رہتا تو آپ کی وفات پر سب کے دل بیٹھ جاتے اور منافقین و معاندین، اسلام کی مخالفت میں اس سے بڑا فائدہ اٹھا سکتے۔ چنانچہ جوں ہی اس غلط فہمی کی موجودگی کے کچھ آثار نمایاں ہوئے قرآن نے اس کی اصلاح فرما دی۔ روایات میں آتا ہے کہ غزوۂ احد میں جب مسلمانوں کو شکست ہو گئی تو یہ خبر بھی مشہور ہو گئی کہ خود سرورِ عالم بھی شہید ہو گئے۔ اس اندوہناک خبر نے بہت سے مسلمانوں کے حوصلے پست کر دیے۔ انھوں نے خیال کیا کہ جب حضورؐ ہی شہید ہو گئے تو اب بھلا کیا ہو سکتا ہے۔ اگرچہ ذی ہوش لوگوں نے یہ کہہ کر حالات کو سنبھالا کہ جب حضورؐ شہید ہو گئے تو ہمارے زندہ رہنے سے کیا حاصل، ہمیں بھی اسی مقصدِ حق کے لیے شہید ہو جانا چاہیے

جس کے لیے حضورؐ شہید ہوئے، تاہم مسلمانوں کے اندر یہ ایک ایسی کمزوری نمایاں ہوئی تھی جس کی وقت اصلاح خود قرآن کی زبان سے ضروری تھی تاکہ آئندہ کے لیے فتنوں کا سدِ باب ہو جائے۔

اس کے بعد پچھلے انبیا اور ان کے جاں نثار صحابہ کا ذکر بطور مثال کیا ہے کہ انھیں بھی اللہ کی راہ میں جہاد کرنا پڑا، اور اس راہ میں انھیں تکلیفیں اور مصیبتیں بھی پہنچیں لیکن وہ دل شکستہ نہ ہوئے تو پھر تم کو اگر شکست ہوئی یا تمھارے پیغمبر کو کوئی تکلیف پہنچی تو تم کیوں دل شکستہ ہوتے ہو تم بھی انھی کی روش اختیار کرو جب کہ اسی کام کے لیے اٹھے ہو جس کے لیے وہ اٹھے تھے۔ اس روشنی میں آگے کی آیات تلاوت فرمائیے۔ ارشاد ہے۔

آیات ۱۴۴-۱۴۸

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَا۟ىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۴ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۭ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۭ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝۱۴۵ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝۱۴۶ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝۱۴۷ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۴۸ ع ۱۵/۶

ترجمۂ آیات ۱۴۴-۱۴۸

محمد تو بس ایک رسول ہیں۔ ان سے پہلے بھی رسول گزر چکے ہیں تو کیا اگر وہ وفات پا گئے یا قتل کر دیے گئے تو تم پیٹھ پیچھے پھر جاؤ گے۔ جو پیٹھ پیچھے پھر جائے گا وہ اللہ کا

کچھ نہیں بگاڑے گا اور اللہ شکر گزاروں کو صلہ عطا فرمائے گا۔ ۱۴۴

اور کوئی جان مر نہیں سکتی مگر اللہ کے حکم سے ایک مقررہ نوشتہ کے مطابق۔ جو دنیا کا صلہ چاہتے ہیں ہم انھیں دنیا میں سے دیتے ہیں اور جو اجرِ آخرت کے طالب ہیں ہم انھیں اس میں سے دیں گے اور ہم شکر گزاروں کو بھرپور صلہ دیں گے۔ ۱۴۵

اور کتنے انبیا گزرے ہیں جن کے ساتھ ہوکر بہت سے اللہ والوں نے جنگ کی تو وہ ان مصیبتوں کے سبب سے جو انھیں خدا کی راہ میں پہنچیں نہ تو پست ہمت ہوئے نہ انھوں نے کمزوری دکھائی اور نہ دشمنوں کے آگے گھٹنے ٹیکے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ ان کی دعا تو ہمیشہ بس یہ رہی کہ اے رب ہمارے گناہوں اور ہمارے معاملے میں ہماری بے اعتدالیوں کو بخش دے، ہمارے قدم جمائے رکھ اور کافروں کے مقابل میں ہماری مدد فرما۔ تو اللہ نے ان کو دنیا کا صلہ بھی عطا فرمایا، اور آخرت کے اچھے اجر سے بھی نوازا اور اللہ خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔ ۱۴۶-۱۴۸

۳۴- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۭ اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ ۭ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰي عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَـيْـــًٔـا ۭ وَسَيَجْزِي اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۴)

'عقب' کے معنی ایڑی کے ہیں اِنْقَلَبَ عَلٰی عَقِبَیْهِ پیٹھ پیچھے پھرنے کی تعبیر ہے یہاں اس سے مراد اسلام کو چھوڑ کر پھر جاہلیت کی طرف مڑ جانا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں بہت سے رسول گزرے ہیں اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم بھی اللہ کے ایک رسول ہیں۔ جس طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں دوسرے رسولوں کو پیش آئیں اسی طرح کی آزمائشیں اور مصیبتیں انہیں بھی پیش آسکتی ہیں۔ جس طرح تمام رسولوں کو موت کے مرحلے سے گزرنا پڑا انہیں بھی ایک دن وفات پانا ہے۔ ان کے رسول ہونے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ یہ وفات نہیں پائیں گے یا

قتل نہیں ہو سکتے یا کسی مصیبت یا ہزیمت کا ابتلا انھیں پیش نہیں آسکتا۔ اگر کسی نے اس غلط فہمی کے ساتھ اسلام قبول کیا تھا اور اب اُحد کے حادثے کے بعد کسی تذبذب میں مبتلا ہو گیا ہے اور وہ از سرِ نو جاہلیت کی زندگی کی طرف پلٹ جانا چاہتا ہے تو پلٹ جائے وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا بلکہ اپنی ہی دنیا اور آخرت برباد کرے گا۔ جو لوگ اسلام کو دیکھ کر بھی جاہلیت اور اسلام کے فرق کو سمجھ نہ سکے اور اسلام کے قدردان نہ بنے اللہ کو ان کی کچھ پروا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے انعامات کا حق دار ان کو سمجھتا ہے جو اسلام کی نعمت پانے پر اپنے رب کے شکر گزار ہیں، جاہلیت کی طرف بازگشت کا ان کے ذہن میں خیال بھی نہیں گزرتا۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ (۱۴۵)

'كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا' اس طرح کی ترکیب ہے جس طرح وعد اللہ یا صنع اللہ الذی اتقن وغیرہ ہے۔

منافقین کی دو خاص کمزوریاں

اس آیت میں کمزور اور منافق قسم کے لوگوں کی دو کمزوریوں کی نشان دہی کی ہے۔

ایک یہ کہ یہ اس بات پر عقیدہ نہیں رکھتے کہ ہر شخص کی موت کے لیے ایک نوشتۂ الٰہی ہے، جب تک اس نوشتہ کی مقررہ مدت پوری نہیں ہو گی اس وقت تک کسی کی موت نہیں آسکتی، اسی طرح جب نوشتہ پورا ہو جائے گا تو کسی کی موت ایک منٹ کے لیے ٹل بھی نہیں سکتی۔ اس وجہ سے خدا کے مقرر کردہ فرائض سے فرار کے بجائے آدمی کے لیے صحیح رویہ یہ ہے کہ وہ عزم و حزم کے ساتھ اپنا فرض ادا کرے اور موت کے معاملے میں اطمینان رکھے کہ اس کا وقت بھی خدا کے ہاں لکھا ہوا ہے اور اس کی شکل بھی متعین ہے۔

دوسری کمزوری یہ ہے کہ یہ اپنے دنیوی مفادات کو تمام تر اپنی سعی و تدبیر ہی پر منحصر سمجھتے ہیں اور یہ اندیشہ رکھتے ہیں کہ اگر آخرت کے پیچھے زیادہ پڑے تو دنیا سے یک قلم محروم ہو جائیں گے۔ حالانکہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ خدا دنیا کے طالبوں کو دنیا میں سے اتنا ہی حصہ دیتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے اور وہ آخرت کے اجر سے بالکل ہی محروم رہتے ہیں۔ برعکس اس کے جو آخرت کے طلبگار ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو آخرت کے انعامات سے بھی نوازتا ہے اور دنیا میں سے بھی ان کو اتنا دیتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے۔ اس وجہ سے صحیح رویہ یہ نہیں ہے کہ آدمی آخرت کو چھوڑ کر صرف دنیا کا بندہ بن کر رہ جائے بلکہ یہ ہے کہ آخرت کا طالب بنے اور دنیا میں سے اللہ تعالیٰ جو کچھ بخشے اس پر قناعت کرے۔ آگے کی آیت میں اس مضمون کی وضاحت آرہی ہے۔

وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ میں قرینہ دلیل ہے کہ فعل اپنے کامل معنی میں استعمال ہوا ہے اور شاکرین سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ تعالیٰ کی اس عظیم نعمت کے دل سے قدردان ہیں جو انہیں آخری اور کامل ہدایت کی صورت میں ملی ہے۔ فرمایا کہ ہم انھیں اس قدردانی کا بھرپور صلہ دیں گے۔ رہے وہ لوگ جو اس روشنی کو دیکھ کر بھی ظلمت ہی کے طالب ہیں وہ تاریکی ہی میں بھٹکنے کے لیے چھوڑ دیئے جائیں گے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ (۱۴۶ - ۱۴۸)

'وہن، ضعف اور استکانت' کا مفہوم

'رِبّی' اور 'وَہن' کے الفاظ پر پیچھے بحث گزر چکی ہے۔ وہن، ضعف اور استکانت کے الفاظ اگرچہ اظہار کمزوری کے مفہوم کے لیے کچھ مشترک سے ہیں لیکن ان تینوں میں ایک نازک سا فرق بھی ہے۔ موت سے خوف اور زندگی کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے، یہ وہن ہے۔ اس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل پیدا ہوتا ہے وہ ضعف ہے۔ اس ضعف سے حریف کے آگے گھٹنے ٹیک دینے کا جو نتیجہ ظہور میں آتا ہے وہ استکانت ہے۔

انبیاء اور ان کے صحابہ کی ایک سنت

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں گزر چکی ہیں کہ اللہ کے نبیوں نے جہاد کیا ہے اور اس جہاد میں اللہ کے بہت سے نیک بندوں نے ان کا ساتھ دیا ہے اور انھیں اس راہ میں مصیبتوں اور ہزیمتوں سے بھی سابقہ پیش آیا ہے لیکن اس چیز کا اثر ان پر یہ نہیں پڑا کہ وہ ہمت ہار جائیں، تھڑدلاپن دکھائیں یا دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دیں بلکہ انھوں نے راہِ حق میں استقامت دکھائی اور اللہ ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔

یہ اشارہ ہے ان جنگوں کی طرف جو حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان علیہم السلام اور بعض دوسرے انبیا کو لڑنی پڑیں۔ حضرت سموئیلؑ کے زمانے کی ایک جنگ کا، جو غزوۂ بدر سے مشابہ تھی، ذکر سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکا ہے۔ مقصود اس اشارے سے ان لوگوں کو جو اُحد کی شکست سے بددل ہو رہے تھے اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ نہ تو نبی اور اس کے صحابہؓ کے لیے جنگ کا پیش آنا کوئی انوکھی بات ہے اور نہ مصائب و شدائد سے ان کا گزرنا کوئی نیا حادثہ ہے۔ یہ انبیا کی ایک سنت اور خدا کے قانونِ ابتلا کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو نبی ہوتا ہے وہ اور اس کے ساتھی امتحان سے گزرے بغیر ہی منزل پر جا پہنچتے ہیں۔ اللہ کو محبوب تو صرف وہی لوگ ہیں جو اس کی راہ میں استقامت دکھائیں نہ کہ ہر مدعی دینداری۔ پھر جھوٹے اور سچے میں امتیاز آخر اس امتحان کے بغیر کیسے ہوگا؟

وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا الآیہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ انھیں جب مصیبتیں اور آزمائشیں پیش آئیں تو انھوں نے اس طرح کی باتیں نہیں بنائیں جس طرح کی باتیں آج کمزور قسم کے مسلمان اور منافق لوگ بنا کر پیغمبرؐ کے خلاف طرح طرح کے شبہات دلوں میں پیدا کر رہے ہیں، بلکہ جو افتاد انھیں پیش آئی اس کو انھوں نے خدا اور رسول کی طرف منسوب کرنے کے بجائے خود اپنی کمزوری اور اپنے تجاوز پر محمول کیا اور اللہ تعالیٰ سے اپنے قصوروں کی معافی مانگی۔ اس کا صلہ ان کو یہ ملا کہ دنیا میں بھی خدا نے ان کو اقتدار

اور حکومت سے سرفراز فرمایا اور آخرت میں بھی ان کے لیے نہایت اعلیٰ صلہ و انعام موجود ہے۔ آخر میں فرمایا کہ یہی لوگ ہیں جو مرتبۂ احسان پر فائز ہیں اور اللہ ایسے ہی خوب کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

۳۵۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۴۹-۱۵۵

آگے بھی انھی کمزوریوں پر تبصرہ ہے جو جنگِ احد اور اس کی شکست سے ابھر کر سامنے آئی تھیں۔ قرآن نے ان میں سے ایک ایک کو لے کر ان کے باطن کو نمایاں کیا ہے، ان کی اصلاح کی تدبیریں بتائی ہیں اور اس آزمائش سے مسلمانوں کی تربیت و تطہیر کے جو مصالح پورے ہوئے ہیں ان کی طرف اشارے فرمائے ہیں۔

آیات ۱۴۹-۱۵۵

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ
عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ
وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ سَنُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا
الرُّعْبَ بِمَآ اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا
وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ
اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَ
تَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ
مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ثُمَّ
صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ
عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۵۲﴾ اِذْ تُصْعِدُوْنَ وَلَا تَلْوٗنَ عَلٰٓى اَحَدٍ وَّ
الرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ فِيْٓ اُخْرٰىكُمْ فَاَثَابَكُمْ غَمًّۢا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا
تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۵۳﴾ ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا

يَغْشٰى طَآئِفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَآئِفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ
بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ
مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ
لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ
قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ
اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ
مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۱۵۴ اِنَّ الَّذِيْنَ
تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ ۙ اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ
بِبَعْضِ مَا كَسَبُوْا ۚ وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝۱۵۵ ع ۱۴

ترجمۂ آیات ۱۴۹-۱۵۵

اے ایمان والو، اگر تم کافروں کی بات مانو گے تو یہ تمھیں پلٹے پیچھے لوٹا کے رہیں گے اور تم نامراد ہو کے رہ جاؤ گے۔ تمھارا مولیٰ تو اللہ ہے اور وہ بہترین مددگار ہے۔ ہم ان کافروں کے دلوں میں تمھارا رعب ڈال دیں گے کیونکہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہرا رکھا ہے جن کے حق میں خدا نے کوئی دلیل نہیں اتاری۔ ان کا ٹھکانا جہنم ہوگا اور اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والوں کا کیا ہی برا ٹھکانا ہے۔ ۱۴۹-۱۵۱

اور اللہ نے تو تم سے جو وعدہ کیا وہ سچ کر دکھایا جب کہ تم ان کو اللہ کے حکم سے تہ تیغ کر رہے تھے یہاں تک کہ جب تم خود ڈھیلے پڑ گئے اور حکم میں تم نے اختلاف کیا اور رسول کی نافرمانی کی جب کہ اللہ نے تمھیں وہ چیز دکھا دی تھی جس کے تم تمنائی تھے۔ تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے اور کچھ آخرت کے۔ پھر خدا نے تمھارا رُخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھیں آزمائش میں

ڈالے اور اللہ مسلمانوں پر فضل فرمانے والا ہے۔ یاد کرو، جب کہ تم منہ اُٹھائے بھاگے جا رہے تھے اور کسی کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھتے تھے اور خدا کا رسول تم کو تمہارے پیچھے سے پکار رہا تھا تو خدا نے تم کو غم پر غم پہنچایا تاکہ تم دلِ شکستہ نہ ہُوا کرو، نہ کسی نقصان پر اور نہ کسی مصیبت پر۔ اور اللہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کی خبر رکھنے والا ہے۔ ۱۵۲-۱۵۳

پھر خدا نے تم پر غم کے بعد اطمینان نازل فرمایا یعنی نیند جو آکر تم میں سے ایک گروہ کو چھا لیتی ہے اور ایک گروہ کو اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ یہ خدا کے بارے میں خلافِ حقیقت زمانہ جاہلیت کے قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہے۔ یہ کہتے رہے کہ بھلا ہمیں ان معاملات میں کیا دخل؟ کہہ دو سارا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ وہ اپنے دلوں میں وہ کچھ چھپائے ہوئے ہیں جو تم پر ظاہر نہیں کرتے۔ وہ دل میں کہتے ہیں کہ اگر اس امر میں کچھ ہمارا بھی دخل ہوتا تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ کہہ دو اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے جب بھی جن کا قتل ہونا مقدر تھا وہ اپنی قتل گاہوں تک پہنچ کے رہتے۔ یہ اس لیے ہُوا کہ اللہ تم میں امتیاز کرے، جو کچھ تمہارے سینوں میں ہے اس کو پرکھے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اس کو صاف کرے اور اللہ سینوں کے بھیدوں سے خوب واقف ہے۔ دونوں گروہوں کی مڈبھیڑ کے دن جو لوگ تم میں سے پھر گئے ان کو شیطان نے ان کی بعض کرتوتوں کے سبب سے پھسلا دیا۔ اللہ نے ان سے درگزر فرمایا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۵۴-۱۵۵

۳۶۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تُطِيْعُوا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَرُدُّوْكُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوْا خٰسِرِيْنَ ۝ بَلِ اللّٰهُ مَوْلٰىكُمْ ۚ وَهُوَ خَيْرُ النّٰصِرِيْنَ (۱۴۹-۱۵۰)

احد کی شکست کے بعد کفار اور یہود نے یہ چاہا کہ بدر کی فتح کے اثرات کو یک قلم مٹا کے رکھ دیں گے

کفار اور منافقین کا پروپیگنڈا

چنانچہ انھوں نے اپنے منظم پروپیگنڈے سے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تمھارا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ محمدؐ خدا کے کوئی فرستادہ ہیں اور ان کو خدا اور فرشتوں کی مدد حاصل ہے۔ اگر یہ بات ہوتی تو تم اُحد میں شکست کیوں کھاتے؟ بدر میں تم نے فتح حاصل کی، اُحد میں ہم فتحمند رہے۔ یہ تدبیر اور وسائل کا کھیل ہے۔ اس کو خدا اور اس کے فرشتوں سے وابستہ کر دینا اور اپنے آپ کو خدا کی مدد کا اجارہ دار سمجھ بیٹھنا محض طفلانہ خام خیالی ہے۔

پروپیگنڈے کا جواب

کفار کا یہ پروپیگنڈا ان مسلمانوں پر اثر انداز ہوا جو کمزور قسم کے تھے۔ منافقین نے بھی اپنی دسوسہ اندازیوں سے اس کو تقویت پہنچائی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کہ اگر تم نے ان کفار کی باتوں کا اثر قبول کیا تو یہ تم کو پھر اسی جاہلیت کی تاریکی میں واپس لے جائیں گے جس سے نکال کر خدا تمھیں اسلام کی روشنی میں لایا ہے اور تمھاری کامیابی پھر نامرادی سے بدل جائے گی۔ تمھارے ولی و مرجع یہ کفار نہیں ہیں کہ تم اپنی مشکلات اور پریشانیوں میں ان سے رجوع کرو اور ان سے رہنمائی چاہو بلکہ تمھارا مرجع و مولیٰ اللہ ہے تم اس کی طرف رجوع کرو اور اس سے مدد چاہو، وہ بہترین مددگار ہے۔ اوپر لَا تَتَّخِذُوْا بِطَانَةً والی آیت میں بھی یہی مضمون گزر چکا ہے۔

سَنُلْقِیْ فِیْ قُلُوْبِ الَّذِیْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا اَشْرَكُوْا بِاللّٰهِ مَا لَمْ یُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا ۚ وَمَاْوٰىهُمُ النَّارُ ۭ وَبِئْسَ مَثْوَى الظّٰلِمِیْنَ (۱۵۱)

شرک کی کوئی بنیاد نہیں

یعنی اس وقت ذرا ان کا حوصلہ جو بڑھ گیا ہے تو یہ محض ایک وقتی اور عارضی نشہ ہے۔ اس کی کوئی پائیدار بنیاد نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ بہت جلد ان کے حوصلے پست کر دے گا اور ان کے دلوں میں اسلام اور مسلمانوں کا رعب ڈال دے گا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے ایسی چیزوں کو خدا کی خدائی میں شریک بنا رکھا ہے جن کی کوئی شہادت نہ تو عقل و فطرت کے اندر موجود ہے، نہ نظامِ کائنات میں اور نہ خدا کے اتارے ہوئے صحیفوں میں۔ ایسی وہمی چیزیں اول تو حقائق کے مقابلے میں کچھ سہارا نہیں دے سکتیں، دوسرے اتنے مختلف دیوتاؤں کے ساتھ ان کی وابستگی ان کے دل کو اس طرح منتشر اور پراگندہ کیے ہوئے ہے کہ ان کو وہ دل جمعی و یکسوئی کبھی حاصل ہی نہیں ہو سکتی جو تمام عزم اور حوصلے کی بنیاد ہے۔ آیت میں ظالمین سے مراد مشرکین ہیں۔ شرک کو ظلم سے تعبیر کرنے کے وجوہ پر ہم دوسری جگہ بحث کر چکے ہیں۔ از انجملہ یہ بات بھی ہے کہ شرک درحقیقت انسان کا خود اپنے نفس پر بہت بڑا ظلم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تمام مخلوقات سے اشرف بنایا ہے۔ اس شرف کا احساس ہی ہے جس کے اندر اس کی تمام قوت و عظمت کا راز مضمر ہے۔ انسان جب اپنے سے فروتر مخلوق کو اپنا رزاق و حاکم مان کر اس کی پرستش کرنے لگتا ہے تو گویا وہ شاہین ہو کر کنجشکِ فرومایہ کی غلامی اختیار کر لیتا ہے اور اس طرح نہ صرف اپنی شاہینی کھو دیتا ہے بلکہ کنجشک سے بھی زیادہ حقیر و فرومایہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کی سورتوں میں آئے گی۔

وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ ۚ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ
مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ
لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۵۲)

'تحس یحس' کا مفہوم

'حسّ یحسّ' کے معنی دشمن کو اس طرح قتل کرنے کے ہیں کہ اس کو بالکل پامال اور اس کا استیصال کر دیا جائے۔ 'باذنہ' کا مفہوم یہ ہے کہ یہ شاندار نتیجہ صرف تمھاری تدبیر اور تمھاری قوت کا کرشمہ نہیں تھا بلکہ اللہ تعالیٰ کی قدرت و مشیت کا کرشمہ تھا۔

'فشل' کا مفہوم

'فشل' کے معنی سست پڑ جانے، ڈھیلے پڑ جانے اور کمزوری دکھانے کے ہیں۔

'تنازع فی الامر' کا مفہوم

'تنازع فی الامر' 'تنازع فی الحدیث' سے نکلا ہوا محاورہ ہے۔ 'تنازع فی الحدیث' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک بات میں کوئی شخص کچھ رائے دے، دوسرا کچھ رائے دے۔ اسی طرح 'تنازع فی الامر' کا مطلب اس موقع پر یہ ہے کہ نبی نے جو حکم دیا اس کی تعمیل میں کسی نے کچھ موقف لیا، کسی نے دوسرا موقف لیا۔

'ما تحبون' کا مفہوم

'مَا تُحِبُّوْنَ' میں اشارہ فتح کی تمنا کی طرف ہے۔ قرآن نے بعض جگہ اس ابہام کو کھول بھی دیا ہے، مثلاً سورۂ صف میں ہے۔ 'وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ۭ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ' (اور دوسری ایک اور چیز بھی جس کو تم محبوب رکھتے ہو، یعنی اللہ کی مدد اور جلد حاصل ہونے والی فتح)

احد میں شکست کی وجہ

اب یہ اس پروپیگنڈے کی تردید ہو رہی ہے جو کفار و منافقین نے پھیلانا شروع کیا تھا — کہ مسلمان خواہ مخواہ کو اس خبط میں مبتلا ہیں کہ خدا اور اس کے فرشتے ان کی مدد کرتے ہیں۔ اگر مدد کرتے ہیں تو یہ مدد اُحد میں کہاں چلی گئی؟ اوپر آیت ۱۴۹ کے تحت ہم اشارہ کر چکے ہیں کہ کمزور قسم کے مسلمان اس پروپیگنڈے سے مسموم ہوئے۔ اس فتنہ سے مسلمانوں کو بچانے کے لیے قرآن نے آگاہ فرمایا کہ جہاں تک اللہ تعالیٰ کے وعدۂ نصرت کے پورے ہونے کا تعلق ہے وہ تو اُحد میں بھی پورا ہوا، اس لیے کہ شروع شروع میں تم نے کفار کو خوب تہ تیغ کیا، یہاں تک کہ وہ پسپا ہو گئے اور فتح بالکل تمھارے سامنے تھی لیکن قبل اس کے کہ تم دشمن کو اچھی طرح کچل کے اس کو ہتھیار ڈال دینے پر مجبور کر دیتے، تم ڈھیلے پڑ گئے۔ رسول نے پشت کے درّے کی حفاظت پر جن لوگوں کو اس قطعی ہدایت کے ساتھ مامور کیا تھا کہ وہ کسی حال میں بھی اس کو نہ چھوڑیں، انھوں نے رسول کے حکم کے منشا کے تعین میں اختلاف کیا اور ان کی اکثریت یہ سوچ کر کہ اب تو فتح سامنے ہے، رسول کے حکم کے خلاف مالِ غنیمت حاصل کرنے میں مصروف ہو گئی۔ تم میں کچھ لوگ دنیا کے طالب تھے اور کچھ لوگ آخرت کے۔ اسلام کی صفوں میں ایسے لوگوں کا موجود ہونا، جو دنیا کی خاطر رسول کے حکم کو نظر انداز کر دیں، اللہ تعالیٰ کو پسند نہیں ہے اس وجہ سے اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ تمھیں امتحان میں ڈالے تاکہ جو لوگ دنیا کے طالب ہیں وہ تم سے چھٹ کر الگ ہو جائیں۔ چنانچہ اس نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا اور تمھاری فتح شکست سے بدل گئی۔

خدا کا وعدۂ نصرت مشروط ہے

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ کا وعدۂ نصرت غیر مشروط نہیں ہے کہ وہ جو رویہ بھی چاہیں اختیار کریں لیکن خدا کی نصرت ہر حال میں ان کے ہمرکاب ہی رہے بلکہ یہ مشروط ہے اس شرط کے ساتھ کہ مسلمان ادائے فرض میں ڈھیلے نہ پڑیں، اطاعتِ امر میں اختلاف نہ کریں، خدا اور رسول کی نافرمانی نہ کریں، آخرت کو چھوڑ کر دنیا کے طالب نہ بنیں۔

اگر اس طرح کی کوئی چیز ان کے اندر پائی جاتی ہے تو بھی اللہ تعالیٰ یہ نہیں کرتا کہ ان پر اپنا غضب نازل کر دے بلکہ ان کو ایسی آزمائشوں میں مبتلا کرتا ہے جن سے ان کی یہ کمزوریاں دور ہوں اور وہ زیادہ سے زیادہ خدا کی تائید و نصرت کے سزاوار بن سکیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے عفو و درگزر اور اس کے فضل و عنایت ہی کی ایک شکل ہوئی۔ چنانچہ آیت کے آخر میں اس عفو اور فضل کی طرف بھی اشارہ فرما دیا۔

غزوہ احد کے متعلق یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اس امر پر تمام اربابِ سیر متفق ہیں کہ اس جنگ میں مسلمانوں کا ابتدائی حملہ بہت کامیاب رہا۔ انھوں نے دشمن پر غلبہ پا لیا تھا لیکن ایک دستہ جو ایک اہم درّے کی حفاظت پر مامور تھا اور جس کو حضورؐ کی طرف سے ہدایت تھی کہ وہ کسی حال میں بھی اپنی جگہ کو نہ چھوڑے قبل از وقت اپنی جگہ چھوڑ کر مالِ غنیمت سمیٹنے میں مصروف ہو گیا۔ صرف تھوڑے سے آدمی اس دستے کے اپنی جگہ پر قائم رہے۔ اس چیز سے دشمن کے ایک دستہ نے فائدہ اٹھایا اور کاوا لگا کر اس نے پشت سے مسلمانوں پر حملہ کر دیا اور یہ حملہ ایسا اچانک اور کامیاب ہوا کہ مسلمان اوسان کھو بیٹھے۔ آیت میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ (۱۵۳)

'اصعاد' کا مفہوم

'اصعاد' کے اصل معنی کسی چڑھائی کی سمت میں جانے کے ہیں اسی سے 'اصعد فی العداء' کا محاورہ نکلا جس کے معنی کسی سمت میں منہ اٹھائے بھاگ کھڑے ہونے کے ہیں۔

'غَمًّا بِغَمٍّ' کا مفہوم

غَمًّا بِغَمٍّ میں 'ب' تلبس کے مفہوم میں ہے یعنی ایک غم تو شکست کا تھا ہی اس کے ساتھ لپٹا ہوا ایک اور غم بھی سامنے آ گیا۔ ہمارے نزدیک اس غم سے مراد وہ غم ہے جو اس دوران میں مسلمانوں کو کفار کی اڑائی ہوئی اس افواہ سے پہنچا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم بھی شہید کر دیے گئے۔ اس افواہ کا ذکر تاریخ اور سیرت کی کتابوں میں بھی ہے اور قرآن کی اس آیت سے بھی اس کا اشارہ نکلتا ہے اس لیے کہ فرمایا ہے کہ تم اس طرح بگ ٹٹ بھاگے چلے جا رہے تھے کہ تمھیں اپنے دہنے بائیں کا بھی ہوش نہیں رہا تھا کہ تم ذرا مڑ کے دیکھ سکتے کہ کون ہے اور کیا کہہ رہا ہے، یہاں تک کہ اس رسول کی طرف بھی تم نے توجہ نہیں کی جو تمھارے پیچھے سے تمھیں برابر پکارتا رہا کہ اللہ کے بندو، میری طرف آؤ۔ اس کے بعد 'فَ' کے ساتھ، جو عربی میں نتیجہ کے بیان کے لیے آتی ہے، اس غم کا ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ یہ غم پیغمبر کی ذات ہی سے

متعلق ہوگا تاکہ پیغمبرؐ کی جو ناقدری ان سے صادر ہوئی ہے اس پر ان کو تنبیہ کی جائے۔

آیت ۱۵۳ کا نظام

اس آیت کے نظام کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اوپر والی آیت پر پھر ایک نظر ڈال لیجیے۔ اوپر فرمایا تھا کہ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ یعنی خدا نے تمھاری فلاں فلاں غلطیوں اور نافرمانیوں کی وجہ سے تمھیں پسپا کر دیا تاکہ تمھیں ابتلا میں ڈالے۔ اس کے بعد یہ واضح فرما دیا کہ یہ ابتلا میں ڈالنا اس لیے ہوا کہ خدا نے تم کو تمھاری غلطی پر سزا دینے کے بجائے یہ پسند فرمایا کہ تمھیں معاف کرے اور تم پر اپنا فضل فرمائے۔ اس کے بعد اِذْ تُصْعِدُوْنَ سے لے کر فَاَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ تک اس ابتلا کی تفصیل ہے۔ پھر لِكَيْلَا تَحْزَنُوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَآ اَصَابَكُمْ میں اس ابتلا کا وہ فائدہ مذکور ہوا ہے جو اہلِ ایمان کو حاصل ہو سکتا ہے اگر وہ اس کا حق ادا کریں۔

ابتلا کا مقصد

یہ امر محتاجِ بیان نہیں ہے کہ ابتلا خدا کا عذاب نہیں ہے بلکہ اس کی رحمت ہے۔ عذاب کفار پر آتا ہے اور ابتلا میں اہلِ ایمان مبتلا کیے جاتے ہیں۔ عذاب کا مقصد کفار کو مٹانا ہوتا ہے اور ابتلا کا مقصد اہلِ ایمان کو عقلی و اخلاقی کمزوریوں سے پاک کرنا۔ ایک موت ہے دوسرا زندگی۔ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی قوم کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس وقت تک وہ اس کے جرموں پر اس طرح کی سزا نہیں دیتا جس طرح کی سزا مجرموں اور باغیوں کو دی جاتی ہے بلکہ مختلف آزمائشوں اور امتحانوں کے ذریعہ سے اس کے اندر پیدا ہونے والی بیماریوں کو وہ دور فرماتا رہتا ہے۔ ہلاکت کے حوالہ وہ کسی قوم کو اسی وقت کرتا ہے جب وہ زندگی کے اصلی اوصاف سے بالکل خالی ہو جاتی ہے۔

احد کے ابتلا میں ازالۂ غم کے پہلو

رہا یہ سوال کہ احد کے اس ابتلا میں حزن سے بچانے والی کیا بات تھی تو اس کو سمجھنے کے لیے سب سے پہلے تو یہ بات یاد رکھیے کہ یہاں حزن سے مراد وہ عام رنج و غم نہیں ہے جو کسی موقع کے ضائع ہو جانے یا کوئی نقصان پہنچ جانے پر فطرتاً ہو جایا کرتا ہے بلکہ اس سے مراد وہ مایوسی اور دل شکستگی ہے جو انسان کے عزم و حوصلہ کو ختم کر کے رکھ دیتی ہے۔ اوپر آیت ۱۳۹ لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا میں اسی حزن سے منع فرمایا ہے۔ یہ مایوسی اور دل شکستگی پیدا کرنے والے متعدد اسباب اس وقت موجود تھے جو اصلاح و علاج کے محتاج تھے۔ مثلاً یہ کہ مسلمانوں میں ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس غلط فہمی میں مبتلا تھا کہ جو شخص نبی ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو لازماً ہر مہم میں کامیابی ہی حاصل ہونی چاہیئے، ان کے لیے شکست ان کے نزدیک ان کے تمام دعوے کو مشتبہ کر دینے کے مترادف تھی، اسی طرح ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو اس وہم میں مبتلا تھا کہ جب ہم مسلمان ہیں اور پیغمبرؐ کا ساتھ ہم نے دیا ہے تو ہمیں اپنی غلطیوں کے خمیازے سے بالاتر ہونا چاہیئے، کچھ ایسے لوگ بھی تھے جن کا سارا اعتماد اپنی رائے اور اپنی تدبیروں پر ہی تھا، ان پر یہ حقیقت واضح نہیں تھی کہ اس دنیا میں تدبیر ہی کارفرما نہیں ہے بلکہ اصلی کارفرما تقدیر ہے۔ ایک گروہ ایسے لوگوں کا بھی تھا جو خدا کے بارے میں اس طرح کی بدگمانیوں میں مبتلا تھے جو زمانۂ جاہلیت کی باقیات میں

سے تھیں، ان تمام گروہوں کی طرف آگے کی آیات میں اشارات آرہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب اتنی ساری غلط فہمیاں اور خام خیالیاں مسلمانوں میں موجود تھیں تو ان کے ہوتے ہوئے ناممکن تھا کہ وہ ان حالات و مشکلات کا مقابلہ کر سکتے جن سے وہ ہر قدم پر دوچار تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس غزوۂ اُحد کے ابتلا کے ذریعہ سے مسلمانوں کو ان بہت سی خام خیالیوں سے پاک کر دیا جن سے نازک اوقات میں ان کے عزم و حوصلے کو تزلزل پیش آسکتا تھا۔ ان مضامین کو کھولنے والی جو آیتیں خود اس سورہ میں ہیں وہ بعض اوپر گزر چکی ہیں اور بعض آگے آرہی ہیں۔ البتہ سورۂ حدید کی ایک آیت ہم یہاں نقل کرتے ہیں، اس سے ایک نہایت اہم گوشے پر روشنی پڑتی ہے۔ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَي اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ (۲۲-۲۳) تمھیں جو مالی یا جانی تکلیف بھی پہنچتی ہے وہ ہم نے وجود میں لانے سے پہلے ایک کتاب میں لکھ رکھی ہے، یہ اللہ کے لیے ایک معمولی بات ہے، تاکہ تم غم نہ کرو اگر کوئی موقع تم سے کھو جائے اور نہ اترا ؤ اس چیز پر جو اس نے تم کو بخشی ہے۔ اللہ اکڑنے والے اور فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔

ثُمَّ اَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ الْغَمِّ اَمَنَةً نُّعَاسًا يَّغْشٰى طَاۗىِٕفَةً مِّنْكُمْ ۙ وَطَاۗىِٕفَةٌ قَدْ اَهَمَّتْهُمْ اَنْفُسُهُمْ يَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۭ يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَيْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ يُخْفُوْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ مَّا لَا يُبْدُوْنَ لَكَ ۭ يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ الْاَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هٰهُنَا ۭ قُلْ لَّوْ كُنْتُمْ فِيْ بُيُوْتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِيْنَ كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ اِلٰى مَضَاجِعِهِمْ ۚ وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ مَا فِيْ صُدُوْرِكُمْ وَلِيُمَحِّصَ مَا فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ (۱۵۴)

'امنۃ' کا مفہوم

'امنۃ' کے معنی راحت، سکون اور اطمینان کے ہیں۔ نعاس اونگھ اور نیند کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ بدلیت کے طریقے پر امنۃ کی گویا وضاحت ہے۔ نیند، اطمینان و راحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی شہادت بھی۔ جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اڑ جایا کرتی ہے اور ایسے شخص کے لیے کوئی کام عزم و حوصلہ اور استقلال و عزیمت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دورانِ جنگ میں فوج کے لیے سونے کا موقع ملنا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ پچھلی نیند کی اسی اہمیت کی وجہ سے دشمن فوج کے حوصلے کو پست کرنے والی تدابیر میں سے ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقع نہ دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا بڑا ہی فضل ہوتا ہے اگر کسی فوج کو اس کا موقع ملے، اور وہ اس سے فائدہ بھی اٹھا سکے کیونکہ اس سے فائدہ اٹھا سکنا صرف موقع ملنے ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی و قلبی صلاحیت پر بھی ہے۔ غزوہ بدر سے متعلق سورۂ انفال میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر جو احسانات گنائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ جنگ سے پہلے والی

جنگی نقطۂ نظر سے نیند کی اہمیت

رات میں خوب سوئے اور اس طرح صبح کو لڑنے کے لیے خوب چاق و چوبند ہو گئے۔ یہاں آیت زیر بحث میں فرمایا ہے کہ ایک گروہ تو آرام سے سویا لیکن ایک دوسرے گروہ کو برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی۔ اگرچہ دشمن واپس جا چکا تھا لیکن وہ اپنے خوف اور بزدلی کے سبب سے یہی سمجھتے رہے کہ ابھی وہ سر ہی پر کھڑا ہے۔

یَغْشٰی طَآئِفَةً میں حال کا صیغہ صورتِ حال کی تصویر کے لیے ہے یَظُنُّوْنَ بِاللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ میں ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ غیر الحق کی وضاحت ہے اور مقصود اس وضاحت سے ان کے خیال کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنا ہے کہ باوجودیکہ یہ لوگ مسلمان بنے پھرتے ہیں لیکن اب تک خدا کی صفات اور انسانی زندگی سے اس کے تعلق کے باب میں ان کے خیالات و تصورات وہی ہیں جو زمانۂ جاہلیت کی تاریکی میں تھے يَقُوْلُوْنَ لَوْ كَانَ لَنَا الآیہ ان کے ظن جاہلیت کی ایک مثال بھی ہے اور وہ اپنے دل میں جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا اظہار و بیان بھی۔

'ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ' کا مفہوم

حذف کی ایک مثال

وَلِيَبْتَلِيَ اللّٰهُ کا معطوف علیہ حذف ہے اور اس طرح کے مواقع میں نہ صرف یہ کہ معطوف علیہ محذوف ہوتا ہے بلکہ بسا اوقات وہ چیز بھی محذوف ہوتی ہے جس کی ان صیغوں کے ذریعے سے علت بیان ہوتی ہے۔ اس کی مثال سورۂ حدید کی اس آیت میں بھی ہے جس کا ہم نے اوپر حوالہ دیا ہے۔ اگر سیاق و سباق کی روشنی میں اس محذوف کو کھول دیا جائے تو پوری بات گویا یوں ہو گی کہ اگر تم اپنی ہی رائے پر عمل کرتے جب بھی تم، اگر تمھاری موت مقدر ہو چکی ہوتی، اپنے آپ کو موت سے نہ بچا سکتے بلکہ انھی مقامات میں پہنچ کر قتل ہوتے جن مقامات میں تمھارا قتل ہونا اللہ نے لکھ رکھا ہے۔ لیکن یہ رسول کے ہاتھوں اللہ نے اس لیے کرایا کہ تمھارے دلوں میں یہ حسرت کا ایک کانٹا بنے اور تمھارے دلوں میں جو کمزوریاں ہیں وہ ابھر کر سامنے آئیں۔

احد کے واقعات پر تبصرہ

یہ آیت بھی پوری کی پوری اُحد کی شکست سے ظاہر ہونے والے واقعات و حالات پر تبصرہ ہے۔ اور مقصود اس تبصرے سے جیسا کہ اوپر واضح ہوا، یہ دکھانا ہے کہ نبی اور اہل ایمان کے لیے اللہ کی نصرت کا وعدہ برحق ہے لیکن جماعت کے اندر جو کمزوریاں چھپی ہوئی تھیں ان کا علاج بھی ضروری تھا۔ فرمایا کہ احد کی شکست کے بعد تم میں ایک گروہ تو بے شک ایسے لوگوں کا رہا جو خدا اور رسول سے شاکی اور بدگمان نہیں ہوا۔ اس نے اپنا حوصلہ قائم رکھا۔ اس نے اس افتاد کو جو پیش آئی جماعت ہی کی بعض خامیوں کا نتیجہ سمجھا۔ اور خدا کے فیصلے پر راضی رہا۔ چنانچہ بددل و ہراساں ہونے کے بجائے وہ خدا پر بھروسہ کرتے ہوئے آنے والی شب میں اطمینان کے ساتھ سویا جو اس کی دل جمعی اور ایمانی مضبوطی کی ایک شہادت ہے۔ لیکن ساتھ ہی ایک دوسرا گروہ بھی تھا جسے برابر اپنی جانوں کی پڑی رہی، وہ خدا سے اس قسم کی بدگمانیوں میں مبتلا رہا جو ایمان و اسلام کے شایانِ شان نہیں بلکہ زمانۂ جاہلیت سے مناسبت رکھنے والی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ معاملات کے فیصلے کرنے میں پیغمبر استبداد اور خود رائی سے کام لیتے ہیں۔ ان کے مشوروں کی کوئی قدر نہیں کرتے۔ اگر ان

کی رائے مان لی جاتی اور مدینہ کے اندر محصور ہو کر جنگ کی جاتی تو یہ افسوسناک صورت پیش نہ آتی اور ہم یہاں اس ذلت کے ساتھ قتل نہ ہوتے۔ ان کی تردید میں فرمایا کہ تمہارا یہ خیال بالکل غلط ہے۔ اگر تم اپنے گھروں میں بند ہوتے جب بھی جس کو جہاں مرنا تھا وہیں مرتا۔ یہ امور تمہاری تدبیر کے تابع نہیں بلکہ خدا کی مقدر کی ہوئی تقدیر کے تابع ہیں۔ تمہارے اندر چونکہ یہ کمزوریاں موجود تھیں اس وجہ سے اللہ نے چاہا کہ ایسے حالات پیش آئیں کہ تمہاری کمزوریاں ظاہر ہوں، تمہارے دلوں کی جانچ ہو اور تمہارے کھوٹ باہر آئیں۔ اللہ دلوں کے امراض اور ان کے علاج سے اچھی طرح واقف ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ (۱۵۵)

اوپر آیت ۱۲۲ کے تحت گزر چکا ہے کہ منافقین کی شرارت خاص کر ابن اُبی کے حوصلہ شکن طرزِ عمل سے کچھ کمزور قسم کے مسلمان بھی متاثر ہوئے جن میں سے کچھ تو فوراً ہی سنبھل گئے لیکن بعض سے کمزوری صادر ہو گئی۔ ان لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اگرچہ معاف فرما دیا اس لیے کہ بعد میں ان میں سے ہر شخص کو خود اپنی غلطی کا احساس ہو گیا، لیکن ساتھ ہی یہ واضح فرما دیا کہ ان کی کچھ پچھلی غلطیاں تھیں جن کے سبب سے شیطان نے ان کو ٹھوکر کھلائی۔ گناہ سے گناہ جنم لیتا ہے اور شیطان کے داؤں انھی لوگوں پر زیادہ آسانی سے کارگر ہوتے ہیں جن کے اندر گناہ کی کوئی جڑ موجود ہوتی ہے۔ اس وجہ سے ضروری ہے کہ جب آدمی سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اس کو دل میں جگہ نہ پکڑنے دے بلکہ استغفار اور توبۂ نصوح کے ذریعہ سے اس کا استیصال کر دے، ورنہ اسی قسم کے لوگ ہوتے ہیں جو بڑی بڑی جماعتوں کے لیے وجہِ ابتلا بن جاتے ہیں۔ اوپر آیاتِ قرآن کی روشنی میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ احد کے معرکے میں مسلمانوں کو جو ابتلا پیش آیا وہ بعض گروہوں کی اسی طرح کی کمزوریوں کے نتیجہ میں پیش آیا۔

۳۷۔ آگے کا مضمون ـــــ آیات ۱۵۶-۱۸۹

جنگِ اُحد سے پیدا شدہ حالات و خیالات پر جو تبصرہ اوپر سے چلا آ رہا ہے اسی سلسلے کی کچھ مزید باتیں ارشاد ہو رہی ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ آیات
إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا ۱۵۶-۱۸۹
وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي

وَيُمِيتُ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١٥٦﴾ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ
اللّٰهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِمَّا يَجْمَعُونَ ﴿١٥٧﴾
وَلَئِنْ مُتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُونَ ﴿١٥٨﴾ فَبِمَا رَحْمَةٍ مِنَ
اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۖ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ
حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ
فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿١٥٩﴾
إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي
يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١٦٠﴾ وَمَا
كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ۚ
ثُمَّ تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦١﴾ أَفَمَنِ
اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَاءَ بِسَخَطٍ مِنَ اللّٰهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ
وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦٢﴾ هُمْ دَرَجَاتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌ بِمَا
يَعْمَلُونَ ﴿١٦٣﴾ لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ إِذْ بَعَثَ فِيهِمْ
رَسُولًا مِنْ أَنْفُسِهِمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَإِنْ كَانُوا مِنْ قَبْلُ لَفِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴿١٦٤﴾ النصف
أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُمْ مُصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُمْ مِثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ
قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ أَنْفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٦٥﴾
وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ

الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا
لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ
يَقُولُونَ بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا
يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾ الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا
مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ
صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِندَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ﴿١٦٩﴾ فَرِحِينَ بِمَا
آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا
بِهِم مِّنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١٧٠﴾ وقف لازم
يَسْتَبْشِرُونَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ وَأَنَّ اللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ
ع الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٧١﴾ الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِن بَعْدِ مَا
مع أَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿١٧٢﴾
الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ
فَزَادَهُمْ إِيمَانًا وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ الْوَكِيلُ ﴿١٧٣﴾
فَانقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ لَّمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ
وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَظِيمٍ ﴿١٧٤﴾ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ
الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ وَخَافُونِ إِن

كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿١٧٥﴾ وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ
إِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ أَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا
فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٦﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ
بِالْإِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيْمٌ ﴿١٧٧﴾ وَ
لَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا أَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّأَنْفُسِهِمْ ۗ
إِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْا إِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ﴿١٧٨﴾ مَا
كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰى مَا أَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ
مِنَ الطَّيِّبِ ۗ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ
يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۖ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَإِنْ
تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ أَجْرٌ عَظِيْمٌ ﴿١٧٩﴾ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۗ بَلْ هُوَ
شَرٌّ لَّهُمْ ۗ سَيُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ وَلِلّٰهِ
مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿١٨٠﴾ ع
لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا إِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّ
نَحْنُ أَغْنِيَآءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْأَنْۢبِيَآءَ وقف لازم
بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ﴿١٨١﴾ ذٰلِكَ بِمَا
قَدَّمَتْ أَيْدِيْكُمْ وَأَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿١٨٢﴾
اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا إِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ إِلَيْنَآ أَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى

يَأْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَأْكُلُهُ النَّارُ ۗ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ
قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۸۳﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ
جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ﴿۱۸۴﴾ كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ
الْمَوْتِ ۗ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ فَمَنْ زُحْزِحَ
عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۗ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ
اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ﴿۱۸۵﴾ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۗ وَلَتَسْمَعُنَّ
مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا
اَذًى كَثِيْرًا ۗ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿۱۸۶﴾
وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَتُبَيِّنُنَّهٗ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُوْنَهٗ فَنَبَذُوْهُ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ
ثَمَنًا قَلِيْلًا ۗ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ
يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا
تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۸۸﴾
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۸۹﴾ ع ۱۹/۱۰

ترجمہ آیات ۱۵۶-۱۸۹

اے ایمان والو! ان لوگوں کے مانند نہ بن جانا جنھوں نے کفر کیا اور جو اپنے بھائیوں کے بابت جبکہ وہ سفر یا جہاد میں نکلتے ہیں اور ان کو موت آجاتی ہے، کہتے ہیں کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے، نہ قتل ہوتے۔ یہ خیال ان کے اندر اس لیے پیدا

ہوا کہ اللہ اس کو ان کے دلوں میں باعثِ حسرت بنا دے۔ اللہ ہی ہے جو جلاتا اور مارتا ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو وہ خدا کی نگاہوں میں ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل ہو گے یا مرو گے تو وہ مغفرت اور رحمت جو تمہیں اللہ کی طرف سے حاصل ہو گی اس سے کہیں بہتر ہے جو یہ جمع کر رہے ہیں۔ اور تم مرو یا قتل ہو، بہر حال اللہ ہی کے پاس اکٹھے کیے جاؤ گے۔ ۱۵۶-۱۵۸

یہ اللہ ہی کا فضل ہے کہ تم ان کے لیے نرم خُو ہو۔ اگر تم درشت خُو اور سخت دل ہوتے تو تمہارے پاس سے یہ منتشر ہو جاتے، سو ان سے درگزر کرو، ان کے لیے مغفرت چاہو اور معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو، پس جب تم فیصلہ کر لو تو اللہ پر بھروسہ کرو۔ بے شک اللہ اپنے اوپر بھروسہ کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اگر اللہ تمہاری مدد فرمائے گا تو کوئی تم پر غالب نہیں ہو سکتا اور اگر وہ چھوڑ دے گا تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی کے اوپر چاہیئے کہ بھروسہ کریں اہلِ ایمان۔ ۱۵۹-۱۶۰

اور ایک نبی کی شان سے بعید ہے کہ وہ بدخواہی کرے اور جو کوئی بدخواہی کرے گا تو قیامت کے دن وہ اپنی بدخواہی سمیت پیش ہو گا۔ پھر ہر جان کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ ملے گا اور ان کے ساتھ کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ کیا وہ جو خدا کی خوشنودی کا طالب ہو، اس کے مانند ہو جائے گا جو خدا کا غضب لے کر لوٹا اور جس کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بُرا ٹھکانا ہے! خدا کے ہاں ان کے درجے الگ الگ ہوں گے یہ جو کچھ کر رہے ہیں خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔ ۱۶۱-۱۶۳

یہ اللہ نے مومنین پر احسان فرمایا ہے کہ ان میں انھی میں سے ایک رسول مبعوث فرمایا جو ان کو اس کی آیتیں سناتا ہے، ان کو پاک کرتا ہے اور ان کو شریعت اور حکمت

کی تعلیم دیتا ہے۔ بے شک یہ اس سے پہلے کھلی ہوئی گمراہی میں پڑے ہوئے تھے۔ ۱۶۴

اور کیا جب تمھیں ایک مصیبت پہنچی جس کی دونی مصیبت تم نے پہنچائی تو تم نے کہا کہ یہ کہاں سے آگئی؟ کہہ دو یہ تمھارے اپنے ہی پاس سے ہے۔ بے شک اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور دونوں جماعتوں کی مڈبھیڑ کے دن تمھیں جو مصیبت پہنچی یہ اللہ کے حکم سے پہنچی اور تاکہ اللہ ایمان والوں کو ممیز کردے اور ان منافقین کو بھی ممیز کردے جن سے کہا گیا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا دشمن کو دفع کرو انھوں نے کہا کہ اگر ہمیں اندازہ ہوتا کہ جنگ ہونی ہے تو ہم ضرور تمھارے ساتھ ہوتے۔ یہ لوگ اس دن ایمان کی بہ نسبت کفر سے زیادہ قریب تھے۔ یہ اپنے منہ سے وہ بات کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور اللہ اس چیز کو خوب جانتا ہے جس کو یہ چھپاتے ہیں۔ یہ ہیں جو خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں کی نسبت کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں نہ قتل ہوتے۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنی اس بات میں سچے ہو تو خود اپنے آپ سے موت کو دفع کرلو۔ اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے ہیں ان کو مردہ نہ خیال کرو۔ بلکہ وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں، انھیں روزی مل رہی ہے، فرحاں و شاداں ہیں اس پر جو اللہ نے اپنے فضل میں سے ان کو دے رکھا ہے اور ان لوگوں کے باب میں بشارت حاصل کر رہے ہیں جو ان کے اخلاف میں سے اب تک ان سے نہیں ملے ہیں کہ ان پر نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ وہ بشارت حاصل کر رہے ہیں اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کی اور اس بات کی کہ اللہ اہلِ ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرے گا۔ ان اہلِ ایمان کے اجر کو جنھوں نے چوٹ کھانے کے بعد بھی اللہ اور رسول کی پکار پر لبیک کہی۔ ان میں سے جنھوں نے بھی خوبی کے ساتھ کام کیے اور جو تقویٰ کی راہ چلے

ہیں ان کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ یہ وہ ہیں کہ جن کو لوگوں نے سنایا کہ دشمن نے تمھارے لیے بڑی طاقت اکٹھی کی ہے تو اس سے ڈرو تو اس چیز نے ان کے ایمان میں اور اضافہ کر دیا اور وہ بولے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ سو یہ لوگ اللہ کی نعمت اور اس کے فضل کے ساتھ واپس آئے، ان کو ذرا گزند نہ پہنچا، اور یہ اللہ کی خوشنودی کے طالب ہوئے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔ یہ شیطان ہے جو اپنے رفیقوں کے ڈراوے دے رہا ہے تو تم ان سے نہ ڈرو، مجھی سے ڈرو، اگر تم مومن ہو۔ ۱۶۵-۱۷۵

اور یہ لوگ تمھارے لیے باعثِ غم نہ بنیں جو کفر کی راہ میں سبقت کر رہے ہیں۔ یہ اللہ کو ہرگز کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ اللہ چاہتا ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے۔ ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔ بے شک جنھوں نے ایمان سے کفر کو بدلا وہ اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑیں گے اور ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اور جن لوگوں نے کفر کیا ہے یہ نہ گمان کریں کہ یہ جو ہم ان کو ڈھیل دے رہے ہیں تو یہ ان کے حق میں کوئی بہتر بات ہے، ہم تو بس اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ گناہ میں کچھ اور اضافہ کر لیں اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ۱۷۶-۱۷۸

اللہ یہ نہیں کر سکتا تھا کہ مسلمانوں کو، جس حال پر تم تھے اسی پر، خبیث کو طیب سے الگ کیے بغیر، چھوڑے رکھے اور نہ یہ کر سکتا تھا کہ وہ تمھیں سارے غیب سے باخبر کر دے بلکہ اللہ اس کام کے لیے اپنے رسولوں میں سے جس کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے تو اللہ پر اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ اور اگر تم ایمان لائے اور تم نے تقویٰ اختیار کیا تو تمھارے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ ۱۷۹

اور جو لوگ بخالت کرتے ہیں اس چیز میں جو اللہ ہی نے ان کو اپنے فضل میں سے بخشی ہے، یہ نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں بہتر ہے۔ بلکہ یہ ان کے حق میں بہت بُرا ہے۔ جس چیز میں وہ بخالت کریں گے اس کا قیامت کے دن ان کو طوق پہنایا جائے گا۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے آسمانوں اور زمین کی وراثت اور اللہ جو کچھ تم کر رہے ہو اس سے باخبر ہے۔ اللہ نے ان لوگوں کی بات سن رکھی ہے جنھوں نے کہا کہ اللہ محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ہم ان کی اس بات کو بھی لکھ رکھیں گے اور ساتھ ہی ان کے ناحق قتلِ انبیا کو بھی اور کہیں گے کہ اب چکھو عذاب آگ کا۔ یہ تمھارے اپنے ہی ہاتھوں کی کرتوت ہے، اللہ اپنے بندوں کے ساتھ ذرا بھی ناانصافی کرنے والا نہیں۔ ۱۸۰-۱۸۲

جنھوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں یہ ہدایت کر رکھی ہے کہ ہم اس وقت تک کسی رسول کی بات باور نہ کریں جب تک یہ وہ قربانی نہ پیش کرے جس کو کھانے کے لیے آگ اُترے، ان سے کہو کہ مجھ سے پہلے تمھارے پاس رسول کھلی کھلی نشانیاں اور وہ چیز بھی لے کر آئے جس کے لیے تم کہہ رہے ہو تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا، اگر تم سچے ہو؟ پس اگر یہ تمھاری تکذیب کرتے ہیں تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں، تم سے پہلے بھی رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو کھلی ہوئی نشانیاں، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے۔ ہر جان کو موت کا مزا چکھنا ہے اور تم پورا پورا اجر تو بس قیامت ہی کے دن پاؤ گے۔ پس جو دوزخ سے بچا یا گیا اور جنّت میں داخل کیا گیا وہ کامیاب رہا اور یہ دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سودا ہے۔ ۱۸۳-۱۸۵

تمھارے مال اور تمھاری جان میں تمھاری آزمائش ہونی ہے اور تمھیں ان لوگوں کی

طرف سے جن کو تم سے پہلے کتاب ملی اور ان لوگوں کی طرف سے جنھوں نے شرک کیا بہت سی تکلیف دہ باتیں سننی پڑیں گی۔ اور اگر تم ثابت قدم رہے اور تم نے تقویٰ کو ملحوظ رکھا تو بے شک یہ چیز عزیمت کے احوال میں سے ہے۔ ۱۸۶

اور یاد کرو جب کہ اللہ نے ان لوگوں سے عہد لیا جن کو کتاب دی گئی کہ تم لوگوں کے سامنے اس کتاب کو اچھی طرح ظاہر کرنا، اسے چھپانا مت تو انھوں نے اس کو پس پشت ڈال دیا اور اس کے بدلے میں ایک حقیر قیمت لے لی، کیا ہی بری ہے وہ چیز جسے وہ لے رہے ہیں۔ جو لوگ اپنی ان کرتوتوں پر مگن ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کاموں پر ان کو سراہا جائے جو انھوں نے کیے نہیں ان کو عذاب سے بری نہ سمجھو، ان کے لیے ایک دردناک عذاب ہے۔ اور اللہ ہی کے لیے آسمان و زمین کی بادشاہی ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ ۱۸۷-۱۸۹

۳۸- الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ اِذَا ضَرَبُوْا فِي الْاَرْضِ اَوْ كَانُوْا غُزًّى لَّوْ كَانُوْا عِنْدَنَا مَا مَاتُوْا وَمَا قُتِلُوْا ۚ لِيَجْعَلَ اللّٰهُ ذٰلِكَ حَسْرَةً فِيْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝ وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ۝ وَلَئِنْ مُّتُّمْ اَوْ قُتِلْتُمْ لَاِالَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ (۱۵۶-۱۵۸)

ل کا مفہوم

'وَقَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ' میں 'ل' اس طرح کا ہے جس طرح کا وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ اِلَيْهِ (اور جن لوگوں نے کفر کیا وہ ایمان لانے والوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ اگر یہ نئی دعوت کوئی خیر و برکت والی چیز ہوتی تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہیں کر سکتے تھے) میں ہے۔ یعنی بابت اور متعلق کے معنی میں۔ 'اخوان' سے مراد بھائی بند اور تعلق و رشتہ کے لوگ ہیں۔ 'غُزًّى' غازی کی جمع ہے۔ 'لِيَجْعَلَ' سے پہلے اس کا متعلق محذوف ہے۔ یعنی یہ بات جو ان کے ذہن میں گھسی ہوئی ہے یہ اس لیے گھسی ہوئی ہے کہ ان کی منافقت کی وجہ سے اللہ یہ چاہتا ہے کہ یہ بدعقیدگی ان کے دلوں میں خار غم بن کر کھٹکتی رہے۔ اس قسم کے حذف کی مثالیں گزر چکی ہیں۔

موت اور زندگی خدا کے اختیار میں ہے

یہ مسلمانوں کو نصیحت کی جا رہی ہے کہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو۔ ان کی بزدلی کی اصلی وجہ ان کی یہ بدعقیدگی ہے کہ وہ موت اور زندگی کو اپنی تدبیروں کے تحت سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ان کے بھائی بندوں میں سے کوئی کسی سفر یا جنگ میں مارا جائے تو بڑی حسرت کے ساتھ کہتے ہیں کہ اگر ہمارے پاس ہوتا یا ہمارے مشورے پر عمل کرتا تو یہ افتاد اس کو پیش نہ آتی۔ چنانچہ یہی بات انھوں نے جنگِ اُحد کے مقتولوں کے بارے میں بھی کہی۔ حالانکہ موت و زندگی کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے زندگی دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے موت دیتا ہے۔ اس نے جس کی موت جس وقت، جس مقام اور جس شکل میں لکھ رکھی ہے وہ آ کے رہے گی اگرچہ وہ اپنے آپ کو آہنی قلعوں کے اندر بند کر چھوڑے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ وہ اپنی تدبیروں سے موت کو ٹال سکتے ہیں وہ اس وہم سے ایک دائمی خلشِ غم اور بزدلی کے سوا کچھ نہیں حاصل کر سکتے۔ اہلِ ایمان کو چاہیے وہ اپنے آپ کو اس فتنہ سے محفوظ رکھیں۔ زندگی اور موت خدا ہی کے اختیار میں ہے اور وہ ہمارے ہر عمل کو قدم قدم پر دیکھ رہا ہے۔

مزید حوصلہ افزائی کے لیے ارشاد ہوا کہ اگر تم کو خدا کی راہ میں شہادت حاصل ہوئی یا کسی اور طرح سے موت آ گئی تو یہ چیز غم کرنے کی نہیں ہے اس لیے کہ اس کے صلے میں جو مغفرت و رحمت تمھیں حاصل ہو گی وہ ان تمام فانی ذخیروں سے کہیں بہتر ہے جو اس زندگی کے پرستار اپنے لیے جمع کر رہے ہیں۔

یہ ملحوظ رہے کہ یہ آیت تہور کی دعوت نہیں دے رہی ہے بلکہ اس حقیقت سے آگاہ کر رہی ہے کہ فرائض سے فرار زندگی بچانے کی کوئی تدبیر نہیں ہے۔ آدمی کے لیے صحیح روش یہ ہے کہ جو فرض جب عائد ہو جائے پورے عزم و جزم کے ساتھ اس کو ادا کرے اور یہ یقین رکھے کہ موت اس وقت آئے گی جب اس کا وقت مقرر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی یقین رکھے کہ ادائے فرض کی راہ میں مرنا اس دنیا کی زندگی اور اس زندگی کے تمام اندوختوں سے کہیں زیادہ قیمتی ہے۔ اس مضمون کی مزید وضاحت آگے آیات ۱۶۷-۱۷۱ کے تحت آ رہی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ جو مرتا یا قتل ہوتا ہے بہرحال خدا ہی کے پاس پہنچتا ہے تو مومن خدا کے قرب سے کیوں گھبرائے۔ یہی تو قربانی کی حقیقت اور اس کا اصل مدعا ہے!

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۖ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ (۱۵۹-۱۶۰)

'فَبِمَا رَحْمَةٍ' میں زبان کا وہی اسلوب استعمال ہوا ہے جو فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيثَاقَهُمْ میں ہے۔ اہلِ نحو اس طرح کے مواقع میں عموماً 'مَا' کو تاکید کے مفہوم میں لیتے ہیں۔ ہمارے نزدیک بعض مواقع میں یہ محض فقرے

کے آہنگ کو ٹھیک رکھنے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

فظ کا مفہوم

'فظ' کے معنی درشت خو اور غلیظ القلب کے معنی سخت دل کے ہیں۔

منافقین کے بارے میں آنحضرت صلعم کے رویہ کی تصویب

یہ آیت بطور التفات وارد ہوئی ہے۔ اوپر سخت الفاظ میں منافقین پر جو تنقید ہوئی ہے اس کا اثر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اور پھر قدرتی طور پر باحمیت مسلمانوں پر یہ پڑ سکتا تھا کہ آپؐ کا اور آپؐ کے مخلص صحابہؓ کا رویہ ان کے بارے میں سخت ہو جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مرحلے میں یہ پسند نہیں فرمایا کہ یہ تبدیلی واقع ہو۔ اگرچہ منافقین کی روش نہایت قابل اعتراض تھی، وہ حضورؐ کی رافت اور چشم پوشی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے تھے لیکن یہ مریض تھے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے یہی پسند فرمایا کہ ابھی ان کو اصلاح حال کی مزید مہلت دی جائے تاکہ جن کے اندر ادنیٰ گنجائش بھی اصلاح پذیری کی باقی ہے وہ اپنی اصلاح کر سکیں۔ چنانچہ اس حکمت کے پیش نظر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی کریمانہ طرز عمل کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے تائید و تصویب فرما دی گئی جو اب تک ان لوگوں کے ساتھ رہا تھا اور اس کی مصلحت بھی واضح فرما دی گئی کہ یہ منافقین اپنی صحت اور اصلاح کے اتنے قدردان نہیں ہیں کہ اس کے لیے کوئی تلخ گھونٹ برداشت کر سکیں، یہ تو اللہ کی عنایت ہی تھی کہ اس نے تم کو نہایت نرم خو اور حلیم بنایا اور تم نے اسی نرم خوئی اور اسی رافت و شفقت کے ساتھ ان کی اصلاح کی کوشش کی۔ اگر تم ذرا بھی ان کے ساتھ سخت گیری کی روش اختیار کرتے تو یہ ایسے وحشی اور ناقدرے ہیں کہ تمہارے پاس سے بھاگ کھڑے ہوتے، اگرچہ دنیا جہان کے روگ ان کے ساتھ چمٹے رہتے، تو ان کے ساتھ ابھی اپنی رافت و رحمت کی یہی روش قائم رکھو، ان کی ناقدریوں سے درگزر کرو اور ان کے لیے اللہ سے استغفار کرتے رہو۔

یہ ملحوظ رہے کہ بعد میں جب منافقین کے ایک گروہ نے اپنے رویہ سے بالکل مایوس کر دیا اور یہ بات واضح ہو گئی کہ چشم پوشی کی روش سے یہ لوگ اصلاح قبول کرنے والے نہیں ہیں تو آخر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اور مسلمانوں کو بھی ہدایت ہوئی کہ ان لوگوں کے بارے میں اپنے رویے کو بدل دیں اور نرمی سے اگر یہ غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں تو سختی سے ان کو صحیح راہ پر لائیں۔ اس پر مفصل بحث توبہ کی آیات ۷۳ و ۱۲۳ اور تحریم کی آیت ۹ کے تحت آئے گی۔

یہاں عفو اور استغفار کی ہدایت کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت بھی ہوئی کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ یعنی معاملات میں ان سے مشورہ لیتے رہو۔ اس بات کے ذکر کا یہاں ایک خاص موقع ہے جس کو مختصراً سمجھ لینا چاہیے۔

اسلامی نظام میں شورائیت کا درجہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم معاملاتِ دین میں کسی کے مشورے کے محتاج نہیں تھے اس لیے کہ آپؐ ہر کام وحی الٰہی کی رہنمائی میں کرتے تھے لیکن سیاسی و انتظامی معاملات میں آپؐ اپنے صحابہؓ سے برابر مشورہ کرتے رہتے تھے اور اس طرح گویا حضورؐ نے خود اپنے طرز عمل سے اس شورائیت کی بنیاد ڈالی جو اسلام کے سیاسی

نظام کی ایک بنیادی خصوصیت رہی ہے۔ اسی شورائیت کے پیش نظر آپ نے غزوۂ احد کے موقع پر بھی، جس کے اثرات و نتائج یہاں زیر بحث ہیں، صحابہؓ سے مشورہ کیا کہ دشمن کا مقابلہ شہر کے اندر رہ کے کیا جائے یا باہر نکل کر۔ مقصود اس مشورے سے، جیسا کہ ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں، یہ تھا کہ جماعت کے اندر جو کمزور لوگ ہیں وہ کھل کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جو کمزور اور منافق قسم کے لوگ تھے انھوں نے اس بات پر زور دیا کہ شہر کے اندر محفوظ ہو کر مقابلہ کیا جائے اور اس سے ان کا مقصود یہ تھا کہ اس طرح وہ اپنی کمزوری اور نفاق کو چھپانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن مخلصین اور جاں نثاروں کی رائے اس کے خلاف ہوئی اور یہی رائے صائب اور حضورؐ کی رائے کے مطابق تھی، اس وجہ سے حضورؐ نے اسی رائے پر عمل فرمایا۔ منافقین کو جب اپنا مشورہ منوانے میں ناکامی ہوئی تو انھوں نے مختلف طریقوں سے اپنا غصہ نکالا۔ ایک گروہ تو یہ بہانہ بنا کر عین موقع پر فوج سے الگ ہو گیا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی۔ دوسرا گروہ جو بادلِ ناخواستہ ساتھ رہا، اس نے شکست کے بعد مسلمانوں میں یہ بددلی پھیلانا شروع کر دی کہ جنگ کا یہ نتیجہ اس وجہ سے نکلا کہ اس کے مشورے کی قدر نہیں کی گئی، اگر ان کی رائے مان لی جاتی تو یہ افتاد پیش نہ آتی۔ ظاہر ہے کہ ان تمام باتوں کا مقصود شرارت اور مسلمانوں میں بددلی پھیلانا تھا لیکن اس مرحلے میں مصلحت، جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، یہی تھی کہ ان منافقین سے درگزر کی

لہ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں یہ بات جو نقل ہوئی ہے کہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے بھی یہی تھی کہ مدینہ کے اندر محصور رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن پُرجوش صحابہؓ نے آپ کو نکلنے پر مجبور کر دیا، یہ بالکل بے ثبوت بات ہے۔ آنحضرت صلعم نے جس وقت لوگوں کے سامنے یہ مسئلہ رکھا اس کے بارے میں خود اپنی رائے ظاہر نہیں فرمائی تاکہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر کر سکے اور مقصود اس سے لوگوں کے حوصلہ کا جائزہ لینا تھا تاکہ جنگ سے پہلے فوج کی صحیح صحیح حالت کا اندازہ ہو جائے۔ عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھیوں نے شہر کے اندر سے مقابلہ پر اصرار کیا اور جاں نثاروں نے باہر نکل کر۔ آپ نے اس تدبیر سے جب کمزوروں اور حوصلہ مندوں کا اندازہ فرما لیا تو گھر کے اندر داخل ہوئے اور اسلحہ پہن کر باہر تشریف لائے۔ یہ اس امر کا اظہار تھا کہ مقابلہ باہر نکل کر کرنا ہے۔ جاں نثاروں کو بطورِ خود یہ گمان ہوا کہ مبادا حضورؐ نے یہ رائے ان کے اصرار کی وجہ سے اختیار فرمائی ہو اس وجہ سے انھوں نے معذرت کے ساتھ اپنی رائے واپس لینی چاہی۔ اس پر حضورؐ نے فرمایا کہ نبی ہتھیار پہن کر اتارا نہیں کرتا۔ یعنی اب جب کہ عزم ہو چکا تو یہ بدل نہیں سکتا۔ جب منافقین نے دیکھا کہ ان کی بات نہیں چلی تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کے ساتھ الگ ہو گیا۔ یہ واضح رہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی اہم جنگ کے لیے نکلنے سے پہلے فوج کے حوصلے کا اندازہ کرنے کے لیے کوئی حکیمانہ تدبیر ضرور اختیار فرماتے تھے۔ بدر کے موقع پر بھی آپ نے یہ تدبیر اختیار فرمائی تھی اور اسی موقع پر انصار کے لیڈر نے وہ تقریر کی تھی جو اسلام کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گی۔

روش اختیار کی جائے اور جو مجلسی اور جماعتی حقوق ان کو حاصل ہیں وہ ان کی ان غلطیوں کے باوجود بھی ابھی باقی رہیں۔ چنانچہ جس طرح حضورؐ کو ان کے لیے عفو و استغفار کی ہدایت ہوئی اسی طرح اس بات کی بھی ہدایت ہوئی کہ جو امور مشورہ کے تحت آتے رہیں ان میں آپ بدستور ان سے مشورہ لیتے رہیں۔ اگرچہ ان کی کمزوری اور بدخواہی واضح ہو چکی ہے۔

اکثریت اور اقلیت کے باب میں صحیح نقطۂ نظر

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ کے بعد فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ سے یہ اشارہ بھی نکلتا ہے کہ انتظامی و سیاسی امور میں مشورے کی یہ ہدایت صاحبِ امر کی تقویت اور اس کے اطمینان کے پہلو سے ہے۔ مشورہ کرنا تو بہرحال ضروری ہے لیکن مشورے کے بعد جس بات پر اس کا دل ٹھک جائے اللہ کے بھروسے پر وہ کام اسے کر گزرنا چاہیئے۔ صاحب امر کے اطمینان کے بعد یہ امر کچھ زیادہ اہمیت نہیں رکھتا کہ جو رائے اس نے اختیار کی وہ اکثریت کی ہے یا اقلیت کی۔ نہ اکثریت فی نفسہٖ دلیلِ صحت و صواب ہے نہ اقلیت دلیل خطا۔ البتہ یہ بات ضرور ہے کہ اکثریت کی رائے میں فی الجملہ صحت کا گمان غالب ہے۔ اس وجہ سے فصل نزاعات میں اگر اس کو فیصلہ کن مانا جائے تو مصلحت کے پہلو سے یہ راہ مامون ہے۔ بالخصوص اس زمانے میں جب کہ اتباع ہوا کا زور ہے اور اختیار و اقتدار کو حدود کے اندر استعمال کرنے والے لوگ کتر ہی ہیں۔

چند نکات

مذکورہ بالا دونوں آیتوں سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں۔

ایک یہ کہ عام افراد کی طرح ارباب اقتدار و سیاست کے لیے بھی پسندیدہ روش نرمی و چشم پوشی ہی کی روش ہے۔ اسی سے افراد میں حسن ظن اور اعتماد پیدا ہوتا ہے جس سے اجتماعی نظام میں وحدت، قوت اور استحکام کی برکتیں ظہور میں آتی ہیں۔ سختی اور سخت گیری اس کی فطرت میں نہیں بلکہ اس کے عوارض میں سے ہے۔ جس طرح صحت کے لیے اصل شے غذا ہے لیکن کبھی کبھی کسی مرض کے علاج کے لیے دوا کی بھی ضرورت پیش آجاتی ہے اسی طرح اجتماعی نظام میں اصل چیز نرمی ہے۔ سختی کبھی کبھی ضرورت کے تحت اختیار کرنی پڑتی ہے۔

دوسری یہ کہ اجتماعی نظام میں شورائیت اس حسن ظن و اعتماد کا مظہر ہے جو راعی اور رعایا اور امیر و مامور میں ہونا چاہیئے۔ اسی سے استبداد اور سخت دلی کی جڑ کٹتی ہے اور راعی اور رعایا دونوں طرف سے وہ تعاون ظہور میں آتا ہے جو استحکام کی بنیاد ہے۔

تیسری یہ کہ توکل، بے عملی اور تعطل کا کوئی بہانہ اور گوشۂ خمول کا کوئی تکیہ نہیں ہے بلکہ انفرادی و اجتماعی زندگی کی تمام سرگرمیوں میں عزم و عمل کی بنیاد ہے۔

چوتھی یہ کہ اصل قوت توکل علی اللہ ہے۔ وسائل و اسباب کی حیثیت ثانوی ہے۔

پانچویں یہ کہ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ جو شخص خدا پر ایمان کا مدعی ہے لیکن اس کو خدا پر بھروسہ نہیں ہے اس کا ایمان بے معنی ہے۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ ۭ وَمَنْ يَّغْلُلْ يَاْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝ اَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْۢ بَاۗءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَاْوٰىهُ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ (۱۶۱-۱۶۳)

لفظ غل کا صحیح مفہوم

'غل یغل غلولا' کے معنی خیانت، بدعہدی اور بے وفائی کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ دراصل لفظ 'نصح' کا ضد ہے جس کے معنی خیر خواہی اور خیر سگالی کے ہیں۔ اصحاب لغت میں سے زجاج نے مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَّغُلَّ کی تشریح، جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے، مَا كَانَ لِنَبِيٍّ اَنْ يَخُوْنَ اُمَّتَهٗ کے الفاظ سے کی ہے۔ لفظ غل جو قرآن میں متعدد جگہ استعمال ہوا ہے، غش، عداوت، ضغن (کینہ) حقد اور حسد کے معنی میں استعمال ہوا ہے (لَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوْبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا) اس لفظ کو صرف مالی خیانت کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی دلیل میرے علم میں نہیں آئی۔

آنحضرت صلعم پر منافقین کا الزام اور اس کا جواب

یہ منافقین کے اس الزام کی تردید ہے جو انھوں نے احد کی شکست کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا اور جس کو مسلمانوں کے اندر بد دلی پیدا کرنے کے ارادے سے اچھی طرح پھیلایا۔ الزام یہ تھا کہ ہم نے تو اس شخص پر اعتماد کیا، اس کے ہاتھ پر بیعت کی، اپنے نیک و بد کا اس کو مالک بنایا لیکن یہ اس اعتماد سے بالکل غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں اور ہمارے جان و مال کو اپنے ذاتی حوصلوں اور امنگوں کے لیے تباہ کر رہے ہیں۔ ہم نے تو واضح طور پر یہ مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے لیکن انھوں نے ہمارے مشوروں کی اور ہمارے بھائیوں کی جانوں کی کوئی قدر و قیمت نہ سمجھی اور ان کو ایک بالکل نامناسب مقام میں لے جا کر دشمن سے تہ تیغ کرا دیا، یہ صریحاً قوم کی بدخواہی اور اس کے ساتھ غداری و بے وفائی ہے۔

اس الزام کی طرف اوپر کی آیات میں بھی اشارات موجود ہیں اور آگے بھی اس کی وضاحت آئے گی۔ قرآن نے یہ ان کے اس الزام کی تردید فرمائی ہے کہ تمھارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے۔ کوئی نبی اپنی امت کے ساتھ کبھی بے وفائی و بدعہدی نہیں کرتا۔ نبی جو قدم بھی اٹھاتا ہے رضائے الٰہی کی طلب میں اور اس کے احکام کے تحت اٹھاتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوتا کہ ہر بدعہدی و بے وفائی خدا کے حضور پیش ہوگی اور یہ بدعہد اپنے کیے کی پوری پوری سزا بھگتے گا۔ رضائے الٰہی کے طالب اور اس کے قہر و غضب کے سزاوار یکساں نہیں ہوں گے۔ ان کے درجے اور ٹھکانے ان کے اعمال کے مطابق الگ الگ ہوں گے۔ اللہ ہر ایک کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

آیت کی یہ تاویل الفاظ قرآن اور نظم کلام کے مطابق ہے۔ ارباب تاویل میں سے بھی بعض لوگوں نے، جیسا کہ تفسیر ابن جریر سے واضح ہوتا ہے، یہی تاویل اختیار کی ہے۔ اس وجہ سے اس روایت کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جو تفسیر کی کتابوں میں نقل ہوئی ہے کہ مال غنیمت میں سے ایک چادر گم ہو گئی تھی جس کا الزام منافقین نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگایا تھا اور یہ اس کی تردید ہے۔ اول تو یہ روایت بدء

کے مال غنیمت سے متعلق بیان کی جاتی ہے (اس لیے کہ اُحد میں مال غنیمت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا، اس میں تو مسلمانوں کو شکست ہوئی تھی) اور یہاں حالات پر تبصرہ ہو رہا ہے اُحد کے۔ اس بیچ میں بغیر کسی قرینہ اور بدون کسی حوالہ کے بدر کے کسی واقعہ کا جس پر ایک عرصہ گزر چکا تھا، ذکر کرنے کا کیا موقع تھا؟ پھر سب سے زیادہ خیال کرنے کی بات یہ ہے کہ منافقین ایسے بے وقوف نہیں تھے کہ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایک ایسا الزام لگائیں جس کو کوئی بھی باور نہ کرے بلکہ جو شخص بھی سنے اس کو سن کر ہنس دے۔ منافقین تو درکنار آپ کے کٹر سے کٹر معاندین قریش تک کا حال یہ تھا کہ انھوں نے آپ پر کسی مالی خیانت کا، خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی، کوئی الزام لگانے کی جسارت کبھی نہیں کی۔ اسلام اور جاہلیت دونوں میں آپ امین کے لقب سے مشہور رہے اور آپ کی اس شہرت کی دھاک جس طرح دوستوں پر تھی، اسی طرح دشمنوں پر بھی تھی۔ مالی معاملات میں اگر بعض نادان لوگوں نے حضورؐ کے خلاف کبھی کچھ کہا بھی ہے تو اس کی نوعیت الزام خیانت کی نہیں ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ کسی کے مقابل میں کسی کو کچھ زیادہ دے دینے کی ہے۔ ان مواقع پر بھی حقیقت واضح ہو جانے کے بعد الزام لگانے والے فریق نے سخت ندامت کا اظہار کیا ہے۔ مثلاً فتح مکہ اور غزوہ حنین کے موقع پر۔ اس وجہ سے یہ بات تو بالکل بعید از عقل معلوم ہوتی ہے کہ منافقین آپ پر ایک حقیر چادر کی خیانت کا الزام لگائیں۔ البتہ یہ بات کہہ کر وہ کمزور لوگوں کے دلوں میں وسوسہ اندازی کر سکتے تھے کہ (نعوذ باللہ) محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اپنی قوم کے وفادار اور بہی خواہ نہیں ہیں، وہ اپنے حوصلوں پر اپنی قوم کو قربان کر رہے ہیں۔ اُحد کی شکست کے بعد اس قسم کے پروپیگنڈے کے لیے ان کو ایک موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ جس سے انھوں نے فائدہ اٹھایا۔ بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ شہر سے باہر نکل کر جنگ کے مخالف تھے لیکن جاں نثار صحابہؓ اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی رائے قبول نہیں کی۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَ يُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ (۱۶۴)

بعثتِ نبوی کی برکات

یہ آیت تھوڑے سے فرق کے ساتھ سورۂ بقرہ میں بھی گزر چکی ہے۔ وہاں اس کے تمام اہم اجزا کی تشریح ہو چکی ہے۔ نظم کے پہلو سے یہ آیت اسی حقیقت کو مثبت پہلو سے پیش کر رہی ہے جو اوپر والی آیت میں منفی پہلو سے ظاہر کی گئی۔ اوپر کی آیت میں، جیسا کہ بیان ہوا، نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو ملت کے ساتھ بدخواہی و بے وفائی کے الزام سے بری قرار دیا گیا ہے، اس آیت میں اس عظیم احسان کا اظہار کیا گیا ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں تمام دنیا پر اور خاص طور پر قوم عرب پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ یہ احسان یہاں تین مختلف پہلوؤں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ایک تو اس پہلو سے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل عرب کے اندر انہی کے اندر سے ایک رسول مبعوث فرمایا تاکہ زبان کی اجنبیت، نسل و نسب کی غیریت، رجحانات و میلانات کی بیگانگی اور ماضی و حاضر سے بے خبری

کسی تعصب اور بدگمانی کا باعث نہ بنے اور لوگ اس پر اپنے ہی باپ اور بھائی کی حیثیت سے اعتماد کر سکیں اور اس کی آواز کو خود اپنے ضمیر کی آواز کی طرح پہچان اور سن سکیں۔ اس حقیقت کا اظہار مِنْ اَنْفُسِكُمْ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔

دوسرے اس رسول کے مقصد اور مشن کے پہلو سے کہ یہ رسول اللہ کی آیتیں سناتا ہے، تم کو تمام عقلی، اخلاقی اور عملی گمراہیوں سے پاک کرتا ہے اور تمھیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے رہا ہے۔ بھلا جس کے فیوض و برکات سے تمھاری انفرادی و اجتماعی اور ظاہری و باطنی زندگی کا ہر گوشہ یوں منور ہو رہا ہے اس سے بڑا بھی تمھارا کوئی خیر خواہ ہو سکتا ہے!

تیسرے مخاطب کی ضرورت کے پہلو سے۔ اہل عرب دین و شریعت سے بے خبر اور نبوت و رسالت سے ناآشنا امی لوگ تھے۔ ایک زمانۂ دراز سے کفر و جاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ان کی دستگیری فرمائی اور ان کو گمراہی کی وادیوں سے نکال کر ہدایت کی صراط مستقیم پر لا کھڑا کیا۔ اس حقیقت کا اظہار وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ یہاں یہ اِنْ مخففہ ہے جو اِنَّ کے معنی میں آتا ہے اور اس کے بعد جو لام ہے یہ اس کا قرینہ ہے۔

اَوَلَمَّآ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَدْ اَصَبْتُمْ مِّثْلَيْهَا ۙ قُلْتُمْ اَنّٰى هٰذَا ۭ قُلْ هُوَ مِنْ عِنْدِ اَنْفُسِكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۶۵)

'اَ' حرفِ استفہام ہے اور 'وَ' حرفِ ربط ہے۔ عربی زبان میں حرفِ استفہام کی اصلی جگہ جملہ کے آغاز ہی میں ہے۔ مثلاً اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ - ۸۱-الواقعہ۔ یہ حرفِ استفہام اظہارِ تعجب کے لیے ہے اور حرفِ ربط اس بات کی دلیل ہے کہ یہ بات بھی منجملہ ان اعتراضات کے ایک اعتراض ہے جن کے جواب اوپر دیے گئے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

اوپر یہ بات گزر چکی ہے کہ کچھ لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جو شخص خدا کا رسول ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہونا چاہیئے، جب وہ کسی مہم پر نکلیں تو ان کے ساتھ خدا کے فرشتوں کی مدد ہونی چاہیئے، جب انھیں کوئی جنگ پیش آئے تو ضروری ہے کہ وہ اس میں فتحمند ہوں۔ اس خیال کے لوگوں کو اُحد کی شکست سے قدرتی طور پر بڑا دھکا لگا۔ وہ سوچنے لگ گئے کہ اگر اسلام ایک سچا دین ہے اور محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچ مچ خدا کے رسول ہیں تو یہ شکست ان کو کہاں سے پیش آئی؟ کمزوروں کی اس نفسیاتی کیفیت سے منافقین نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس شکست کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک دلیل کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کیا۔ قرآن نے اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں تفصیل کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے اور اہل حق

کو جو آزمائشیں پیش آتی ہیں ان کی حکمت واضح فرمائی ہے۔

اس آیت میں پہلی بات یہ فرمائی کہ جو افتاد تمھیں پیش آئی یہ صرف تمھی کو پیش نہیں آئی کہ تم اس کو بدگمانی اور مایوسی کی دلیل بنا لو بلکہ اس سے دوچند نقصان تمھارے ہاتھوں تمھارے دشمنوں کو پہنچ چکا ہے۔ بدر میں تم نے دشمن کے ۷۰ آدمی قتل کیے، ۷۰ قیدی بنائے۔ احد میں بھی پہلے تمھارا ہی پلہ بھاری تھا اور تمھارے ہاتھوں دشمن کے کچھ آدمی قتل اور زخمی بھی ہوئے۔ لیکن بعد میں خود تمھاری غلطی سے تمھیں شکست ہو گئی۔ اللہ فتح اور شکست دونوں پر قادر ہے اور اس کی قدرت ہمیشہ اس کی حکمت کے تحت ظاہر ہوتی ہے۔

دوسری بات یہ فرمائی کہ اس افتاد کے سبب تم خود ہوئے ہو۔ اس کی وضاحت اوپر آیت ۱۵۲ میں ان الفاظ کے ساتھ ہو چکی ہے۔ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللّٰهُ وَعْدَهٗٓ اِذْ تَحُسُّوْنَهُمْ بِاِذْنِهٖ حَتّٰٓى اِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِى الْاَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَآ اَرٰىكُمْ مَّا تُحِبُّوْنَ ۭ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۚ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۭ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (اور اللہ نے تم سے اپنا وعدہ سچ کر دکھایا تھا جب کہ تم خدا کے حکم سے ان کو تہ تیغ کر رہے تھے۔ یہاں تک کہ تم کمزور پڑ گئے، تم نے معاملے میں اختلاف کیا اور تم نے نافرمانی کی جب کہ خدا نے تمھیں وہ چیز دکھا دی جس کو تم عزیز رکھتے تھے تم میں کچھ دنیا کے طالب تھے، کچھ آخرت کے۔ پھر خدا نے تمھارا رخ ان سے پھیر دیا تاکہ تمھاری آزمائش کرے اور اللہ نے تم سے درگزر کیا اور اللہ مومنوں پر بڑے فضل والا ہے)

وَمَآ اَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ فَبِاِذْنِ اللّٰهِ وَلِيَعْلَمَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۙ وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ نَافَقُوْا ۚ وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا قَاتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوِ ادْفَعُوْا ۭ قَالُوْا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّا اتَّبَعْنٰكُمْ ۭ هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَىِٕذٍ اَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْاِيْمَانِ ۚ يَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِىْ قُلُوْبِهِمْ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُوْنَ ۚ اَلَّذِيْنَ قَالُوْا لِاِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوْا لَوْ اَطَاعُوْنَا مَا قُتِلُوْا ۭ قُلْ فَادْرَءُوْا عَنْ اَنْفُسِكُمُ الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ (۱۶۶-۱۶۸)

راہِ حق کی آزمائشوں کی حکمت

اب یہ اس ابتلاء کی حکمت واضح کی جا رہی ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے خدا کے حکم سے پیش آیا ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ سچے مسلمانوں اور منافقوں کو اچھی طرح واضح کر دے تاکہ ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ لے کہ کون لوگ جماعت کے اندر قابلِ اعتماد ہیں کون لوگ نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ آزمائش جماعتی تطہیر کے لیے ضروری تھی۔ اگر مخلصین اور منافقین دونوں اسی طرح رلے ملے رہتے تو معلوم نہیں مفسد عناصر کس وقت پوری جماعت کا بیڑا غرق کر دیتے۔

'وَقِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا' یہ منافقین کے ایک گروہ کی طرف اشارہ ہے جن کو اس موقع پر جہاد کی دعوت دی گئی کہ اٹھو اگر جنگ ہو گئی تو جہاد کا ثواب حاصل ہو گا اور اگر دشمن ہماری جمعیت سے مرعوب ہو گیا تو دفاع کا مقصد پورا ہو جائے گا۔ لیکن یہ لوگ جہاد کے لیے نہ اٹھے اور اپنے نفاق اور بزدلی پر پردہ ڈالنے

کے لیے انھوں نے یہ بات بنائی کہ ہمیں علم ہے کہ اس موقع پر لڑائی نہیں ہونی ہے۔ اگر ہمیں لڑائی کا علم ہوتا تو ہم ضرور تمھارے ساتھ چلتے۔ قرآن نے ان کے بابت فرمایا کہ یہ بات کہتے وقت یہ ایمان سے زیادہ کفر سے قریب تر تھے اور انھوں نے زبان سے وہ بات کہی جو ان کے دل میں نہیں تھی۔ دل میں وہ جو کچھ چھپائے ہوئے تھے اس کا خدا کو خوب پتا ہے۔

اس کے بعد ان کے دل کا راز کھول دیا کہ یہ خود تو سخن سازی کر کے گھروں میں بیٹھے رہے لیکن ان کے جو بھائی بند جہاد میں شریک اور شہید ہوئے، ان کی بابت انھوں نے کہا کہ اگر وہ ہماری بات مانتے تو یوں قتل نہ ہوتے۔ مقصد یہ ہے کہ اصل چیز جو ان کے لیے مانع ہوئی وہ ہے تو موت کا خوف لیکن انھوں نے بات یہ بنائی کہ وہ اس لیے نہیں اٹھ رہے ہیں کہ جنگ و جنگ کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اگر یہ موت و زندگی کے مواقع سے ایسے ہی باخبر ہیں تو وہ اپنے آپ کو موت سے بچائیں!

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَيَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِهِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ (۱۶۹-۱۷۱)

منافقین کو ایک تنبیہ

یہ ان منافقین کو تنبیہ ہے کہ خدا کی راہ میں شہید ہونے والوں کو مردہ نہ سمجھو۔ مردہ وہ نہیں ہیں بلکہ تم ہو۔ وہ تو زندہ ہیں اور اپنے رب کے جوارِ رحمت میں اس کی نعمتوں سے محظوظ ہو رہے ہیں۔ تم اپنی جہالت اور بے بصیرتی سے ترس کھا رہے ہو کہ وہ مارے گئے اور خیال کر رہے ہو کہ اگر وہ تمھاری رائے پر چلتے، تمھاری ہی طرح گھروں میں بیٹھ رہتے تو نہ مارے جاتے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ اس فضل و نعمت پر فرحاں و شاداں ہیں جس سے اللہ نے ان کو نواز رکھا ہے۔ تمھیں ان کی موت پر حسرت و افسوس ہے اور ان کا عالم یہ ہے کہ دمبدم ان کو اپنے ان اخلاف و اولاد سے متعلق جو ان کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں اور ان سے ملنے کے آرزومند ہیں اگرچہ ابھی ملے نہیں ہیں، یہ بشارت مل رہی ہے کہ وہ بھی عنقریب ان سے ملیں گے اور ان کو بھی انھی کی طرح وہ مقام حاصل ہو گا جہاں نہ تو مستقبل کا کوئی اندیشہ ہو گا نہ ماضی کی کوئی حسرت۔

شہدا کے بااِیمان اخلاف کے ساتھ رعایت

یہ امر ملحوظ رہے کہ قرآن میں یہ حقیقت مختلف اسلوبوں سے واضح کی گئی ہے کہ عالی مقام اہلِ ایمان کے ساتھ جنت میں ان کی ذریت اور ان کے اخلاف میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جن کا خاتمہ ایمان پر ہو گا اگرچہ اپنے عمل کے لحاظ سے یہ ان کے درجے کے نہ ہوں۔ یہ شہدا اور صدیقین پر اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہو گا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کی بااِیمان ذریت کو ان کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا اور اس مقصد کے لیے اسلاف کا درجہ نیچا نہیں کیا جائے گا بلکہ اخلاف کا درجہ بلند کر دیا جائے گا۔ اس مسئلہ پر خدا نے چاہا تو ہم سورۂ طور کی تفسیر میں بحث کریں گے۔

ان آیات پر غور کیجیے تو معلوم ہو گا کہ قرآن نے نہایت بلاغت کے ساتھ ان تمام بُرے اثرات کو

مٹایا ہے جو منافقین مسلمانوں کے دلوں پر عموماً اور شہدا کی ذریات اور ان کے اخلاف پر خصوصاً ڈالنا چاہتے تھے۔

اَلَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْۢ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ ۛ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِیْمٌ ۚ اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ اِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوْا لَكُمْ فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ اِیْمَانًا ۖ وَّقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِیْلُ ۝ فَانْقَلَبُوْا بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ لَّمْ یَمْسَسْهُمْ سُوْٓءٌ ۙ وَّاتَّبَعُوْا رِضْوَانَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ ذُوْ فَضْلٍ عَظِیْمٍ ۝ اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّیْطٰنُ یُخَوِّفُ اَوْلِیَآءَهٗ ۠ فَلَا تَخَافُوْهُمْ وَخَافُوْنِ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ۝ (۱۷۲-۱۷۵)

احد کی شکست کے بعد بھی مخلصین کا حوصلہ برقرار رہا

'اَلَّذِیْنَ' ان مومنین کی صفت ہے جن کا ذکر اوپر ہوا۔ اس صفت کے اضافے نے کلام کو بالکل مطابق حال بنا دیا اور اوپر والی آیت میں جو اصولی بات فرمائی گئی تھی اس کا ایک متعین محل سامنے آ گیا۔ یعنی اس عظیم اجر کے مستحق وہ لوگ ٹھہریں گے جن کے عزم و ایمان کا حال یہ ہے کہ احد کی شکست کا زخم کھانے کے بعد بھی اُن میں کوئی خم نہیں پیدا ہوا بلکہ جوں ہی اللہ و رسول کی طرف سے ایک تازہ مہم کی منادی ہوئی وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں میں بیان ہوا ہے کہ احد میں مسلمانوں کی شکست کے بعد قریش کی فوج اوّل اوّل تو واپس چلی گئی لیکن روحاء کے مقام تک پہنچنے کے بعد ابوسفیان اور ان کے ساتھیوں کو احساس ہوا کہ انھوں نے اس قدر جلد واپس ہونے میں سخت غلطی کی ہے، لگے ہاتھوں انھیں مدینہ کا قصہ بھی پاک کر دینا تھا۔ یہ سوچ کر انھوں نے اپنی فوج کی از سر نو تنظیم شروع کر دی اور ادھر مسلمانوں کو ہراساں کرنے کے لیے منافقین کے ذریعے سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ قریش نئے ساز و سامان سے مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے تیاریاں کر رہے ہیں۔ حضورؐ کو جب اس کی اطلاع پہنچی تو آپؐ نے بھی لوگوں کو قریش کے تعاقب کے لیے تیار ہو جانے کا حکم دے دیا۔ اس فوج میں صرف انھی لوگوں کو شامل ہونے کی اجازت دی گئی جو پہلے روز کی جنگ میں شریک رہے تھے۔ یہ احتیاط غالباً اس لیے کی گئی کہ منافقین کے لوث سے یہ لشکر پاک رہے۔ چنانچہ حضورؐ جاں نثاروں کی ایک جماعت کے ساتھ ابوسفیان کے تعاقب میں نکلے اور حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے ۸ میل کے فاصلے پر ہے۔ ابوسفیان نے جب دیکھا کہ ابھی مسلمانوں کے حوصلہ میں کوئی فرق نہیں آیا ہے تو ارادہ بدل دیا اور مسلمان کامیاب و بامراد واپس آ گئے۔

'لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا' یہاں 'احسان' اللہ و رسول کی وفاداری کے حق کو بہتر سے بہتر شکل میں ادا کرنے اور تقویٰ، نفاق کی تمام آلائشوں سے بچنے کے معنی میں ہے۔ یہ درجہ ایک نہایت اونچا درجہ ہے اور اس کے لیے جد و جہد کرنے والوں کے درجات و مراتب ان کے باطنی خلوص اور ان کے ظاہری اعمال و اقدامات کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

'اَلَّذِیْنَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ الآیۃ' میں مذکورہ اصحابِ احسان کا بیان ہے کہ جب منافقین نے ان کو ہراساں کرنے کے لیے یہ افواہ پھیلائی کہ قریش نئے ساز و سامان کے ساتھ حملہ کی پھر تیاریاں کر رہے ہیں تو

یہ خبر بجائے اس کے کہ ان کے اندر خوف و ہراس پیدا کرتی ان کے عزم و ایمان کو بڑھانے کا سبب بن گئی۔ قاعدہ ہے کہ جس کنوئیں کے سوتے زوردار ہوں اس کے اندر سے جتنا ہی پانی نکالا جائے اتنا ہی اس کے سوتے اور زیادہ جوش کے ساتھ اُبلتے ہیں۔ اسی طرح آگ اگر قوت در ہو تو گیلی لکڑی بھی اس میں ڈالیے تو اس کو بھی اپنی غذا بنا کر مزید طاقت ور بن جاتی ہے۔ یہی حال اصحاب عزم و ایمان کا ہے۔ ان کو بھی کاوٹیں ضعیف کرنے کے بجائے اور زیادہ پر عزم اور پر حوصلہ بنا دیتی ہیں۔ ہر آزمائش ان کی مخفی صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان ان کے لیے فتحمندی کا ایک نیا میدان کھولتا ہے۔

رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

'وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ وَنِعْمَ الْوَكِيْلُ' یہ اس زیادتِ ایمان کا مظہر ہے جس کا ذکر 'فَزَادَهُمْ اِيْمَانًا' کے الفاظ سے ہوا ہے۔ اہل ایمان کی تمام قوت و طاقت کا خزانہ درحقیقت یہی 'حَسْبُنَا اللّٰهُ' کا عقیدہ ہے۔ مومن کا ایمان اس بات پر ہوتا ہے کہ تمام قوت و طاقت اللہ وحدہٗ لاشریک ہی کے ہاتھ میں ہے تو جب بندہ خدا کے مقرر کیے ہوئے کسی فرض کو ادا کرنے کے لیے خود خدا ہی کے حکم سے اٹھ رہا ہے تو اس کو دنیا کی کوئی طاقت کس طرح ڈرا سکتی ہے۔ بہترین ہستی جس کو بندہ اپنا معاملہ سپرد کر سکتا ہے وہ خدا کی ہستی ہے تو جس نے خدا کو اپنا وکیل و معتمد بنایا اب اس کے لیے کسی خوف و ہراس کی گنجائش کہاں باقی رہی!

کیا غم ہے اگر ساری خدائی ہو مخالف
کافی ہے اگر ایک خدا میرے لیے ہے

'اِنَّمَا ذٰلِكُمُ الشَّيْطٰنُ' الآیہ یعنی یہ ڈراوے سب شیطان کی طرف سے تھے اور اس طرح وہ تم پر اپنا اور اپنے ساتھیوں اور دوستوں کا رعب جمانا چاہتا تھا تو تم شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف مجھی سے ڈرو، اگر تم سچے مومن ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں شیطان اور اس کے اولیا سے اشارہ قریش اور ان کے ساتھیوں کی طرف ہے اور ان سے جس ڈر کی ممانعت کی گئی ہے یہ وہ ڈر ہے جس کا ہوا منافقین دکھا رہے تھے کہ ان کے ڈر سے خدا کے دین کے احکام و مطالبات کو پس پشت ڈال دیا جائے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۭ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰى يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَى الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ (۱۷۶-۱۷۹)

یہ آیتیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کی طرف التفات کی نوعیت کی ہیں۔ احد کی شکست کے بعد، جیسا کہ آیات التفات

اوپر کی آیات سے واضح ہے اور ہم سورہ کی تمہید میں بھی اشارہ کر چکے ہیں، وہ لوگ جو منافقانہ اسلام کی صفوں میں آگھسے تھے یا تو علانیہ کفر کی طرف پلٹ گئے یا پلٹ جانے کے لیے تمہیدیں استوار کرنے لگ گئے۔ یہ لوگ اس طمع خام میں مبتلا ہو گئے کہ قریش کی حمایت کر کے اس دین کو شکست دی جا سکتی ہے۔ چنانچہ ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور کفر اور اہلِ کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئیں۔ اس صورتِ حال پر ارشاد ہوا کہ اس سے ذرا بھی پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ کفر کی راہ میں ان لوگوں کی یہ سرگرمیاں اللہ اور اس کے دین کو ذرا بھی نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ جو لوگ کفر کو ایمان پر ترجیح دے رہے ہیں اللہ بھی ان کے لیے یہی چاہتا ہے کہ آخرت میں ان کا حصہ صرف دردناک عذاب ہو۔ اللہ نے ان کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ان کو جو ڈھیل دے رکھی ہے اس ڈھیل کو یہ اپنی کامیابی سمجھتے ہیں حالانکہ یہ ان کی کامیابی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور ان کے گناہوں کا پیمانہ اچھی طرح لبریز ہو جائے تاکہ جب ان کی کشتی ڈوبے تو پھر اس کو ابھرنا نصیب نہ ہو۔ اس ڈھیل کے بعد ان کے لیے صرف ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔ ایسا عذاب جس کے بعد کسی کو بھی ان سے کوئی ہمدردی نہیں ہو گی بلکہ صرف دنیا اور آخرت کی رسوائی ہو گی۔

واقعۂ احد کی حکمت

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الآیۃ یہ اشارہ ہے اس حکمت کی طرف جو احد کی اس آزمائش میں اہلِ ایمان کے لیے مضمر تھی۔ فرمایا کہ اب تک مسلمانوں کی جماعت خام و پختہ، خبیث و طیب اور مخلص و منافق ہر قسم کے افراد پر مشتمل رہی ہے۔ یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت کے خلاف تھی کہ جو جماعت تمام دنیا کی صلاح و فلاح کا ذریعہ بننے والی ہے وہ اس طرح صالح و فاسد کا ملغوبہ بنی رہے۔ چنانچہ اس نے چاہا کہ اس کے فاسد عناصر کو اس سے الگ کیا جائے تاکہ مخلص اہلِ ایمان ابھر کر سامنے آئیں اور اپنی صلاحیتوں کے مطابق پروان چڑھیں۔ اس کے لیے ایک شکل تو یہ تھی کہ تمام مسلمانوں کو غیب کا علم دے دیا جاتا کہ وہ خود معلوم کر سکتے کہ کون ان کے اندر مخلص ہے، کون منافق۔ لیکن یہ بات اللہ کی سنت کے خلاف ہے کہ وہ غیب کے اسرار سے ہر ایک کو واقف کر دے۔ غیب کی باتوں کے لیے اپنے رسولوں میں سے وہ جن کو چاہتا ہے منتخب کرتا ہے اور ان کو امورِ غیب میں سے جس چیز سے چاہتا ہے آگاہ فرماتا ہے۔ اس کی دوسری شکل یہ تھی کہ تمہاری جماعت کو کوئی ایسا امتحان پیش آئے جو خود تمہارے کھرے اور کھوٹے اور مخلص و منافق کو چھانٹ کر الگ کر دے۔ یہی شکل اللہ کی سنت کے مطابق ہے چنانچہ واقعۂ احد کی صورت میں یہ امتحان تمہارے سامنے آگیا اور اس امتحان نے تمہارے کھرے اور کھوٹے میں امتیاز کر دیا۔

فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ الآیۃ یہ اس امتحان کی برکات سے پورا پورا فائدہ اٹھانے اور ایمان و تقویٰ کے تمام تقاضے پورے کرتے رہنے کی تاکید ہے تاکہ اس تطہیر کے بعد نفاق کی بیماری کو پھر جماعت کے اندر گھسنے کی راہ نہ ملے۔ یہاں یہ فعل اپنے کامل معنی میں ہے اور آخر میں اس کے اجرِ عظیم کا وعدہ ہے۔

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ هُوَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ ۭ سَيُطَوَّقُوْنَ

مَا بَخِلُوْا بِهٖ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۝ لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ فَقِيْرٌ وَّنَحْنُ اَغْنِيَاۗءُ ۘ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ ۙ وَّنَقُوْلُ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ (۱۸۰ - ۱۸۲)

منافقین کی کمزوری انفاق کے معاملے میں

اہلِ نفاق جس طرح اپنی جان کے معاملے میں چور ہوتے ہیں اسی طرح اپنے مال کے معاملے میں بھی چور ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کی اس کمزوری پر بھی تنبیہ فرمائی تاکہ مسلمان اس بیماری سے بھی ہوشیار رہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے سے دریغ کر رہے ہیں درآنحالیکہ وہ خدا ہی کا بخشا ہوا ہے اور خدا نے ان کو کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے فضل سے بخشا ہے، وہ یہ نہ سمجھیں کہ اپنے مستقبل کی مصلحت کے لیے وہ کوئی بڑا مفید کام کر رہے ہیں۔ خدا کے حقوق و فرائض سے چرا چرا کر جو مال جمع کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے دن ان کی گردنوں کا بوجھل طوق بنے گا اور سونے کے جو طوق آج زینت و فخر کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں یہ سانپوں اور اژدہوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے۔

مزید فرمایا کہ آسمان و زمین کی ساری میراث بالآخر خدا ہی کی طرف پلٹ جانے والی ہے۔ جو کچھ جس کو ملا ہے خدا ہی سے ملا ہے اور پھر یہ سب کچھ اسی کی طرف لوٹ جانے والا ہے یہ ساری چیزیں خدا نے ہمیں بطورِ امانت بخشی ہیں اور مقصود اس سے ہمارا امتحان ہے۔ وہ اس بات سے اچھی طرح باخبر ہے کہ ہم نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کس طرح کا تصرف کیا ہے اور اپنے اس علم کے مطابق وہ جزا یا سزا دے گا۔

منافقین کا طنز اللہ جل شانہٗ کی شان میں

'لَقَدْ سَمِعَ اللّٰهُ قَوْلَ الَّذِيْنَ قَالُوْا الایۃ' یہ منافقین کے اس استہزا پر تہدید و وعید ہے جو وہ اپنی مجلسوں میں قرآن کی دعوتِ انفاق کا کیا کرتے تھے۔ قرآن جب یہ کہتا کہ کون ہے جو اللہ کو قرض حسن دے تو یہ منافقین اس پر یہ فقرہ چست کرتے کہ ان دنوں اللہ میاں بہت غریب ہو گئے ہیں اور ہم ان سے زیادہ امیر ہیں کہ وہ ہم سے قرض مانگنے پر اتر آئے ہیں۔ یہ منافقین زیادہ تر یہود میں سے تھے اس وجہ سے خدا پر طنز کرنے میں بھی انھوں نے بالکل یہود ہی کی ہمنوائی کی۔ سورۂ مائدہ میں یہود کا یہ قول جو نقل ہوا ہے کہ 'يَدُ اللّٰهِ مَغْلُوْلَةٌ'، اس کی نوعیت بھی، جیسا کہ ہم تشریح کریں گے، بالکل یہی تھی۔ وہ بھی قرآن کی مذکورہ بالا دعوتِ انفاق کا مذاق اڑانے کے لیے کہتے کہ آج کل مسلمانوں کے اللہ میاں کا ہاتھ بہت تنگ ہے کہ وہ بندوں سے قرض مانگتے پھرتے ہیں، اس پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ 'سَنَكْتُبُ مَا قَالُوْا' یہ جو کچھ انھوں نے کہا ہے اس کو ہم نوٹ کر رکھیں گے۔ فنِ بلاغت کے ادا شناس اندازہ کر سکتے ہیں کہ ان دو لفظوں کے اندر جو قہر و غضب چھپا ہوا ہے اس کی تعبیر ہم عاجزوں کے قلم سے صفحوں میں بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اس سے زیادہ بلیغ بات یہ ہے کہ اسی پر عطف کر دیا ہے 'وَقَتْلَهُمُ الْاَنْۢبِيَاۗءَ بِغَيْرِ حَقٍّ' کو یعنی ان کے ناحق قتلِ انبیا کو بھی ہم نے لکھ رکھا ہے۔ یہ قتلِ انبیا کا جرم ظاہر ہے کہ یہود کا ہے۔ منافقین کے ایک قول اور یہود کے ایک فعل کو ایک ہی زمرے میں اس طرح شمار کرنا اور دونوں کے لیے ضمیر بھی ایک ہی استعمال کرنا یہاں دو باتوں پر دلیل ہے۔ ایک تو اس بات پر کہ

بلاغت کا ایک لطیف نکتہ

یہ سنگین بات کہہ کر یہ منافقین یہود کی اسی برادری میں پھر جا شامل ہوئے ہیں جس سے نکل کر انھوں نے اسلام میں داخل ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔ دوسری یہ کہ منافقین کا یہ استہزا اور یہود کا یہ عمل دونوں ایسے سنگین جرائم ہیں کہ خدا ان کو بھولنے والا نہیں ہے بلکہ وہ بھی ایک دن ان سے کہے گا کہ ذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ خدا کا یہ عذاب چکھو اور یہ عذاب جو کچھ بھی ہوگا ان کے اعمال ہی کا ثمرہ و نتیجہ ہوگا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بندوں پر کسی قسم کا ظلم کرنے والا نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَآ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ۭ قُلْ قَدْ جَاۗءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِيْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِيْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَاۗءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۝ كُلُّ نَفْسٍ ذَاۗىِٕقَةُ الْمَوْتِ ۭ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۣ وَلَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ۭ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ (۱۸۳-۱۸۶)

بات جب منافقین کے ذکر سے یہود کے ذکر تک پہنچ گئی تو ان کی ایک اور شرارت کا حوالہ دے کر اس کی بھی بیخ کنی فرما دی اور ساتھ ہی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو تسلی دی کہ ابھی اس طرح کی بہت سی دل آزار باتیں تمھیں اہل کتاب اور مشرکین کی طرف سے دیکھنی اور سننی پڑیں گی۔ یہ تمھارے صبر و عزیمت کا امتحان ہے۔

یہود کی ایک شرارت

یہود کی جس شرارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو چپ کرنے کے لیے یہ کہتے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی شخص کے دعوائے رسالت کی اس وقت تک تصدیق ہی نہ کریں جب تک اس سے یہ معجزہ نہ صادر ہو کہ وہ ایسی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے قبولیت کے نشان کے طور پر، آسمان سے آگ اترے۔ یہ بات یہود محض شرارت کی وجہ سے کہتے تھے۔ تورات میں بعض انبیا سے اس معجزے کا صادر ہونا مذکور ہے مثلاً سلاطین ۱۸: ۳۷-۳۸ میں ایلیا نبی کے متعلق اور تواریخ ۷: ۱ میں حضرت سلیمانؑ کے متعلق، لیکن یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ یہ معجزہ لازم و شرائط نبوت میں سے ہے، جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھائے اس کا دعوائے نبوت ہی قابل غور نہیں، بالخصوص آخری نبی سے متعلق تو ان کے ہاں جو پیشین گوئیاں ہیں وہ اس قسم کے تکلفات سے بالکل ہی خالی ہیں۔ یہ عذر یہود نے محض شرارت سے جیسا کہ ہم نے اشارہ کیا، گھڑا تھا اس وجہ سے قرآن نے ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر جواب دے دیا کہ ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے ایسے رسول آ چکے ہیں جو نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے اور وہ معجزہ بھی انھوں نے دکھایا جس کا تم نے ذکر کیا تو تم نے ان کو قتل کیوں کیا؟ تمھارا یہ فعل تو اس بات کی گواہی دے رہا ہے کہ تم اپنی اس بات میں بھی

جھوٹے ہو۔ اگر تم کو یہ معجزہ بھی دکھا دیا جائے گا جب بھی تم اپنی اسی ضد پر اڑے رہو گے اور ایمان نہ لانے کا کوئی اور بہانہ تلاش کر لو گے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف التفات

اس کے بعد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی کہ اگر یہ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں تو تم اس کا غم نہ کرو۔ نہ یہ بات تمہاری کسی کوتاہی کے سبب سے ہے اور نہ اس وجہ سے ہے کہ تم ان کے حسبِ منشا ان کو معجزہ نہیں دکھا رہے ہو بلکہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر ایمان نہیں لانا چاہتے۔ یہ معاملہ خاص تمہی کو نہیں پیش آیا ہے، تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے حالانکہ وہ معجزے، صحیفے اور روشن کتاب سب کچھ لے کر آئے تھے، خالی ہاتھ نہیں آئے تھے۔

یہاں تین لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ بینات — زبر — کتاب منیر۔

'بینات' کا مفہوم

'بینات' کے معنی واضح اور روشن کے ہیں۔ یہ لفظ آیات کی صفت کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں یہ لفظ تنہا بغیر موصوف کے استعمال ہوا ہے دو معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ واضح اور مسکت دلائل کے معنی میں یا حسی معجزات کے معنی میں۔

'زبر' کا مفہوم

'زبر' زبور کی جمع ہے۔ اس کے معنی ٹکڑے، قطعے اور صحیفے کے ہیں۔ مزامیر داؤد کے لیے اس کا استعمال معروف ہے۔ یہاں اس سے مراد انبیا کے وہ صحائف ہیں جو تورات کے مجموعہ میں شامل ہیں۔

'کتاب منیر' سے مراد

'کتاب منیر' سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کی نازل شدہ چیزوں میں سے تورات ہی ہے جو اس لفظ کا اصلی مصداق ہو سکتی ہے۔

تہدید اور تسلی دونوں

كُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ الآیہ میں تہدید اور تسکین دونوں کے پہلو موجود ہیں۔ منافقین و معاندین کے لیے یہ تہدید ہے اور اہل ایمان کے لیے پیام تسکین۔ مطلب یہ ہے کہ تم کو اور تمہارے مخالفوں کو سب کو موت کی منزل سے گزر کر بالآخر خدا ہی کے پاس آنا ہے، وہاں قیامت کے دن سب کو ان کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا۔ وہاں بازی دراصل اس کی ہے جو دوزخ سے محفوظ رہا اور جنت میں داخل ہوا۔ یہ دنیا اور اس کی چمک دمک تو محض ایک جلوۂ سراب ہے اور شامت ہی ہے ان کی جو اس کے پیچھے پڑ کر آخرت کو گنوا بیٹھے۔

مسلمانوں کو صبر اور تقویٰ کی تلقین

لَتُبْلَوُنَّ فِي أَمْوَالِكُمْ الآیہ یہ مسلمانوں کو معاندین کی تمام سرگرمیوں کے علی الرغم صبر اور تقویٰ پر جمے رہنے کی تلقین ہے۔ فرمایا کہ اہل کتاب اور مشرکین کے ہاتھوں تمہیں جانی و مالی آزمائشیں بھی پیش آنی ہیں اور ان کی طرف سے تمہیں ابھی بہت سی دل آزار باتیں بھی سننی پڑیں گی۔ یہ دراصل تمہارے صبر اور تقویٰ کا امتحان ہے۔ اگر ان باتوں کے باوجود تم اپنے موقف پر ڈٹے رہے اور تم نے حدودِ الٰہی کا احترام ملحوظ رکھا تو یہی وہ عزیمت کا مقام ہے جو انبیائے اولوالعزم اور ان کے جاں نثاروں کا خاص حصہ ہے اور جو بالآخر اس راہ میں کامیابی کی کلید ہے۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ

ظُهُوْرِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُوْنَ ۝ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ يَفْرَحُوْنَ بِمَآ اَتَوْا وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا فَلَا تَحْسَبَنَّهُمْ بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ (۱۸۷-۱۸۹)

اہل کتاب کو آخری تنبیہ

اس سورہ میں اہل کتاب کو یہ آخری تنبیہ ہے۔ فرمایا کہ خود ساختہ عہود کے حوالے دے کر یہ حق کی مخالفت کے معاملے میں تو بڑے چابکدست ہیں لیکن وہ اصل میثاق جو اللہ نے ان سے اپنی کتاب کو ایک ایک کے آگے آشکارا کرنے کا لیا تھا اور یہ جو ہدایت فرمائی تھی کہ اس کی کسی چیز کو چھپانا مت، اس عہد کو انھوں نے پس پشت ڈال دیا اور دنیا کے حقیر فائدے کے عوض اس کو قربان کر دیا۔ اس عہد کا حوالہ تورات اور انجیل دونوں میں مختلف اسلوبوں اور پیرایوں سے ہوا ہے۔ ہم بخیال اختصار صرف دو حوالے نقل کرتے ہیں۔ استثنا میں ہے۔

تورات اور انجیل میں تبیین کتاب کی تاکید

"اس لیے میری ان باتوں کو تم اپنے دل اور اپنی جان میں محفوظ رکھنا اور نشان کے طور پر ان کو اپنے ہاتھوں پر باندھنا اور وہ تمھاری پیشانی پر ٹیکوں کی مانند ہوں اور تم ان کو اپنے لڑکوں کو سکھانا اور تو گھر بیٹھے اور راہ چلتے اور لیٹتے اور اٹھتے وقت ان ہی کا ذکر کیا کرنا اور تو ان کو اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر لکھا کرنا" ۱۱: ۱۸-۲۱

ان الفاظ پر غور فرمایئے۔ جس کتاب کی تبیین کا ان الفاظ میں یہود سے عہد لیا گیا تھا اس کو انھوں نے نہ صرف یہ کہ گلدستہ طاق نسیاں بنا کر رکھ دیا بلکہ اس میں تحریف کر کے اس کے حقائق کی قلب ماہیت بھی کر ڈالی۔

اسی طرح انجیلوں میں بھی نہایت مؤثر اسلوبوں میں یہ ہدایت موجود ہے اور خاص طور پر یہ فقرہ تو آب زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔

"جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو کوٹھوں پر اس کی منادی کرو" متی ۱۰: ۲۷

فرمایا کہ جن کے کارنامے یہ کچھ ہیں، جنھوں نے حقیر دنیوی مفادات کی خاطر اس ڈھٹائی کے ساتھ شریعت فروشی کی ہے اور پھر اپنے اس کارنامے پر خوش بھی ہیں، جو چاہتے ہیں کہ اس کام کا کریڈٹ حاصل کریں جو انھوں نے کیا نہیں۔ فرمایا کہ ان کو عذاب الٰہی سے محفوظ نہ سمجھو، وہ دنیا میں بھی عذاب کی زد میں ہیں اور آخرت میں بھی ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

'مفازۃ' کے معنی نجات اور پناہ کی جگہ کے ہیں اور 'يُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا' کا مفہوم یہ ہے کہ اہل کتاب پر اللہ تعالیٰ نے کتاب کی جو ذمہ داری ڈالی اور اس کے اظہار و اعلان، اس کی تعلیم و تبیین، اور اس کے اجرا و نفاذ سے متعلق جو عہد ان سے لیا اس کا کوئی جزو انھوں نے پورا نہیں کیا بلکہ الٹے اس کے کتمان

اور تحریف کے لیے سازشیں کیں اور اس کو اپنے دنیوی اغراض کے لیے حقیر داموں بیچا لیکن اس کے باوجود ان کی خواہش یہ ہے کہ انھیں حامل کتاب سمجھا جائے، انھیں خدا کی برگزیدہ امت قرار دیا جائے اور ان کو دنیا اور آخرت دونوں میں خدا کے تمام فضل و انعام اور تمام لطف و احسان کا حق دار مانا جائے۔ اہل کتاب کے اسی طرح کے لذیذ خواب ہیں جن کو قرآن نے سورہ بقرہ میں 'اَمَانِیّ' باطل آرزوؤں سے تعبیر فرمایا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ الآیہ یہ اوپر والی دھمکی کی تصدیق و توثیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے، اس میں کسی اور کے زور و اثر کا کوئی دخل نہیں ہے۔ جو لوگ خدا سے سرکشی کر رہے ہیں وہ ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہیں اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۹۔ آگے کا مضمون ——— آیات ۱۹۰-۲۰۰

خاتمۂ سورہ

اس مجموعۂ آیات کی حیثیت خاتمہ سورہ کی ہے اور یہ خاتمہ موازنہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ یہ بہت کچھ ملتا جلتا ہوا ہے سورۂ بقرہ کے خاتمہ سے۔ خاص طور پر اس میں جو دعا ہے وہ تو بالکل عکس ہے اس دعا کا جس پر سورۂ بقرہ ختم ہوئی ہے۔

اس خاتمہ میں پہلے تو اس عالم گیر حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جہاں تک خدا کی قدرت و حکمت کی نشانیوں کا تعلق ہے ان سے تو آسمان و زمین کا گوشہ گوشہ معمور ہے۔ اصل شے نبیؐ کی دعوت پر ایمان لانے کے لیے جو ضروری ہے وہ یہ نہیں ہے کہ وہ ایسی سو فتنی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے آسمان سے آگ اترے بلکہ یہ ہے کہ اس کی باتوں کو سننے کے لیے لوگوں کے کان کھلیں، آسمان و زمین میں تصرفات قدرت کے عجائب دیکھنے کے لیے لوگ اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کارخانۂ کائنات کی حکمت و غایت پر غور کرنے کے لیے لوگ اپنے دماغوں اور اپنی عقلوں سے کام لیں۔

پھر فرمایا کہ جن کے دل بیدار ہیں، جو اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے خدا کو یاد رکھتے ہیں اور آسمان و زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں وہ اس نتیجے پر خود پہنچ جاتے ہیں کہ یہ دنیا کوئی اندھیر نگری نہیں ہے جس کو بنانے والے نے یوں ہی بے مقصد بنا ڈالا ہو اور یوں ہی اس کو ایک شتر بے مہار کی طرح چھوڑے رکھے بلکہ اس کے پیچھے ضرور غایت و مقصد اور جزا و سزا ہے۔ چنانچہ وہ خدا سے دعا کرتے رہتے ہیں کہ وہ ان کو انجام کار کے عذاب سے محفوظ رکھے۔

آگے فرمایا کہ اس طرح کے بیدار عقل اور بیدار دل لوگ معجزوں اور کرشموں کی تلاش میں نہیں رہتے۔ ان کے کانوں میں جب دعوت حق پڑتی ہے تو اس کی صداقت کے جانچنے کے لیے کسوٹی خود ان کی عقل اور ان کے دل کے اندر ہوتی ہے سو وہ اس پر پرکھ کر خود اس کی قدر و قیمت پہچان لیتے ہیں۔ ان کے لیے پیغمبر کی دعوت

اور اس کا چہرہ ہی سب سے بڑا معجزہ ہوتا ہے۔

اس کے بعد ان لوگوں کی طرف اشارہ فرمایا جو ان اوصاف کے اس عہد میں حقیقی مصداق تھے اور ان کی ان جاں بازیوں اور قربانیوں کا ذکر کیا جو اس دعوتِ حق کی راہ میں وہ پیش کر رہے تھے اور ان کے لیے اللہ کے پاس جو اجرِ عظیم ہے اس کی بشارت دی۔

آگے چند آیتوں میں اس بات کی وضاحت فرما دی کہ آج جو حق کے مخالفین زور لگا رہے ہیں اس سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ مہلت جو ان کو ملی ہے اللہ ہی کی طرف سے ملی ہے اور اس کے بھی مصالح ہیں۔ یہ مہلت عارضی ہے جو بہت جلد ختم ہو جانے والی ہے۔ انجام کار کی کامیابی خدا کے متقی اور وفادار بندوں ہی کے لیے ہے۔

آخر میں اہل کتاب کے اس گروہ کی تحسین فرمائی جو معاندین کے برعکس حق پر قائم رہا اور اسی نے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کی توفیق پائی۔ فرمایا کہ یہ لوگ اللہ کے ہاں اپنی اس استقامت اور حق پرستی کا انعام پائیں گے۔

سب سے آخر میں مسلمانوں کو نہایت مختصر مگر جامع الفاظ میں ان باتوں کی ہدایت فرمائی جن کا اہتمام اس ذمہ داری کے ادا کرنے کے لیے ضروری ہے جو آخری امت کی حیثیت سے اللہ تعالیٰ نے ان پر ڈالی تھی۔

اب اس روشنی میں آگے کی آیات کی تلاوت فرمایئے۔

آیات ۱۹۰-۲۰۰

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ
لَاٰيٰتٍ لِّأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿١٩٠﴾ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللّٰهَ قِيَامًا
وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا
عَذَابَ النَّارِ ﴿١٩١﴾ رَبَّنَا إِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ أَخْزَيْتَهُ ۖ
وَمَا لِلظّٰلِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿١٩٢﴾ رَبَّنَا إِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا
يُنَادِي لِلْإِيمَانِ أَنْ ءَامِنُوا بِرَبِّكُمْ فَـَٔامَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا
ذُنُوبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّـَٔاتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْأَبْرَارِ ﴿١٩٣﴾ رَبَّنَا

وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ
اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ﴿۱۹۴﴾ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَاۤ
اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ
مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَ
اُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ
وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿۱۹۵﴾ لَا يَغُرَّنَّكَ
تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ﴿۱۹۶﴾ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ۚ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ
جَهَنَّمُ ؕ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿۱۹۷﴾ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ
عِنْدِ اللّٰهِ ؕ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ ﴿۱۹۸﴾ وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الثلثة
الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَاۤ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَاۤ اُنْزِلَ
اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ
اُولٰٓئِكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ
الْحِسَابِ ﴿۱۹۹﴾ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَ ۲۰
رَابِطُوْا ۟ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ﴿۲۰۰﴾ ع ۱۱

ترجمۂ آیات ۱۹۰-۲۰۰

بے شک آسمانوں اور زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں اہلِ عقل کے لیے بہت سی نشانیاں ہیں۔ ان کے لیے جو کھڑے، بیٹھے اور اپنے پہلوؤں پر خدا

کو یاد کرتے رہتے ہیں اور آسمانوں اور زمین کی خلقت پر غور کرتے رہتے ہیں۔ ان کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ کارخانہ بے مقصد نہیں پیدا کیا ہے۔ تو اس بات سے پاک ہے کہ کوئی عبث کام کرے۔ سو تو ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ اے ہمارے رب! جس کو تو نے دوزخ میں ڈالا بے شک اس کو تو نے رسوا کر دیا اور ظالموں کا کوئی بھی مددگار نہیں ہوگا۔ اے ہمارے رب، ہم نے ایک پکارنے والے کو سنا ایمان کی دعوت دیتے کہ لوگو، اپنے رب پر ایمان لاؤ، تو ہم ایمان لائے اے ہمارے رب، ہمارے گناہوں کو بخش دے، ہماری برائیوں کو ہم سے دور کر دے اور ہمیں موت اپنے وفادار بندوں کے ساتھ دے۔ اے ہمارے رب اور ہمیں بخش وہ کچھ جس کا تو نے اپنے رسولوں کی زبانی ہم سے وعدہ فرمایا ہے اور قیامت کے دن ہمیں رسوا نہ کیجیو، بے شک تو اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرے گا۔ ۱۹۰-۱۹۴

تو ان کے پروردگار نے ان کی دعا قبول فرمائی کہ میں تم میں سے کسی عمل کرنے والے کے عمل کو ضائع نہیں کروں گا، مرد ہو یا عورت، تم سب ایک دوسرے سے ہو۔ سو جنھوں نے ہجرت کی اور جو اپنے گھروں سے نکالے اور ہماری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے ہیں ان سے ان کے گناہ دور کر دوں گا اور ان کو ایسے باغوں میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں جاری ہوں گی۔ یہ اللہ کے پاس سے ان کا بدلہ ہوگا اور بہترین بدلہ تو اللہ ہی کے پاس ہے۔ ۱۹۵

اور ملک کے اندر کافروں کی یہ سرگرمیاں تمھیں کسی مغالطہ میں نہ ڈالیں۔ یہ چند دن کی چاندنی ہے پھر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیا ہی بری جگہ ہے۔ البتہ وہ لوگ جو اپنے رب

سے ڈرتے رہے ان کے لیے ایسے باغ ہوں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کے لیے پہلی میزبانی ہوگی اور جو کچھ اللہ کے پاس اس کے وفادار بندوں کے لیے ہے وہ کہیں بہتر ہے۔ ۱۹۶-۱۹۸

اور بے شک اہل کتاب میں سے ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس چیز پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتارا گیا اور اس پر بھی جو ان پر اتارا گیا ہے، اللہ سے ڈرتے ہوئے، وہ اللہ کی آیتوں کا حقیر قیمت پر سودا نہیں کرتے۔ ان کے لیے ان کے رب کے پاس ان کا اجر ہے، بے شک اللہ جلد حساب چکانے والا ہے۔ ۱۹۹

اے ایمان والو، صبر کرو، ثابت قدم رہو، مقابلے کے لیے تیار رہو اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم کامیاب رہو! ۲۰۰

۴۰۔ الفاظ کی تحقیق اور آیات کی وضاحت

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الْاَلْبَابِ ۟ الَّذِیْنَ یَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِیٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰی جُنُوْبِهِمْ وَیَتَفَكَّرُوْنَ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ رَبَّنَاۤ اِنَّكَ مَنْ تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَیْتَهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ اَنْصَارٍ (۱۹۰-۱۹۲)

اربابِ بصیرت کی نگاہ

محبت دنیا کے ان اندھوں کا ذکر کرنے کے بعد جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لیے اس قسم کی کٹ حجتیاں پیدا کر رہے تھے جن کی تفصیل اوپر بیان ہوئی اب یہ ان اربابِ بصیرت کا بیان ہو رہا ہے جو اللہ کو ہر جگہ اور ہر حال میں یاد رکھتے ہیں اور زمین و آسمان کی خلقت پر برابر غور کرتے رہتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ ذکر و فکر خود بخود ان کو اس نتیجے تک پہنچا دیتا ہے کہ یہ عظیم کارخانہ بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا، اور جب بے غایت و بے مقصد نہیں ہو سکتا تو لازم ہے کہ یہ محض اتنے ہی پر تمام نہ ہو جائے جتنا ظاہر ہو رہا ہے بلکہ ضروری ہے کہ ایک دن ایسا آئے جس میں گنہگار اور نیکوکار دونوں اپنے اپنے اعمال کا بدلہ پائیں اور اس دنیا کی خلقت میں جو عظیم حکمت پوشیدہ ہے وہ ظاہر ہو۔

فلسفۂ کائنات

آسمان و زمین کی خلقت اور رات اور دن کی آمد و شد میں جو نشانیاں ہیں ان کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے۔ ان کی تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ گوناگون پہلوؤں سے آفاق کی ان نشانیوں کو نمایاں کیا ہے جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے صرف ایک عظیم طاقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عظیم حکمت بھی ہے، صرف بے پناہ قدرت ہی نہیں ہے بلکہ بے پایاں رافت و رحمت بھی ہے۔ صرف بے اندازہ کثرت ہی نہیں ہے بلکہ اس کثرت کے اندر نہایت حیرت انگیز توافق و توازن بھی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا ہونا نہ تو کوئی اتفاقی سانحہ ہے نہ کسی کھلنڈرے کا کھیل ہے بلکہ یہ ایک قدیر و حکیم، عزیز و غفور اور سمیع و علیم کی بنائی ہوئی دنیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے۔ اگر ایسا ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یا تو اس کا کوئی خالق و مالک ہی نہیں ہے، یہ آپ سے آپ کہیں سے آدھمکی ہے اور اسی طرح چلتی رہے گی یا یہ کہ نعوذ باللہ اس کا خالق کوئی کھلنڈرے مزاج کا ہے جو کسی کو گداگر، کسی کو تونگر، کسی کو ظالم اور کسی کو مظلوم بنا کر اس کا تماشہ دیکھ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں اس قدرت اور اس حکمت کے بالکل منافی ہیں جن کی شہادت اس کائنات کے گوشے گوشے سے مل رہی ہے۔ ایسی علیم و حکیم ہستی کی شان علم و حکمت کے یہ بات بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے حکمت کام کرے۔

اس طرح اس کائنات کی قدرت و حکمت پر غور کرنے والا شخص نہ صرف خدا تک بلکہ اقرار آخرت تک خود پہنچ جاتا ہے اور جس کا ذہن اس حقیقت تک پہنچ جائے گا ظاہر ہے کہ جزا و سزا کے تصور سے اس کا دل کانپ اٹھے گا اور اس کے اندر شدید داعیہ اس بات کے لیے پیدا ہوگا کہ وہ اس عذاب اور اس رسوائی سے پناہ مانگے جو ان لوگوں کے لیے مقدر ہے جو اس دنیا کو بس ایک کھلنڈرے کا کھیل سمجھتے رہے اور اس طرح انھوں نے اپنی ساری زندگی بالکل بطالت میں گزار دی۔

چند نکات

یہ ان آیات کا سیدھا سادا مطلب ہوا۔ ان پر مزید غور کیجیے تو چند اور باتیں بھی سامنے آئیں گی اور وہ بھی نہایت قیمتی ہیں۔

ایک یہ کہ قرآن کے نزدیک اولوالالباب صرف وہ لوگ ہیں جو اس کائنات کے نظام پر غور کر کے خدا کے ذکر اور آخرت کی فکر تک رہنمائی حاصل کریں۔ جن کو یہ چیز حاصل نہیں ہوئی وہ اگرچہ آسمان و زمین کی تمام مسافت ناپ ڈالیں اور چاند و مریخ تک سفر کر آئیں لیکن وہ اولوالالباب نہیں ہیں، ان کے سروں پر کھوپڑیاں تو ہیں لیکن ان کے اندر مغز نہیں ہے۔ اگر ان کے اندر مغز ہوتا تو یہ کس طرح ممکن تھا کہ انھیں سب کچھ نظر آ جاتا اور یہ تل کی اوٹ میں چھپا ہوا پہاڑ نظر نہ آتا۔

دوسری یہ کہ جہاں تک خدا کا تعلق ہے وہ فکر و نظر کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اس کائنات کی بدیہی

حقیقت بلکہ ابدہ البدیہیات ہے۔ اس کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی منادی کر رہا ہے۔ ہماری فطرت اس کی شہادت دے رہی ہے۔ انسان کے اندر اگر عقلِ سلیم ہو تو وہ خدا کو اسی طرح دیکھتی ہے جس طرح سلیم آنکھ سورج کو دیکھتی ہے۔ خدا کو پانے کے لیے یہ کافی ہے کہ انسان اس کو یاد رکھے۔ البتہ آخرت کا معاملہ تفکر و تدبر کا محتاج ہے۔

تیسری یہ کہ جہاں تک ذکرِ الٰہی کا تعلق ہے وہ ہر حال میں مطلوب ہے۔ اس کے لیے قیام و قعود، نرمی و گرمی اور صبح و مسا کی کوئی قید نہیں ہے۔ انسان کی مادی زندگی کے بقا کے لیے جس طرح سانس کی آمد و شد ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے بقا کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے اور قرآن کی زیر بحث آیات سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اولوالالباب کی خاص صفت یہی ہوتی ہے کہ وہ اللہ کی یاد سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔

چوتھی یہ کہ دین میں جس طرح ذکر مطلوب ہے اسی طرح فکر بھی مطلوب ہے۔ اگر ذکر ہو اور فکر نہ ہو تو بسا اوقات یہ ذکر صرف زبان کا ایک شغل بن کے رہ جاتا ہے۔ اس سے معرفت کے دروازے نہیں کھلتے۔ اولوالالباب کے ذکر کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ اس کے ساتھ فکر بھی ہوتا ہے جس کی وجہ سے ان کے قدم درجہ بدرجہ حکمت و معرفت میں راسخ ہوتے جاتے ہیں اس لیے کہ یہی فکر، آخرت کے یقین کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔

پانچویں یہ کہ اس کائنات میں تفکر سے جس طرح اولوالالباب اس حقیقت تک پہنچ جاتے ہیں کہ یہ کائنات کسی کھلنڈرے کا کھیل نہیں ہے اس وجہ سے ایک روزِ عدل کا ظہور ضروری ہے اسی طرح یہ حقیقت بھی ان پر واضح ہو جاتی ہے کہ اس دن حقیقی رسوائی سے وہ لوگ دوچار ہوں گے جو جھوٹی شفاعتوں پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں اس لیے کہ اس دن ایسے بدقسمتوں کا کوئی بھی مددگار نہ ہوگا۔[1]

رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۚ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ ۚ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۗ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ اَنِّيْ لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى ۚ بَعْضُكُمْ مِّنْ بَعْضٍ ۚ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ (۱۹۳ - ۱۹۵)

---

[1] اگر قیامت میں باطل شفاعتوں کے لیے گنجائش مان لی جائے تو یہ دنیا پھر اسی طرح بازیچۂ اطفال بن کے رہ جاتی ہے جس طرح آخرت نہ ماننے کی صورت میں۔ اور یہ بات بالبداہت غلط ہے۔

دعوتِ اسلامی کے باب میں اولوالالباب کا رویہ

اب یہ مذکورہ بالا اولوالالباب کا رویہ بیان ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کے رسول اور اس کی دعوت کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہیں۔ فرمایا کہ نہ وہ کٹ حجتیاں کرتے، نہ خوارق اور معجزات مانگتے۔ پیغمبر کی دعوت خود ان کے اپنے دل کی آواز ہوتی ہے۔ وہ جس خدا اور آخرت پر ایمان کی دعوت دے رہا ہوتا ہے اس کی شہادت وہ خود اپنے باطن سے سنتے ہیں اس وجہ سے ان کے لیے پیغمبر کی آواز اور اس کا چہرہ ہی معجزے کا کام کرتا ہے۔ جب اس کی دعوت سنتے ہیں تو اس کی مخالفت کر کے اس کو دبانے کے بجائے اس پر لبیک کہتے ہیں اور اپنے پروردگار سے دعا کرتے ہیں کہ ان کے گناہوں کو وہ معاف فرمائے، ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے اور ان کا خاتمہ اپنے وفا شعار بندوں کے ساتھ کرے۔

بدعہدوں پر ایک لطیف تعریض

'تَوَفَّنَا مَعَ الْاَبْرَارِ' خدا کے وفادار بندوں کے زمرے میں شامل کیے جانے کی تمنا کا اظہار ہے۔ یعنی جب ہمارا خاتمہ ہو تو ہمیں ان کی معیت نصیب ہو جو آخر دم تک تیرے عہد و پیمان میں مضبوط رہے۔ لفظ 'بار' پر ہم دوسرے مقام میں گفتگو کر چکے ہیں کہ اس لفظ کی اصل روح وفاداری، پابندی عہد و میثاق اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ اس پہلو سے غور کیجیے تو یہاں اس میں ان اہل کتاب پر ایک لطیف تعریض بھی ہے جن سے آخری رسول کی تائید و حمایت کا عہد لیا گیا تھا لیکن انھوں نے اس عہد کے برخلاف سارا زور اس کی مخالفت میں صرف کیا۔ یہ واضح رہے کہ یہاں کلام میں پیشِ نظر اہل کتاب ہی ہیں۔

صحیح اور برقت دعا فوراً قبول ہوتی ہے

'فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ' نہایت بلیغ اسلوب میں دعا کی قبولیت کا اظہار ہے۔ گویا ادھر ان کی زبان سے دعا کے الفاظ نکلے ادھر بارگاہِ خداوندی سے ان کی قبولیت کی سند مل گئی۔ جو دعائیں صحیح جذبے کے ساتھ صحیح محل اور ٹھیک وقت پر نکلتی ہیں ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہی ہے۔ اس حقیقت کی طرف ہم دوسرے مقام میں بھی اشارہ کر چکے ہیں۔

دعا کی بلاغت

یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ اولوالالباب کی طرف سے حق کی یہ تائید دعوے کی شکل میں نہیں بلکہ دعا کی شکل میں سامنے آئی ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ اپنے اس 'آمَنَّا' کی ذمہ داریوں اور اس کی مشکلات سے اچھی طرح واقف ہیں اس وجہ سے بجائے اس کے کہ وہ اس کا اظہار فخر کے ساتھ کرتے انھوں نے نہایت عاجزی اور فروتنی کے ساتھ اپنے آپ کو اپنے رب کے آگے ڈال دیا ہے کہ جس طرح اس نے یہ 'آمَنَّا' کہنے کی توفیق دی ہے اسی طرح وہ تمام اگلی اور پچھلی کوتاہیوں سے درگزر فرمائے اور اس راہ کی ذمہ داریوں اور مشکلات سے عہدہ برا ہونے کی توفیق دے۔

مظلوموں اور کمزوروں کی حوصلہ افزائی

'لَآ اُضِيْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى' میں تمام اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہے جو دعوت اسلامی کے اس نازک مرحلے میں اس کی تائید کے لیے خطرات سے بے پروا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ یہ مرحلہ جیسا کہ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا کے الفاظ سے واضح ہے ہجرت، جہاد، راہِ خدا میں مصائب جھیلنے اور مرنے مارنے کا مرحلہ تھا۔ اس مشکل وقت میں جو لوگ

اس میدان عشق میں سر دھڑ کی بازیاں لگا کر اترے تھے ان میں آزاد بھی تھے اور غلام بھی، مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ اور سب ایک سے ایک بڑھ کر قربانیاں پیش کر رہے تھے اور ایمان و اسلام کے جرم میں معاندینِ اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بنے ہوئے تھے۔ خاص طور پر کمزوروں یعنی عورتوں اور غلاموں پر جو ستم توڑے جا رہے تھے ان کو سن کر تو آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں لیکن یہ اسلام کا معجزہ ہے کہ کفار کی یہ تمام ستم رانیاں کسی ایک شخص کو بھی اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو سکیں بلکہ یہ کہنا بھی ذرا مبالغہ نہیں ہے کہ جو جتنا ہی کمزور تھا اس نے اسی قدر زیادہ استقلال اور پامردی کا ثبوت دیا۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ اپنے وعدے میں ان کمزوروں کی دلداری اور حوصلہ افزائی کا خاص طور پر اہتمام فرمائے۔ چنانچہ ارشاد ہوا کہ اِنِّیْ لَآ اُضِیْعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنْکُمْ تم میں سے جو شخص بھی آج میرے دین کی کوئی خدمت کر رہا ہے میں اس کو ضائع نہیں کروں گا بلکہ اس کا بھرپور صلہ دوں گا۔ اس کے بعد اس کے ساتھ مِنْ ذَکَرٍ اَوْ اُنْثٰی کے الفاظ بھی بڑھا دیئے یعنی عام اس سے کہ مرد ہو یا عورت، جو بھی آج میرے لیے کوئی دکھ جھیل رہا ہے میرا یہ وعدہ ان سب کو شامل ہے۔ اس ٹکڑے نے کلام کو بالکل مطابقِ حال کر دیا۔ اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ ان دو لفظوں نے ان مظلوم خواتین کی کتنی ڈھارس بندھائی ہو گی جو محض اسلام کی خاطر طرح طرح کے مظالم کا نشانہ بنی ہوئی تھیں!

اعمال کی میزان میں عورت اور مرد دونوں برابر ہیں

'بَعْضُکُمْ مِّنْ بَعْضٍ' اثنائے کلام میں بالکل ضمنی طور پر اس بات کی دلیل بیان ہو گئی ہے کہ کیوں اللہ تعالیٰ کی میزان میں مرد اور عورت دونوں کا عمل بالکل یکساں وزن رکھتا ہے؟ فرمایا کہ اس لیے کہ عورت اور مرد دونوں ایک ہی جنس سے ہیں، دونوں ایک ہی آدمؑ و حوّا کی اولاد ہیں، دونوں ایک ہی قسم کے گوشت پوست سے بنے ہوئے ہیں۔ ان دو لفظوں سے قرآن نے ان تمام جاہلی نظریات اور غلط مذہبی تصورات کی تردید کر دی جو عورت کو مرد کے مقابل میں، ایک فروتر مخلوق قرار دیتے تھے۔ اس مسئلے پر ہم آگے والی سورہ میں بحث کرنے والے ہیں اس وجہ سے یہاں اس مختصر اشارے پر کفایت کرتے ہیں۔

عمل اور ردِّ عمل

'ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ' ثاب، یثوب، ثوبًا کے اصل معنی رجوع کرنے اور لوٹنے کے ہیں۔ اسی سے ثواب ہے جس کے معنی اس ثمرے اور نتیجے کے ہیں جو کسی عمل کرنے والے کے عمل کے ردِّ عمل کے طور پر اس کو حاصل ہو۔ اگرچہ لفظ میں گنجائش خیر اور شر دونوں کی ہے لیکن اس کا غالب استعمال اچھے عمل کے اچھے ردِّ عمل کے لیے ہے۔ بندوں کے حقیر اعمال پر اللہ تعالیٰ جو ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا ان کو ثواب کے لفظ سے تعبیر کر کے ربِّ کریم نے بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت بڑھائی ہے۔ ورنہ ذرّے اور پہاڑ میں کیا نسبت ہے۔ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ کے الفاظ سے اسی بُعد کو رفع فرمایا گیا ہے۔ یعنی ہے تو تمہارے ہی عمل کا بدلہ لیکن ہے اللہ کے پاس سے جس کے پاس حسن ثواب کے خزانے ہیں، وہ داتا جس کو جتنا چاہے دے دے۔ اس کے پاس کیا کمی ہے۔

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِي الْبِلَادِ ۝ مَتَاعٌ قَلِيْلٌ ثُمَّ مَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۭ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۭ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْاَبْرَارِ (۱۹۶-۱۹۸)

'لَا يَغُرَّنَّكَ' میں خطاب عام مسلمانوں سے ہے۔ اس طرح واحد کے صیغے سے خطاب، ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں، اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ مخاطب گروہ کا ایک ایک شخص فرداً فرداً مخاطب ہے۔

'تقلب' کے معنی آمد و شد، چلت پھرت اور ایاب و ذہاب کے ہیں۔ موقع و محل کے لحاظ سے اس کے اندر غرور، اکڑ اور دندنانے کے معنی بھی پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس آیت میں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے مراد اس وقت کفار کا ملک کے حالات و معاملات میں وہ آزادانہ و خود مختارانہ تصرف ہے جو مسلمانوں کے مقابل میں ان کو حاصل تھا۔ اس وقت تک مسلمان ابھی کمزور اور مظلوم تھے۔ اور کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھاتے تھے۔

'نزل' اس ضیافت و میزبانی کو کہتے ہیں جو کسی مہمان کی آمد پر سب سے پہلے پیش کی جاتی ہے۔

مَتَاعٌ قَلِيْلٌ مبتدائے محذوف کی خبر ہے اور یہ ہم دوسرے مقام میں واضح کر چکے ہیں کہ جب اس طرح مبتدا کو حذف کر دیں تو مقصود اس سے ساری توجہ صرف خبر پر مرکوز کرانا ہوتا ہے۔

اوپر کی آیات میں کمزور اور مظلوم مسلمانوں کی جو حوصلہ افزائی فرمائی گئی ہے اسی مضمون کی یہ مزید تائید ہے۔ مسلمانوں کو بالخصوص کمزور اور مظلوم مسلمانوں کو خطاب کر کے یہ اطمینان دلایا جا رہا ہے کہ اس وقت کفار کو ملک میں جو غلبہ اور زور حاصل ہے اس سے کوئی مغالطہ نہیں ہونا چاہیے۔ یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے۔ اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ نہایت برا ٹھکانا ہے۔ حقیقی اور ابدی کامیابی انہی لوگوں کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کریں گے اور تقویٰ پر قائم رہیں گے۔ ان کے لیے پہلی پیشکش جو ہو گی وہ جنت کی ہو گی اور ایسے وفادار بندوں کے لیے ان کے رب کے پاس مزید جو کچھ ہے وہ ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔

وَاِنَّ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ خٰشِعِيْنَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ (۱۹۹)

اوپر کی آیات اور بحیثیت مجموعی اس پوری سورہ میں اہل کتاب کے رویے کی چونکہ شدید مذمت ہوئی ہے اس وجہ سے یہ آخر میں ان اہل کتاب کی تحسین فرمائی جو اپنی سابقہ کتب پر بھی قائم رہے اور جو دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔ یہ اس بات کی طرف ایک نہایت لطیف اشارہ ہے کہ اس دودھ میں جتنا مکھن تھا وہ یہ نکل آیا ہے۔ اب جو بچ رہا ہے وہ صرف چھاچھ ہے۔ ان کے بابت فرمایا کہ یہ لوگ اپنا وہ

اجر خدا کے ہاں پائیں گے جو ان کے لیے خاص ہے۔ پھر تسلی دی کہ یہ خیال نہ کریں کہ اس اجر کے ملنے میں بہت دیر ہے۔ جب یہ اجر ملے گا تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی مل گیا۔ اِنَّ اللّٰہَ سَرِیْعُ الْحِسَابِ جب تسلی کے موقع پر آتا ہے تو اس کا یہی مفہوم ہوتا ہے۔

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا وَاتَّقُوا اللّٰہَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۲۰۰)

شریعت کے حقوق ادا کرنے کے لیے بنیادی ہدایات

یہ اس سورہ کی آخری آیت ہے جس میں خاتمہ کلام کے طور پر وہ تمام بنیادی ہدایات جمع کر دی گئی ہیں جو شریعت کے حقوق ادا کرنے اور ان حالات و مشکلات سے عہدہ برا ہونے کے لیے ضروری تھیں، جن میں مسلمان گھرے ہوئے تھے۔ یہ ہدایات چار چیزیں اختیار کرنے اور ان پر مضبوطی کے ساتھ جمے رہنے کے لیے ہیں۔

'صبر' کی حقیقت

پہلی چیز صبر ہے۔ اس لفظ پر سورۂ بقرہ کی تفسیر میں ہم بڑی تفصیل کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں۔ اس لفظ کی اصل روح کسی حق پر اپنے آپ کو مزاحمتوں کے مقابل میں جمائے رکھنا ہے۔ عام اس سے کہ یہ مزاحمتیں خود اپنے اندر سے سر اٹھائیں یا خارج سے حملہ آور ہوں۔ اس خصلت کو پختہ کیے بغیر کوئی شخص کسی چھوٹے سے چھوٹے حق کا بھی حق ادا نہیں کر سکتا۔

'مصابرت' کی حقیقت

دوسری چیز مصابرت ہے۔ مصابرت کے معنی ہیں اپنے حریف کے مقابل میں ثابت قدمی کا مظاہرہ اور اس پر اس وصف میں بازی لے جانے کی کوشش کرنا۔ اس چیز کی تاکید اس موقع پر، خاص طور سے اس وجہ سے کی گئی کہ اس مرحلے میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان عملاً مسلح کشمکش شروع ہو چکی تھی اور اس کشمکش میں آخری کامیابی اس گروہ کے لیے مقدر تھی جو اپنے حریف پر استقلال و پامردی کے میدان میں بازی لے جا سکے۔ میدانِ جنگ میں فتح و شکست کا اصلی انحصار تعداد اور اسلحہ پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار پر ہوتا ہے۔

'مرابطت' کی حقیقت

تیسری چیز مرابطہ ہے۔ مرابطہ، ربط الخیل سے ہے۔ اس کا اصلی ابتدائی مفہوم دشمن کے مقابلے اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کے لیے جنگی گھوڑے تیار کر رکھنا ہے۔ اب گھوڑوں کی جگہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں نے لے لی ہے اس وجہ سے حالات کی تبدیلی سے اس لفظ کا مفہوم بھی تبدیل ہو جائے گا۔ مصابرت کی ہدایت کے بعد یہ مرابطت کی ہدایت دشمن کے مقابلے کے لیے اخلاقی تیاری کے ساتھ ساتھ مادی تیاری کی ہدایت ہے۔

'تقویٰ' کی حقیقت

چوتھی چیز تقویٰ ہے۔ اس لفظ پر تفسیر سورۂ بقرہ کے شروع میں ہم تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ خدا کے مقرر کردہ تمام حدود و قیود کی اخلاص و خشیت کے ساتھ نگرانی کرنا تقویٰ ہے۔ یہی چیز تمام دین کا خلاصہ اور مقصود ہے۔

فرمایا کہ مسلمانو، یہ چیزیں اختیار کرو تاکہ تم دنیا اور آخرت دونوں میں فلاح پاؤ۔

یہ آخری سطریں ہیں جو آل عمران کی تفسیر میں اس بے مایہ کو لکھنے کی توفیق حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ لغزشوں کو معاف فرمائے اور صحیح باتوں کے لیے دلوں میں جگہ پیدا کرے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔

لاہور

۲۳ ربیع الثانی ۱۳۸۶ھ

۱۱ اگست ۱۹۶۶ء